محبت کا حصار
نگہت عبداللہ

دِل کا نگر

''کوئی جائے نہ جائے، میں ضرور جاؤں گی۔''
میں نے بڑے آرام سے کہہ کر چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تو ایک دم خاموشی چھا گئی۔ میں کسی کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی لیکن محسوس کر رہی تھی کہ سب مجھے ہی گھور رہے ہیں اور ان گھورتی ہوئی نظروں میں تاسف کے ساتھ ملامت بھی تھی، اور شاید باجی تو دانت بھی کچکچا رہی ہوں گی۔ کتنی دیر بعد باجی کی آواز سنائی دی۔

''سنا آپ نے امی یہ کیا کہہ رہی ہے؟''

''ہاں اس کی تو ہر بات نرالی ہوتی ہے۔ ضرور وہ کام کرے گی جس کو منع کیا جائے۔''

امی نے پتا نہیں باجی سے کہا یا اپنے آپ سے، پھر فوراً روئے سخن میری طرف موڑا۔

''کیا کہا تم نے، تم جاؤ گی تایا کے گھر، کیوں؟''

''کیوں کا کیا مطلب۔ ان کے بیٹے کی شادی ہے کارڈ بھیجا ہے انہوں نے اور ایک دو آدمیوں کو بھی نہیں سب کو بلایا ہے اور سب کو جانا چاہیے۔'' میں نے اسی اطمینان سے کہا تو باجی تڑخ کر بولیں۔

''کوئی ضرورت نہیں، کوئی نہیں جائے گا۔''

''ابو کو منع کر سکتی ہیں آپ؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''وہ بے شک جائیں لیکن ہم میں سے کوئی نہیں۔''

''میں جاؤں گی ابو کے ساتھ۔'' میں نے ان کی بات پوری نہیں ہونے دی۔

''سب جانتی ہو تم پھر بھی ایسا کہہ رہی ہو، تمہیں بہن کا ذرا خیال نہیں ہے، وہ لوگ زیادہ پیارے ہیں تمہیں؟''

امی کو غصہ آ گیا تھا، مجھے احساس دلا کر باز رکھنے کی سعی کی۔ لیکن یہ نہیں تھا کہ میں ضد میں آ گئی تھی یا مجھے احساس نہیں تھا بلکہ میں باجی کی خاطر ہی جانا چاہتی تھی۔ اس لیے اپنی بات پر اڑی رہی اور جب ابو نے سنا کہ میں ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوں تو وہ نہ صرف خوش ہوئے بلکہ اس روز دو ٹکٹ لے آئے اور میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہنے لگے۔

''بیٹا! تمہاری امی کی ناراضگی کسی حد تک ٹھیک ہے، لیکن میں کیا کروں رشتہ داری ختم تو نہیں کی جا سکتی تم کوشش کرو کہ تمہاری امی تمہیں خوشی سے جانے کی اجازت دیں۔''

اور میں کیا کوشش کرتی، جہاں بات شروع کرتی۔ امی مجھے بری طرح ڈانٹ کر رکھ دیتیں، باجی الگ ناراض تھیں۔ میں نے ان سے ایک دو سوٹ مانگے وہ بھی نہیں دیے حالانکہ اس معاملے میں وہ ہمیشہ سے بڑی فراخ دل تھیں۔ بہر حال ان کی ناراضگی بھی بجا تھی اس لیے میں نے ان پر کچھ جتایا نہیں۔

اصل میں باجی شروع سے تایا کے بیٹے عاصم سے منسوب تھیں۔ گو کہ باقاعدہ منگنی وغیرہ نہیں ہوئی تھی لیکن امی اور تائی اماں کے درمیان بات طے ہو چکی تھی۔ اس وقت تایا ابا یہیں لاہور میں تھے اور ہم سب ایک ہی گھر میں رہا کرتے تھے جہاں کبھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جو دونوں گھروں کے درمیان رنجش کا باعث بنتی۔ اس کے برعکس آپس میں محبت اور اتفاق تھا۔ اس وقت میں آٹھویں کلاس میں پڑھتی تھی جب امی نے مجھے بتایا تھا کہ باجی عاصم بھائی کی دلہن بنیں گی اور مجھے یاد ہے میں اس بات کی تصدیق کرنے عاصم بھائی کے پاس پہنچ گئی تھی۔

''سچ عاصم بھائی! باجی آپ کی دلہن بنیں گی؟''

''تمہیں کس نے بتایا؟'' ان کے ہونٹوں پہ بڑی خوب صورت مسکراہٹ دبی تھی۔

''امی نے''

''اب امی غلط تو نہیں کہہ سکتیں۔'' انہوں نے میری ناک چھو کر کہا تھا۔

اور پھر میں نے بہت خوبصورت آنکھ مچولی دیکھی تھی۔ عاصم بھائی بہانے بہانے سے اوپر آتے اور باجی کو دن میں کتنی بار نرگس باجی سے کوئی کام یاد آتا اور وہ نیچے بھاگتی تھیں۔

ان ہی دنوں تایا ابا کا ٹرانسفر پنڈی ہو گیا تو پہلے وہ اکیلے گئے، غالباً رہائش وغیرہ کا انتظام کیا اس کے بعد اپنی فیملی کو بھی لے گئے تھے۔ گو کہ لاہور اور راولپنڈی میں کوئی اتنا زیادہ فاصلہ نہیں تھا پھر پتا نہیں کیسے خلیج حائل ہو گئی تھی۔ بس شروع کے چند ماہ ہی عاصم بھائی نے پندرھویں دن چکر لگایا تھا اس کے بعد مصروفیت کے بہانے تھے۔ اس کے باوجود امی اور خصوصاً باجی نے شاید گمان بھی نہیں کیا ہو گا کہ تائی اماں یوں اپنی بات سے پھر جائیں گی اور وہ بھی چار سال انتظار میں رکھ کر، اس عرصے میں باجی کے لیے حقیقتاً کئی اچھے پرپوزل آئے جنہیں امی نے ایک ہی جواب دیا تھا کہ وہ اپنے تایا زاد سے منسوب ہے اور یہی سچ تھا جسے جھٹلانے کا اب ہمارے پاس کوئی جواز نہیں تھا، ادھر سے بھی تو کوئی جواز پیش نہیں کیا گیا تھا نہ کوئی عذر بلکہ یوں جیسے سرے سے کوئی بات ہوئی ہی نہیں تھی، جب ہی تو ایک دم سے عاصم بھائی کی شادی کا کارڈ آ گیا تھا۔ گویا ان کے نزدیک زبان کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور ظاہر ہے باجی اور امی کا غصہ بجا تھا، بلکہ تایا ابا کے گھر سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کا حق بھی رکھتی تھیں اور یہ نہیں تھا کہ مجھے افسوس نہیں تھا۔ مجھے بہت دکھ ہوا تھا اور عاصم بھائی پر تو بہت غصہ تھا۔ جنہوں نے میری اتنی پیاری باجی کو دکھ دیا تھا۔ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ شاید میں یہی جاننے کے لیے ان کی شادی میں جا رہی تھی۔

''سنو'' مجھے سوٹ کیس میں کپڑے رکھتے دیکھ کر باجی کہنے لگیں ''کیا تمہیں ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا؟''

''کیوں نہیں۔'' میں نے اپنے کام میں مصروف رہ کر کہا تو باجی نے ایک دم میرا بازو پکڑ کر مجھے اپنی طرف موڑ لیا۔

''پھر، پھر کیوں جا رہی ہو؟''

''انہیں یہ بتانے کہ ان کے اس اقدام سے ہمیں کوئی افسوس نہیں ہوا۔'' میرے اتنے سے کہنے پر باجی سلگ گئیں۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''یہ میں آپ کو آ کر بتاؤں گی۔ دیکھیں ابو پکار رہے ہیں۔''

میں نے جلدی سے سوٹ کیس بند کیا اور زبردستی باجی کے گلے لگ کر باہر نکل آئی۔ ابو تیار کھڑے تھے اور ان ہی کی وجہ سے امی مجھے برا بھلا نہیں کہہ سکیں۔ البتہ ان کی آنکھوں میں سخت ناگواری اور خشونت تھی۔ میں ڈرتے ڈرتے ان کے گلے لگی تو دھیرے سے تنبیہہ کرتے ہوئے بولیں۔

''خبردار کسی پر کچھ جتانا نہیں۔ تمہاری باجی کے لیے کوئی کمی نہیں ہے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' میں نے کہا اور دروازے میں کھڑی باجی کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔

☆......☆......☆

تایا ابا کے گھر میں بڑی رونق تھی۔ کراچی سے چھوٹی پھوپھو خالہ اور عذرا کے ساتھ آئی ہوئی تھیں اور تائی اماں کی بہن اپنے بچوں کے ساتھ موجود تھیں اور پتا نہیں دو لڑکیاں کون تھیں انہیں میں نہیں پہچانتی تھی۔ بہر حال میں سب سے مل کر بیٹھی تو تائی اماں پوچھنے لگیں۔

''اور سب لوگ نہیں آئے بس تم اکیلی آئی ہو؟''

''سب تیار تھے تائی اماں! بس اچانک امی کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہی کی وجہ سے باجی کو بھی رکنا پڑا۔'' میں جو سوچ کر آئی تھی بڑے آرام سے کہہ دیا۔

''میں سمجھی کوئی ناراضگی ہے۔'' تائی اماں کے دل میں چور تھا جب ہی تو انہوں نے ایسی بات کہی جسے میں نے پکڑ لیا۔

''ناراضگی کیسی تائی اماں؟''

''وہ نرگس!'' انہیں کوئی جواب نہیں سوجھا تو نرگس کو پکارنے لگیں۔

''بہت خوشی ہو رہی ہے مجھے یہاں آ کر، عاصم بھائی کہاں ہیں اور وہ ہمایوں کتنا عرصہ ہو گیا ہے سب سے ملے ہوئے۔''

میں نے خوشی کے اظہار کے ساتھ کہا تب ہی نرگس آ کر پوچھنے لگی۔

''کس نے پکارا ہے مجھے؟''

''میں نے، عینی کے لیے چائے وغیرہ لاؤ، اتنی سردی میں آ رہی ہے۔''

''میں چائے ہی بنانے جا رہی تھی۔''

''چلو میں بھی چلتی ہوں۔'' میں اٹھ کر نرگس کے ساتھ کچن میں آ گئی۔

''اور سناؤ، کیا کر رہی ہو آج کل؟'' نرگس باجی نے چولہا جلاتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی انٹر کے امتحانوں سے فارغ ہوئی ہوں، جب ہی تو آ گئی۔''

''اور سیمی؟''

''سیمی باجی ایم اے کر رہی ہیں۔'' میں نے جھوٹ بولتے ہوئے بغور نرگس باجی کو دیکھا وہ جن کی باجی سے دوستی تھی، ان کے بارے میں پوچھتے ہوئے نظریں چرا گئی تھیں۔

''اچھا، کس سبجیکٹ میں؟''

''انگلش میں۔'' کبھی کبھی جھوٹ بولنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔

''لیکن اسے تو اردو ادب سے لگاؤ تھا۔''

''ابھی بھی ہے۔ خیر آپ بتائیں آپ کیا کر رہی ہیں؟'' میں نے بات کا رخ ان کی طرف موڑ دیا۔

''میں نے گریجویشن کر لیا ہے۔''

''اور ہمایوں بھائی کیا کر رہے ہیں؟''

وہ ابھی جاب سے لگے ہیں۔ تمہاری ان سے ملاقات نہیں ہوئی اور عاصم بھائی سے'' انہوں نے ایک نظر مجھ پر ڈال کر پوچھا۔

''نہیں۔''

''اچھا جاؤ، تم اوپر عاصم بھائی سے مل آؤ، میں جب تک یہ کباب تل لوں۔''

انہوں نے فریزر میں سے کباب نکالتے ہوئے کہا تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی کچن سے نکل آئی۔ پھر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے عاصم بھائی کے سامنے مزید کوئی جھوٹ بولنے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔

''عاصم بھائی!'' مجھے نہیں معلوم تھا عاصم بھائی کا کمرہ کون سا ہے اس لیے راہداری میں رک کر میں نے پکارا جواب ندارد۔ دوسری اور پھر تیسری پکار پر ایک کمرے کا

دروازہ کھول کر جو شخص سامنے آیا، اسے میں پہلی نظر میں بالکل نہیں پہچان سکی البتہ یہ یقین تھا کہ وہ عاصم بھائی نہیں ہیں اور ادھر وہ بھی نہیں پہچانا تھا جب ہی پوچھنے لگا۔

''آپ کون؟''

''عینی! نور العین!'' میں نے اپنا نام بتایا تو وہ ایک دم خوش ہو کر بولا۔

''ارے تم عینی ہو، کمال ہے میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ آؤ اندر آ جاؤ۔''

''پہلے اپنی پہچان تو کرائیں۔''

''ہمایوں! صرف نام کافی ہے یا پورا بائیو ڈاٹا بتاؤں۔'' میں ہنس پڑی۔

''نام ہی کافی ہے۔''

''اور کون کون آیا ہے؟'' انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بس میں اور ابو، امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے نہیں آ سکیں بہت معذرت کر رہی تھیں۔''

''اور سیمی؟'' انہوں نے کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھا تو اس بات پر میری زبان لڑکھڑا گئی۔

''وہ امی کی وجہ سے نہیں آئیں۔ ظاہر ہے امی کو اکیلا تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ میں آتی یا وہ اور میں نے ضد کی۔''

''تم ضدی تو کبھی نہیں تھیں۔'' ان کی نظریں ابھی بھی مجھ پر جمی تھیں۔

''اب ہو گئی ہوں۔'' میں ہلکے پھلکے انداز میں کہہ کر ہنسی۔

''اچھا، چلو میں چچا جان سے مل لوں۔''

''میں عاصم بھائی سے نہیں ملی۔''

''وہ موجود نہیں ہیں۔'' وہ ان کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے پھر آگے بڑھ گئے تو میں ان کے پیچھے چل پڑی۔

پھر رات کے کھانے پر عاصم بھائی سے ملاقات ہوئی۔ خاصا لیا دیا انداز تھا ان کا جبکہ باقی سب کے ساتھ خوب ہنس بول رہے تھے۔ میں سمجھ گئی اندر سے خائف ہیں کہ کہیں میں کچھ جتا نہ دوں اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ البتہ میں یہ ضرور جتانا چاہتی تھی

کہ ان کی طرح ہمارے نزدیک بھی گزری کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں اور میں بڑی بے چین تھی۔ جب تک ٹیبل پر ابو اور تایا ابا موجود رہے، میں بمشکل خود پر جبر کیے بیٹھی رہی اور جب وہ دونوں چلے گئے تب میں نے عاصم بھائی کے ساتھ بیٹھی پھوپھو کو مخاطب کر کے کہا۔

''پھوپھو! باجی کی شادی میں بھی آپ کو پہلے سے آنا ہے۔'' میں نے محسوس کیا سب میری طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ''آئیں گی ناں پھوپھو؟''

''ہاں کیوں نہیں۔ اللہ جلد وہ گھڑی لائے، سیمی کے نیک نصیب ہوں، اچھا بر ملے اسے۔'' پھوپھو نے دعائیہ کلمات کے ساتھ کہا۔

''آپ کی دعائیں ہیں پھوپھو! باجی کی جہاں بات طے ہوئی ہے وہ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔'' میں کہہ کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

''سیمی کی بات کر رہی ہو، کہاں نسبت طے ہوئی اس کی اور کب؟'' تائی اماں کے اچنبھے پر میں نے ان سے زیادہ حیرت کا اظہار کیا۔

''آپ کو نہیں پتا تائی اماں! باجی کی منگنی کو تو ایک سال ہو گیا ہے اور اب تو فیضان بھائی امریکہ سے آنے والے ہیں۔ ان کے آتے ہی شادی طے ہو جائے گی۔''

''فیضان نام ہے ان کا، کیسے ہیں؟'' پھوپھو کی بیٹی عذرا نے شوق سے پوچھا۔

''بہت اچھے، بہت ہینڈسم، امریکہ سے انجینئرنگ کی ڈگری لے کر آ رہے ہیں۔''

میں نے کن انکھیوں سے عاصم بھائی کو دیکھا ان کے چہرے پر خجالت نے مجھے بہت اطمینان اور خوشی بخشی تھی۔ حالانکہ جو کچھ میں نے کہا سب جھوٹ تھا اور سچ بول کر کیا ملتا مجھے، احساس توہین جواب میں نے ان کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

اگلی شام دلہن کے ہاں مہندی لے کر جانا تھا۔ سب اپنی اپنی تیاریوں میں لگے تھے۔ مجھے ایک تو عذرا کے بال بنانے میں دیر ہو گئی۔ اس کے بعد اپنی تیاری اور جب میں باہر نکل کر آئی تو تینوں گاڑیوں میں کہیں جگہ نہیں تھی۔

''ادھر امی کے پاس چلی جاؤ ناں!'' نرگس باجی نے اگلی گاڑی کی طرف اشارہ کر کے کہا، پھر خود اتر کر میرے ساتھ آ گئیں۔ لیکن تائی اماں کے پاس بالکل جگہ نہیں تھی۔ تب مجبوراً نرگس باجی کو مجھے اپنے ساتھ بٹھانا پڑا۔ وہ شاید کپڑے خراب ہونے کے ڈر سے

مجھے جگہ نہیں دے رہی تھیں۔

''چلیں۔'' ہمایوں کے پوچھنے پر میں اچھل بھی نہیں سکی۔ کیونکہ ان کے اور نرگس باجی کے درمیان بیٹھی تھی اور بیٹھتے ہوئے میں نے بالکل غور نہیں کیا تھا۔ اب بہت عجب سا لگ رہا تھا۔ اتنی قربت جس نے میرے حواس گم کر دیے تھے۔

پچھلی نشست پر بیٹھی لڑکیاں اور نرگس باجی مسلسل کچھ نہ کچھ بول رہی تھیں، بس ایک میں خاموش تھی اور بالکل غیر ارادی طور پر اپنے بازو سے مس ہوتے ان کے بازو کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے میرے دل کی دھڑکنیں کبھی بہت مدھم اور کبھی بہت تیز ہو رہی تھیں۔

''عینی! تم خاموش ہو؟'' عقب سے عذرا نے میرا کندھا چھو کر کہا تو اس کی طرف چہرہ موڑتے ہوئے میری نظریں ہمایوں کے ہونٹوں میں دبی مبہم سی مسکراہٹ میں الجھ گئیں۔ اسی پل ہمایوں نے مجھے دیکھا تھا اور پھر یوں موڑ کاٹا کہ سنبھلتے سنبھلتے بھی میری پیشانی ان کے کندھے سے جا لگی۔

''اف۔ کیا مصیبت ہے۔'' میں فوراً سیدھی ہو بیٹھی۔

''لو بھئی، آ گیا عاصم بھائی کا سسرال۔'' ہمایوں نے وسیع رقبے پر پھیلے عالیشان بنگلے کے سامنے گاڑی روکی تو میں سچ مچ بہت حیران ہو کر دیکھنے لگی تھی۔ کیونکہ تایا ابا کی تو اتنی حیثیت نہیں تھی۔

اور پھر معمولی صورت کی دلہن کو دیکھ کر اپنے آپ میری سمجھ میں آ گیا کہ عاصم بھائی نے بنگلہ، گاڑی اور پیسے کے عوض خود کو بیچ ڈالا ہے۔ اس رات پھوپھو کتنی دیر تک مجھ سے ہی باتیں کرتی رہیں۔

''یہ دلہن لائی ہیں بھابھی بیگم۔ ذرا عاصم کے جوڑ کی نہیں ہے۔ اس سے اچھی خوب صورت لڑکیاں تو خاندان میں موجود تھیں۔'' پتا نہیں پھوپھو کا اشارہ باجی کی طرف تھا یا انہوں نے یونہی ایک بات کی تھی۔

''خاندان کی کوئی لڑکی اپنے ساتھ یہ اتنا کچھ تو نہیں لا سکتی تھی پھوپھو!'' میں نے کہا تو پھوپھو تائید کرتی ہوئی بولیں۔

''ٹھیک کہتی ہو، لیکن اب عاصم تو ہاتھوں سے نکل گیا ناں۔ وہ لڑکی کہاں اس گھر

میں رہے گی عاصم کو لے کر اپنے بنگلے میں چلی جائے گی۔''

''ہو سکتا ہے۔'' مجھے عاصم بھائی پر افسوس ہو رہا تھا۔

پھر ولیمے کے بعد ابو نے مجھے واپسی کی تیاری کرنے کو کہا تو تایا ابا کے ساتھ نرگس باجی بھی میرے رکنے پر اصرار کرنے لگیں اور میری سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں امی اور باجی کی ناراضگی کے خیال سے جانا چاہتی تھی جبکہ دل رکنے پر تو آمادہ تھا۔

سارا وقت تو شادی کی مصروفیت میں گزر گیا اب فارغ ہوئے ہیں تو ہم تمہیں خوب گھمائیں گے۔ ''مری، اسلام آباد، پتا ہے مری میں برف باری ہو رہی ہے۔'' نرگس باجی نے میرے اشتیاق کو ہوا دی پھر ابو سے کہنے لگیں، ''چچا جان، عینی کو کچھ دن یہیں رہنے دیں یوں بھی آج کل یہ فارغ ہے۔''

''عینی کی مرضی بیٹا! رہنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' ابو میری مرضی پر چھوڑ کر خود بری الذمہ ہو گئے اور میں گومگو کی کیفیت میں کھڑی تھی کہ قریب سے ہمایوں سرگوشی کرتے ہوئے نکل گئے۔

''تمہیں ابھی رکنا ہے۔'' ان کے لہجے میں التجا تھی نہ تحکم، اور جانے کیا تھا کہ میں اپنا سوٹ کیس اٹھا کر نرگس باجی کے کمرے میں رکھ آئی۔

☆......☆......☆

مجھے ہمیشہ سے برف باری دیکھنے کا بہت شوق تھا اور میں سچ مچ دیوانی ہو گئی تھی۔ رگوں میں لہو منجمد کر دینے والی سردی کی پروا کیے بغیر دونوں ہاتھوں سے برف سمیٹ کر گھروندہ بنانے کی کوشش کرنے لگی تو نرگس باجی ٹھٹھرتی ہوئی بولیں۔

''اف عینی! مر جاؤ گی۔ اٹھو یہاں سے۔''

''ایک منٹ پلیز۔'' میں نے منت سے کہا تبھی ہمایوں میرے سامنے پنجوں پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

''ایسا گھروندہ کیوں بنا رہی ہو جو ذرا سی تپش سے پگھل جائے گا۔'' میں نے چونک کر دیکھا ان کی نظریں میرے ہاتھوں پر تھیں۔

''یہ تو بس یونہی۔'' میں گھبرا کر کھڑی ہو گئی اور نرگس باجی کی طرف بڑھتے

ہوئے میرے ہی پاؤں تلے میرا گھروندہ بکھر گیا تھا۔

پھر ایک جگہ کافی پیتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ نرگس باجی اور ہمایوں اشاروں کی زبان میں ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے قصداً ان دونوں کی طرف سے رخ موڑ لیا تاکہ وہ آسانی سے بات کر سکیں۔ کیونکہ کبھی باجی اور میرے درمیان بھی کوئی تیسرا موجود ہوتا تو باجی اسی طرح اشارے میں مجھے کوئی بات سمجھانے کی کوشش کرتیں اور میں اس معاملے میں اتنی اناڑی تھی کہ اکثر جھنجھلا جاتی تھی اس لیے میں نے ان دونوں کی طرف سے اپنا دھیان ہٹا لیا تھا۔

''سنو!'' کچھ دیر بعد نرگس باجی مجھے اپنی طرف متوجہ کر کے کہنے لگیں۔ ''تمہیں یاد ہے جب ہم لاہور میں تھے تو ہماری ماؤں نے عاصم بھائی اور سیمی کی نسبت طے کی تھی؟''

''پھر؟'' میں نے جواب کے بجائے سوال اٹھا دیا۔

''پھر یہ کہ تم لوگوں کو عاصم بھائی کی شادی پر حیرت تو ہوئی ہوگی؟'' انہوں نے کہا تو میں بظاہر لاپرائی سے کندھے اچکا کر بولی۔

''نہیں، ایسی کوئی حیران کن بات تو نہیں ہے۔''

''کیسے نہیں ہے؟'' ہمایوں بول پڑے۔ ''نہ صرف حیران کن بلکہ افسوسناک بھی، کیا اب تک سیمی کو اس انتظار میں نہیں بٹھایا گیا کہ۔''

''نہیں ہمایوں بھائی!'' میں نے ان کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ ''امی نے تو بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ ان کے اور تائی اماں کے درمیان طے ہونے والی بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیونکہ اس طرف بالکل خاموشی تھی۔ اگر وقفے وقفے سے یاد دہانی کرائی جاتی تب تو امی باجی کو بٹھائے رکھتیں اور باجی نے بھی بہت جلد حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا جب ہی تو فیضان بھائی کے ساتھ ان کی منگنی ہوئی وہ بھی ان کی پسند سے۔''

''کیا واقعی تم سچ کہہ رہی ہو؟'' نرگس باجی نے بے یقینی سے پوچھا۔

''جھوٹ بول کر کیا ملے گا مجھے۔'' میں قصداً مسکرائی تو ہمایوں نے یوں گہری سانس کھینچی جیسے دل سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو تب نرگس باجی کہنے لگیں۔

''ہم نے خاموشی یوں اختیار کر لی تھی کہ عاصم بھائی اپنے دل اور باس کے چکر

میں آ گئے تھے اور اس تمام عرصے میں ہم سب نے بہت کوشش کی کہ وہ بہت بڑا آدمی بننے کا خیال چھوڑ دیں لیکن یقین کرو ہم میں سے کوئی بھی اس شادی پر راضی نہیں تھا۔''

''چلیں، جو ہوا اچھا ہوا۔'' میں نے ان کے چہروں پر ندامت دیکھ کر بات ختم تو کر دی لیکن اب مجھے اپنے دل پر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں میرا جھوٹ کب تک چلے گا۔

پھر جتنے دن میں تایا ابا کے گھر رہی۔ مجھے ہر دم یہی خدشہ رہا کہ کہیں میرا جھوٹ کھل کر مجھے ان سب کے سامنے شرمندہ نہ کر دے کیونکہ وہ تو اعتراف کر کے ہلکے ہو گئے تھے اور میرے لیے یہ بہت مشکل تھا۔ شاید اسی خوف سے میں نے واپسی کی رٹ لگا دی۔

''بس تایا ابا! بہت رہ لیا، آپ ابو کو فون کریں، مجھے آ کر لے جائیں۔'' میں تایا ابا کی منت کر رہی تھی۔

''بیٹا! کیوں اتنی پریشان ہو گئی ہو، یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے۔'' تایا ابا نے شفقت سے میرے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''اصل میں، میں کبھی امی اور باجی سے اتنے دن دور نہیں رہی۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میں فون کرتا ہوں تمہارے ابو کو۔'' تایا ابا نے مجھے بچوں کی طرح بہلایا پھر میری ضد پر اسی وقت فون کرنے لگے تو میں نرگس باجی کو اپنے جانے کا بتانے کے لیے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی کہ سامنے سے آتے ہوئے ہمایوں سے ٹکرا گئی۔

''خیریت؟'' انہوں نے مجھے بدحواس دیکھ کر پوچھا تو میں جلدی سے بولی۔

''میں واپس جا رہی ہوں، ابو آ رہے ہیں مجھے لینے۔''

''کب؟''

''میرا خیال ہے شام تک آ جائیں گے۔'' میرے خیال پر انہوں نے ذرا سی بھنویں اچکا کر پوچھا۔

''فون آیا ہے ان کا؟''

''نہیں میں نے تایا ابا سے کہا ہے انہیں فون کرنے کو اور وہ کر رہے ہیں۔'' میں بتا کر جانے لگی کہ انہوں نے اچانک میرا بازو تھام لیا۔

''سنو، پھر کب آؤ گی؟''

''پتا نہیں۔'' میں بہت نروس ہو گئی تھی۔

''مجھے پتا ہے۔'' وہ میری کھلی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائے۔ ''بہت جلد ہم تمہیں لے آئیں گے، ہمیشہ کے لیے۔''

''پلیز میرا بازو چھوڑیں۔''

''پہلے بتاؤ، آؤ گی نا ہمارے ساتھ، کبھی نہ جانے کے لیے۔'' ان کے لہجے میں جذبوں کی شدتیں میرا وجود پگھلائے دے رہی تھیں۔ بمشکل تمام میں ان کی گرفت سے اپنا بازو چھڑا کر بھاگی تھی۔

☆......☆......☆

امی اور باجی تو پہلے ہی میرے جانے سے ناراض تھیں مزید وہاں رکنے پر تو ان کی ناراضگی سوا ہو گئی تھی۔ لیکن میں نے بہت جلد انہیں منا لیا اور رات میں باجی کے لحاف میں گھس کر میں نے انہیں وہ ساری باتیں کہہ سنائیں جو تایا ابا کے گھر میں میں نے جھوٹ کہی تھیں۔

''تم نے جھوٹ کیوں بولا؟'' باجی سب سن کر افسوس سے بولیں۔

''اس لیے کہ عاصم بھائی اس زعم میں نہ رہیں کہ انہوں نے آپ کو ٹھکرایا ہے۔ اس کے برعکس اپنے ٹھکرائے جانے کے احساس سے وہ کبھی آپ کے سامنے سر نہیں اٹھا سکیں گے۔''

''یہ تو ہے۔'' باجی نے پہلے میری تائید کی پھر کہنے لگیں۔ ''لیکن عینی! کیا اس سے میرے اندر سے ٹھکرائے جانے کا احساس مٹ جائے گا؟''

''مٹ جائے گا۔'' میں نے لاپروائی سے کہا۔

''اچھا یہ بتاؤ نرگس کیسی ہے؟'' باجی کو غالباً اپنے نرگس کے ساتھ گزرے دنوں کی یاد آ گئی تھی جبھی اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔

''ٹھیک ہیں آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔''

''اور ہمایوں؟''

''ہمایوں۔'' ہونٹوں کے بے آواز جنبش کے ساتھ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اور ذہنی رو بہک گئی۔

''کہاں کھو گئیں۔'' باجی نے میرا گال تھپکا تو میں چونک کر بولی۔

''نیند کا جھونکا آ گیا تھا۔''

''جاؤ سو جاؤ۔'' میں فوراً اٹھ کر اپنے بیڈ پر آ گئی اور لحاف میں منہ چھپا کر اپنی دھڑکنیں شمار کرنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

میری زندگی میں خوب صورت موڑ آ گیا تھا۔ میں آہٹوں پر چونکنے لگی تھی اور جاگتی آنکھوں میں جانے کیسے کیسے خواب سجا لیے تھے۔ کتنے دن گزر گئے۔ ہمایوں نے بہت جلد آنے کو کہا تھا۔ میں ایک ایک دن گن رہی تھی اور کتنی نادان تھی میں جو یہ بھول گئی تھی کہ مجھ سے پہلے باجی ہیں۔ جن کی فکر میں امی اپنی نیندیں کھو بیٹھی ہیں۔ یہ احساس مجھے اس وقت ہوا جب امی کی ایک جاننے والی اپنے بیٹے کا پرپوزل میرے لیے لے کر آئیں اور امی نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ جب تک بڑی کی نہیں ہو جاتی چھوٹی کا انہیں سوچنا بھی نہیں۔

مجھے جہاں اس پرپوزل کے ٹل جانے کا اطمینان ہوا وہاں یہ خیال کہ کہیں ہمایوں کے لیے بھی ایسا ہی جواب نہ ہو اور اس خیال نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ جتنی شدت سے منتظر تھی اسی شدت سے دعا کرنے لگی کہ ان کی طرف سے ابھی کوئی نہ آئے۔

''آج کل تمہارا دھیان کہاں رہتا ہے؟، کام کیا کہو، کرتی کیا ہو۔'' اس روز باجی نے مجھے ٹوکا تو میں بری طرح سٹپٹا گئی۔

''وہ اصل میں رزلٹ آنے والا ہے ناں دعا کریں، میں پاس ہو جاؤں۔''

''پہلے کبھی تم فیل ہوئی ہو جو اب ہوگی۔ خوامخواہ کی فکر۔'' باجی الٹا مجھے لتاڑنے لگیں۔ ''نہیں کام کرنے کو دل چاہتا تو مت کرو۔''

''کیوں بگڑ رہی ہیں خواہ مخواہ۔'' مجھے اچانک غصہ آ گیا۔

''خوامخواہ بگڑ رہی ہوں۔ یہ دیکھو......'' باجی پتیلی میرے سامنے کرتے ہوئے

بولیں۔ ''میں نے چاول بھگونے کو کہا تھا تم نے لے کے آٹے کی لئی بنا دی۔''

''یہ آٹا ہے۔'' میں نے ان کے ہاتھ سے پتیلی جھپٹ لی۔

''آٹا۔ اب اسے اپنے سر پر تھوپو۔'' باجی کہتی ہوئی کچن سے نکل گئیں تو بجائے شرمندہ ہونے کے میں ہنستی چلی گئی۔

پھر کچھ دنوں میں میرا رزلٹ آ گیا۔ حسب سابق بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئی تھی اس کے باوجود میں نے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا کیونکہ اب میرا کسی کام کسی بات میں دل نہیں لگتا تھا۔ پھر غالباً میرے لاشعور میں یہ بات بھی تھی کہ کسی بھی دن ہمایوں کا پرپوزل آنے سے میری شادی طے ہوسکتی ہے تب پڑھائی درمیان میں رہ جائے گی اس لیے ابھی منع کر دیا جائے، لیکن جب ابو نے سنا تو مجھے بہت ڈانٹا کہ میں کس حساب سے تعلیم کو خیر باد کہہ رہی ہوں اور پھر مجھے فوراً کالج جانے کا حکم صادر کیا تھا۔

میں نے مجبوراً بی اے میں ایڈمیشن لے لیا تو پھر وہی روٹین شروع ہوگئی تھی۔ جو پہلے مجھے اچھی اور اب انتہائی بور لگنے لگی تھی۔ عجیب روکھے پھیکے دن تھے۔ میں سخت اکتائی ہوئی تھی۔ اپنے آپ پر غصہ بھی آتا تھا کہ میں کیوں عاصم بھائی کی شادی میں گئی۔ کاش امی اور باجی کی بات مان لیتی تو آج سکون سے ہوتی۔ ہمایوں نے زندگی کو نیا موڑ دے کر تو مجھے بے سکون کر دیا تھا۔ کبھی اس کے آنے کی دعا، کبھی نہ آنے کی۔

پتا نہیں میری یہ بے سکونی اور بے چینی کب ختم ہوگی۔ انہی دنوں باجی کے لیے ایک اچھا پرپوزل آیا جس کی مکمل چھان بین کے بعد ابو نے ہامی بھر لی تو اس روز میری دعاؤں کو کنارا مل گیا تھا۔ یعنی اب صرف ہمایوں کے آنے کی دعا تھی جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر یوں مقبول ہوئی کہ تیسرے دن جب میں کالج سے لوٹی تو وہ تایا ابا اور تائی اماں سمیت موجود تھے۔ میرا دل انہیں دیکھتے ہی بے قابو ہوگیا تھا۔ بمشکل خود کو سنبھالتی تائی اماں سے لپٹ گئی۔

''آپ کب آئیں تائی اماں؟''

''اب تو جانے کو تیار بیٹھے ہیں، بس تمہارے انتظار میں رکے ہوئے تھے۔''

تائی اماں نے میری پیشانی چوم کر کہا تو میں اچھل پڑی۔

''کیا مطلب؟ ابھی سے جانے کی بات کیوں کر رہی ہیں؟''

''بیٹا! ہم صبح سے آئے ہیں اور اب چلیں گے تو شام تک گھر پہنچ جائیں گے۔''

تایا ابا نے صبح سے یوں کہا جیسے بہت دن ہو گئے ہوں۔

''یہ بھی تو آپ کا گھر ہے تایا ابا۔''

''کیوں نہیں بیٹا! اصل میں نرگس وہاں اکیلی ہے۔ عاصم اور دلہن کراچی گئے ہوئے ہیں اور کیونکہ ان کے آنے کا کچھ پتا نہیں ہے اس لیے ہم نرگس کو ساتھ لے کر نہیں آئے۔''

تایا ابا نے جانے کا سبب بتایا۔ تو میں دزدیدہ نظروں سے ہمایوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''پھر بھی تایا ابا، شام تک تو رکیں ناں، ابو سے نہیں ملیں گے۔''

''ان سے صبح ملاقات ہوگئی تھی اور ہم انشاء اللہ پھر آئیں گے۔ اچھا بھابی بیگم چلتے ہیں۔'' تایا ابا کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تو میں حیران ہو کر امی کو دیکھنے لگی مروتاً بھی انہیں رکنے کو نہیں کہہ رہی تھیں اس کے برعکس تائی اماں سے گلے مل کر یوں کھڑی ہوگئیں جیسے خدا حافظ کہہ رہی ہوں۔

''باجی!'' میں نے باجی کی تلاش میں نظریں دوڑانے کے ساتھ انہیں پکارا بھی، لیکن وہ جانے کس کونے میں تھیں، میری پکار کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تب میں اکیلی ہی تائی اماں کے ساتھ گیٹ تک آئی انہیں اور تایا ابا کو خدا حافظ کہا پھر پلٹ کر ہمایوں کو دیکھا تو وہ دھیرے سے بولے۔

''میں یہ کبھی نہیں کہوں گا کہ جو ہوا، اچھا ہوا۔''

''جی!'' میں سمجھی نہیں اور وہ مجھے سمجھانے کے لیے رکے نہیں، فوراً باہر نکل گئے تھے۔ میں حیران ہو کر دیکھتی رہی جب ان کی گاڑی موڑ پر نظروں سے اوجھل ہوگئی تب میں بھاگتی ہوئی اندر آئی تاکہ امی کو ان کے نامناسب رویے کا احساس دلا سکوں، لیکن آگے باجی کو ہنستے دیکھ کر میں ٹھٹھک کر رک گئی۔

''کیا ہوا ہے باجی!''

''ارے آج تو کمال ہوگیا۔ میں بہت خوش ہوں، کیونکہ میرے اندر سے

ٹھکرائے جانے کا احساس مٹ گیا ہے۔ میں نے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔''

باجی کے چہرے پر ایسی چمک تھی جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

''کس سے؟'' میں نے قدرے گم صم انداز میں پوچھا تو باجی زور دے کر بولیں۔

''انہی لوگوں سے جنہوں نے مجھے ٹھکرایا تھا، پتا ہے یہ لوگ اب تمہارے لیے آئے تھے۔ کتنے احمق ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ جس گھر کی ایک لڑکی کو ریجیکٹ کر چکے ہیں وہاں کی دوسری لڑکی کیونکر ہامی بھرے گی بھلا پھر بھی میں نے ایسا کچھ نہیں جتایا۔''

''پھر؟'' میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔

''پھر یہ کہ جو باتیں تم نے میرے بارے میں ان سے کہی تھیں۔ وہی میں نے بھی دہرا دیں۔ ٹھیک کہا تھا تم نے عینی!، کبھی کبھی جھوٹ بولنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ مجھے بھی بہت مزہ آیا جب میں انتہائی معصوم بن کر کہہ رہی تھی۔ آپ کو عینی نے نہیں بتایا تائی اماں اس کی منگنی کو چھ مہینے ہو گئے ہیں اور اب تو وہ لوگ شادی پر بہت اصرار کر رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔''

باجی اپنے کارنامے پر خود ہی بے تحاشہ ہنس بھی رہی تھیں اور اس طرح لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے انہوں نے خود کو بیڈ پر گرایا تو ہنسی کے درمیان مجھے سسکی کی آواز سنائی دی تھی۔

جانے کس کے ہونٹوں پر نارسائی کا دکھ ایک پل میں تڑپ کر دم توڑ گیا تھا میرے یا باجی کے۔

.....۞.....

نارسائی کے عذاب

''رخشی! رخشی!'' عباد کی پکار نے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ میں فوراً کچن سے نکل کر اندر جانے لگی تھی کہ وہ اوپر سے دیوار سے آدھا نیچے جھک کر پھر چلایا۔

''رخشی! ادھر کہاں جا رہی ہو۔ ادھر دیکھو۔'' میں نے سر اونچا کر کے اسے دیکھا۔

''کیا ہوا ہے؟''

''جلدی اوپر آؤ۔''

''نہیں آ سکتی، چولہے پر دودھ رکھا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ دانت پیس کر بولا۔

''چولہا بند نہیں کر سکتیں؟''

''ایک منٹ آتی ہوں۔'' میں نے اس کے مزید بگڑنے سے پہلے بھاگ کر چولہا بند کیا پھر سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اوپر آئی تو وہ جھپٹنے کے انداز میں میری کلائی تھام کر گھسیٹتا ہوا مجھے دیوار کے قریب لے گیا اور دو گھر چھوڑ تیسرے گھر کی چھت پر کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''اسے جانتی ہو؟''

''نہیں..... کون ہے؟'' میں نے جواب کے ساتھ پوچھا تو وہ چڑ کر بولا۔

''میں جانتا ہوتا تو تم سے پوچھتا؟''

''تو اس طرح ناراض کیوں ہو رہے ہو۔ آرام سے بات نہیں کر سکتے۔'' میرے

منہ پھلانے پر وہ ہنسنے لگا۔

''سوری۔ میں بھول جاتا ہوں کہ تمہارا دل اتنا سا ہے۔ اب رونے مت کھڑی ہو جانا۔ مجھے تمہارے آنسوؤں سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''پھر رلاتے کیوں ہو؟'' میں کہہ کر دیوار سے نیچے جھانکنے لگی تو وہ میرے بالوں کو جھٹکا دے کر بولا۔
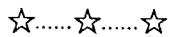
''ابھی میں نے کون سی رلانے والی بات کی ہے بتاؤ؟''

''تم بتاؤ۔ مجھے کیوں بلایا ہے؟'' میں نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے پھر اسی چھت کی طرف اشارہ کیا۔

''وہ لڑکی پہلے تو کبھی نظر نہیں آئی۔ شاید نئے لوگ آئے ہیں۔''

''مجھے کیا پتا جا کر پوچھ لو۔'' مجھے اس کا بار بار اس لڑکی کو دیکھنا اچھا نہیں لگا جب ہی کچھ چڑ کر کہا۔

''میں جا کر پوچھوں؟'' میرے چڑنے کا نوٹس لیے بغیر وہ تعجب سے بولا۔ تب ہی نیچے سے خالہ پکارنے لگیں تو میں جس طرح اس کی پکار پر بھاگی آئی تھی اسی طرح پھر دوڑ لگا دی۔ نیچے آئی تو خالہ ایک پان کے لیے شور مچا رہی تھیں۔ میں نے جلدی سے پان لگا کر انہیں تھمایا پھر کچن میں آ گئی۔

☆......☆......☆

جب ... میں نے ہوش سنبھالا تھا۔ اسی طرح گھن چکر بنی ہوئی تھی حالانکہ اس گھر میں زیادہ افراد بھی نہیں تھے۔ اور اب تو صرف تین یعنی خالہ، عباد اور میں ہی تھے۔ پھر بھی ایک ہنگامہ رہتا تھا۔ کیونکہ نہ صرف خالہ بلکہ عباد بھی یہ چاہتا تھا کہ ہونٹوں سے بات نکلتے ہی پوری ہو جائے۔ اب میں کوئی بوتل کا جن تو تھی نہیں۔

پھر بھی کوشش کرتی تھی کہ پہلی پکار کے بعد دوسری بار کسی کو پکارنے کی زحمت نہ ہو۔ لیکن یہاں کسی کو صبر نہیں تھا۔ میرے پہنچنے تک خالہ اپنا گلا خشک کر چکی ہوتیں۔ یہی

حال عباد کا تھا۔ اور اس میں قصور شاید میرا اپنا ہی تھا کہ میں نے ہوش سنبھالتے ہی خالہ کو بالکل چار پائی پر بٹھا دیا تھا اور اس پر مجھے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ نہ کوئی گلہ بلکہ میں ہر کام بہت شوق سے کرتی تھی اور تھکتی بھی نہیں تھی۔ کیونکہ تھکن تو وہاں ہوتی ہے جہاں لگن نہ ہو اور خود پر جبر کرنا پڑے۔ جبکہ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ شروع میں تو شاید میرے لاشعور میں یہ خوف تھا کہ اگر میں نے کسی کام میں کوتاہی کی تو خالہ مجھے واپس ابا کے پاس بھیج دیں گی، جہاں سے وہ خود مجھے سوتیلی ماں کے ظلم سے نکال کر لے آئی تھیں اور دوبارہ وہاں جانے کے خیال سے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس لیے میں جی جان سے خالہ کی خدمت میں لگ گئی تھی۔ اس کے بعد جب ایک روز میں نے خالہ کو یہ کہتے سنا تھا کہ وہ مجھے اپنے عباد کی دلہن بنائیں گی۔ تب سے ہر کام میں لگن کے ساتھ محبت بھی شامل ہوگئی تھی۔

گو کہ عباد نے براہ راست مجھ سے اظہارِ محبت نہیں کیا تھا۔ لیکن جس طرح وہ صبح آنکھ کھلتے ہی مجھے دیکھنا چاہتا تھا۔ اور جتنی دیر گھر میں رہتا میرے آس پاس منڈلاتا، اس سے میں یہی سمجھتی تھی کہ وہ میرے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ پھر وہ میرا خیال بھی بہت رکھتا ۔کبھی موسم کی تبدیلی کے باعث ہی میرا چہرہ اترا ہوا دیکھتا تو بے چین ہو جاتا۔ اور اس وقت تک آرام سے نہیں بیٹھتا تھا جب تک میری بے نام سی اداسی سمیٹ نہیں لیتا تھا۔

یہ محبت نہیں تو اور کیا تھا۔ بے شک وہ زبان سے اقرار نہ کرے لیکن اس کا ہر انداز تو ظاہر کرتا تھا۔ جب ہی میرے خواب اس گھر سے شروع ہو کر اسی گھر پر ختم ہوتے تھے کیونکہ مجھے یہاں سے کہیں نہیں جانا تھا۔ یہی میرا گھر تھا اور اپنے گھر کے دکھ بھی اتنے ہی عزیز ہوتے ہیں جتنے سکھ۔ بہر حال میں بہت مگن سی تھی۔

اس وقت میں دوپہر کے کھانے کے برتن دھو کر خالہ کے پاس آ کر لیٹی اور ان سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی کہ عباد آ گیا۔ یہ اس کے آفس سے آنے کا وقت نہیں تھا اس لیے خالہ نے فوراً تشویش سے پوچھا۔

''خیر تو ہے اس وقت کیسے آ گئے؟''

''بس آج کام اتنا نہیں تھا۔ اس لیے آ گیا۔ کھانا ہے؟'' آخر میں اس نے

مجھے دیکھ کر پوچھا تو میں فوراً کھڑی ہو گئی۔

''ہاں لاتی ہوں۔''

''فوراً مت لانا۔ میں پہلے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل لوں۔'' وہ کہتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا اور کیونکہ روٹی پکانی تھی اس لیے میں بھی اس کے پیچھے نکل کر کچن میں آ گئی۔ میرا خیال تھا روٹی ڈالنے تک وہ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل چکا ہو گا۔ لیکن جب میں ٹرے میں کھانا رکھ کر اس کے کمرے میں گئی تو وہ موجود ہی نہیں تھا۔ واش روم کا دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ میں نے حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھا پھر ٹرے وہیں ٹیبل پر رکھ کر خالہ سے پوچھنے آ رہی تھی کہ وہ سیڑھیاں اترتا نظر آیا۔ اور میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی کہنے لگا۔

''میں نے کہا تھا کھانا جلدی مت لانا میں......''

''جلدی کہاں؟ روٹی پکانے میں کچھ دیر لگی ہے۔''

میں فوراً بول پڑی۔ ''اور یہ تم منہ دھونے کی بجائے اوپر کہاں چلے گئے تھے۔؟''

''کام تھا۔''

''مجھ سے کہا ہوتا۔'' میں اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آ گئی۔

''تم سے ہی کہوں گا۔ فکر نہیں کرو۔'' وہ کہتا ہوا واش روم میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آتے ہی کھانے میں مصروف ہو کر مجھے بالکل بھول گیا۔ یعنی بیٹھنے تک کو نہیں کہا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی مجھے پکارا بھی نہیں تھا اور ابھی بھی نظر انداز کر رہا تھا۔

میں شدت سے محسوس کرتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔ لیکن مجھے کہیں چین نہیں پڑا، نہ کسی کام میں دل لگ رہا تھا۔ شام میں چائے کے لیے خالہ کو کہنا پڑا اور میں نے منع تو نہیں کیا لیکن بہت بے دلی سے چائے بنائی، پہلے خالہ کو دی پھر خاموشی سے اس کے کمرے میں رکھ کر آئی اور تار پر سے کپڑے اتار کر تہہ کر رہی تھی کہ وہ پکارتا ہوا آ گیا۔

''رخشی۔ تم چائے نہیں پی رہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا تو وہ میرے سامنے آ گیا۔

''کیوں؟''

''دل نہیں چاہ رہا۔'' میں نے روٹھے لہجے میں کہا تو وہ اپنا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''لو پھر میں بھی نہیں پی رہا۔''

''کیوں۔ تم کیوں نہیں پی رہے؟''

''جب تمہارا دل چاہے گا تو ساتھ پئیں گے۔''

اس نے مسکرا کر کپ زبردستی میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا تو میں نے کچھ حیران ہو کر اس کے پیچھے دیکھا پھر کچن میں آ کر دوبارہ چائے بنا دی اور دو کپ لے کر اوپر آئی تو وہ چارپائی پر آڑا لیٹا گنگنا رہا تھا۔

یہ تیرا آنا چپکے چپکے

میں مسکراتی ہوئی اس کی نظروں کے عین سامنے رکی تو اس نے گنگنانا بند کر دیا اور یونہی لیٹے لیٹے میرے ہاتھ سے ایک کپ لے کر پوچھنے لگا۔

''اماں کیا کر رہی ہیں؟''

''نماز پڑھ رہی ہیں۔'' میں بتا کر اسی چارپائی پر بیٹھنے لگی تو وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا، اور غالباً اپنی اس بے ساختہ حرکت کو چھپانے کی خاطر ادھر ادھر دیکھنے لگا یا شاید مجھ پر میری بے تکلفی جتانا نہیں چاہتا تھا اس کے باوجود میں سمجھ کر اپنے آپ میں کچھ شرمندہ سی ہو گئی اور بیٹھنے کا ارادہ ترک کر کے دیوار کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی۔ پھر چائے کا سپ لیتے ہوئے میں نے دیکھا اس تیسرے گھر کی چھت پر اس روز والی لڑکی مجھے دیکھتے ہی بوکھلا کر بھاگ رہی تھی۔ جس پر مجھے بے ساختہ ہنسی آئی تو عقب سے وہ پوچھنے لگا۔

''کیا ہوا؟''

''وہ لڑکی۔'' میں اسی طرح ہنستی ہوئی اس کی طرف پلٹ کر بولی۔

''مجھے دیکھ کر یوں بھاگی جیسے پتا نہیں۔''

"چڑیل سمجھی ہوگی۔" عباد نے مسکراہٹ دبا کر کہا تو میں چیخ پڑی۔

"میں چڑیل لگتی ہوں؟"

"میں اپنی نہیں اس کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے تو تم دنیا کی سب سے حسین لڑکی لگتی ہو۔ اور میں اکثر سوچتا ہوں کہ اتنی حسین لڑکی یہاں اس چھوٹے سے گھر میں کیا کر رہی ہے اسے تو کسی محل میں ہونا چاہیے تھا۔"

وہ خاصے جذباتی انداز میں بولتے ہوئے میرے قریب آ کھڑا ہوا پھر میرے عقب میں نظریں دوڑا کر پوچھنے لگا۔

"کہاں ہے وہ؟"

"کون؟" میں اس کے لہجے میں کھوئی ہوئی تھی چونک کر بولی۔

"وہی جو" وہ جانے کیوں خاموش ہوگیا پھر قدرے توقف سے کہنے لگا۔

"سنو، تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے۔ کرو گی ناں؟"

"پہلے کبھی کسی کام کو منع کیا ہے۔" میں نے کہا تو اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا پھر یوں خاموش ہوگیا جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ کیسے کہے کتنی دیر بعد مجھے ٹوکنا پڑا۔

"تم نے کام نہیں بتایا۔"

"ہاں وہ......کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تمہیں بس میرا پیغام پہنچانا ہے۔" وہ کچھ رک رک کر بولا تو میری سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

"وہ جو لڑکی ابھی تمہیں دیکھ کر بھاگی تھی۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھنے لگا تھا۔ "تم اس تک میرا یہ پیغام پہنچا دو۔ یا ایسا کرو اس سے دوستی کر لو۔ ہاں یہ ٹھیک ہے تم اس سے دوستی کر لو۔ اس طرح وہ یہاں آنے جانے لگے گی تو میری بھی اس سے ملاقات ہو جائے گی۔"

"تت۔تم۔تم کیوں ملنا چاہتے ہو اس سے؟" میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔

"بیوقوف اب یہ بھی تمہیں سمجھانا پڑے گا۔ ویسے تم سمجھ کر کیا کرو گی۔ تم وہی کرو جو میں نے کہا ہے۔" وہ میرا مذاق اڑا کر اسی چھت پر دیکھنے لگا تھا۔ جس طرح اس کی نظریں بے قراری سے بھٹک رہی تھیں، اس سے میں بہت کچھ سمجھ گئی۔ پھر بھی مجھے یقین

نہیں آ رہا تھا۔ کتنی دیر تک میں اس کی ایک ایک حرکت دیکھتی رہی۔ وہ جو صبح آنکھ کھلتے ہی مجھے دیکھنا چاہتا تھا۔ میری ایک پل کی آزردگی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ دل کے دروازے کسی اور پر وا کیے کھڑا تھا۔ اور میں یہاں سے وہاں تک کہیں بھی نہیں تھی۔ مجھے یکبارگی اپنی کم مائیگی کا احساس ہونے لگا اور میری آنکھوں کے سامنے اس کا چہرہ دھندلا گیا تھا۔

اس رات میں بہت روئی تھی اتنا کہ صبح بخار میں جل رہی تھی۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح پریشان ہو گیا۔

"رات تو تم اچھی بھلی تھیں پھر ایک دم سے بخار کیسے ہوگیا؟" ڈاکٹر کے جاتے ہی اس نے مجھ سے تشویش سے پوچھا تو میں چیخ گئی۔

"کیوں میں بیمار نہیں ہو سکتی۔ انسان ہوں میں بھی۔ یا تم نے مجھے مشین سمجھ لیا ہے۔"

"میں نے تو نہیں سمجھا۔ تمہیں خود ہی شوق ہے مشین بننے کا۔" وہ میرا تیز لہجہ نظر انداز کر کے آرام سے بولا۔ پھر خالہ کو میری دوا کے اوقات سمجھا کر کمرے سے نکل گیا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے آنکھوں پر بازو رکھ کر سوچا۔ "جب اسے مجھ سے محبت نہیں ہے تو پھر میرا خیال کیوں کرتا ہے۔ میرے لیے پریشان کیوں ہوتا ہے۔ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتا۔ اس کی بلا سے میں مروں یا جیوں۔"

"اٹھو ناشتا کر لو۔" وہ شاید خود ہی ناشتا بنا کر لے آیا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا نہ ہی آنکھوں پر سے بازو ہٹایا تو خالہ کہنے لگیں۔

"اٹھو بیٹی کچھ کھا لو، پھر دوا بھی لینی ہے۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا خالہ۔"

"تمہارے دل کی ایسی کی تیسی۔" اس نے میری کلائی تھام کر زبردستی مجھے اٹھا کر بٹھا دیا۔ پھر ٹرے میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ سب تمہیں کھانا ہے اس کے بعد دوا بھی پینی ہے اور سارا دن آرام کرنا

ہے سمجھیں۔"

"میں آرام کروں گی اور گھر کا کام کون کرے گا؟"

"تم نہیں کرو گی۔" وہ پھر کمرے سے نکل گیا تو میں نے خالہ کو دیکھا پھر ان کے کہنے پر ناشتا کرنے لگی۔ اس کے بعد خالہ نے اپنے ہاتھوں سے مجھے دوا پلا کر لٹایا تو میرا دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں۔ کتنی ظالم تھیں یہ محبتیں یا شاید میں ہی نادان تھی۔

پھر دوا کے زیر اثر میں سارا دن سوتی رہی۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی جب خالہ نے مجھے کچھ کھلانے اور دوا دینے کے ارادے سے اٹھایا تو اس وقت میرا بخار اتر چکا تھا لیکن کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ کھانے میں سوپ، سلائس اور دلیہ دیکھ کر میرا منہ بن گیا۔

"آپ نے کیا کھایا ہے خالہ؟" میں نے اس خیال سے پوچھا کہ کوئی چٹخارے دار چیز ہوگی تو وہی کھاؤں گی۔

"دال روٹی، عباد نے پکائی تھی دال، اور روٹی بازار سے لایا تھا۔ تمہارے لیے یہ سوپ اور دلیہ بھی اسی نے بنایا ہے۔" خالہ نے بتایا تو میں نے تعجب سے پوچھا۔

"عباد آفس نہیں گیا؟"

"تمہیں ایسی حالت میں چھوڑ کر کیسے چلا جاتا؟ سارا دن پریشان رہا ہے۔ ابھی کہہ کر گیا ہے کہ میں تمہیں اٹھا کر تھوڑا سوپ پلا دوں، وہ پھل لے کر آتا ہے۔ بس آتا ہوگا تم جلدی سے یہ ختم کرو۔" خالہ نے میری توجہ سوپ کی طرف دلائی تو میں نے کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا، تب ہی دروازے پر دستک سن کر خالہ اٹھ کر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد واپس آئیں تو ان کے ساتھ اس چھت والی لڑکی کو دیکھ کر میرے اندر غم اور غصے کے ساتھ جانے کیسی لہر اٹھی تھی جس نے میری آنکھیں نم کر دی تھیں۔

"السلام علیکم۔" لڑکی مجھے سلام کرنے کے ساتھ کہنے لگی۔ "ہم لوگ ابھی حال ہی میں یہاں آئے ہیں۔ آس پاس کے تقریباً سب ہی گھروں سے خواتین ہمارے ہاں آ چکی ہیں، ایک آپ کے گھر سے کوئی نہیں آیا تو میں نے سوچا میں ہی جا کر مل آؤں۔ میرا نام الماس ہے۔"

میں نے اسے خوش آمدید کہا نہ جواب میں اپنا تعارف کرایا اس کے برعکس میری

پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں تھیں جیسے مجھے اس کا آنا سخت ناگوار گزرا ہو۔ اور حقیقت تو یہی تھی جس پر میں نے مروتاً بھی پردہ نہیں ڈالا تو خالہ کچھ شپٹا کر اس سے کہنے لگیں۔

"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے بیٹی! تم یہاں آ کر بیٹھو۔"

"ارے کیا ہوا آپ کو، کل تو آپ......" وہ ایک دم خاموش ہوگئی غالباً کہنے جا رہی تھی کہ کل چھت پر تو تم ٹھیک ٹھاک نظر آ رہی تھیں۔ اور میرا دل چاہا کہہ دوں۔ میری اس حالت کی ذمہ دار تم ہو، صرف تم۔ لیکن میں نے ہونٹ بھینچ لیے تب وہ کرسی میرے پلنگ کے قریب کھینچ کر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ڈاکٹر کو دکھایا آپ نے؟"

"ہاں۔ عباد صبح ہی ڈاکٹر کو لے کر آ گیا تھا۔" میرے بجائے خالہ نے جواب دیا تو اس نے فوراً ان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"کون عباد؟" اس کے لہجے میں جلد جاننے کی بے قراری تھی اور خالہ کے بتانے سے پہلے وہ آ گیا۔ اسے دیکھ کر دروازے میں یوں جم گیا جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو۔ اور ان چند لمحوں میں میرے دل پر کیسی کیسی قیامتیں گزر گئی تھیں۔

"خالہ" ضبط کرتے کرتے بھی میں نے چیخ کر خالہ کو پکارا۔ کیونکہ ان دونوں کا ایک دوسرے میں گم ہو جانا مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"کیا ہوا بیٹی؟" خالہ وہیں موجود تھیں۔ پریشان ہو کر میرے کندھے تھام لیے جبکہ وہ دونوں چونک کر میری طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"مجھے درد ہو رہا ہے۔" میں سینے پر ہاتھ رکھ کر دوہری ہوئی تو عباد پھلوں کا شاپر پھینک کر میرے قریب چلا آیا۔

"رخشی! کہاں درد ہو رہا ہے۔ مجھے بتاؤ۔ ڈاکٹر کو لے آؤں؟ دیکھو اس طرح نہیں کرو۔ اماں! آپ نے اسے سوپ پلایا تھا؟" وہ بے حد پریشان ہو رہا تھا اور میں نے اس وقت تک اسے آرام سے نہیں بیٹھنے دیا جب تک وہ لڑکی چلی نہیں گئی۔ اصل درد وہی تھی۔ اس کے بعد میں نے سکون سے آنکھیں بند کر لیں، کچھ دیر بعد مجھے عباد کی آواز سنائی دی۔ وہ خالہ سے پوچھ رہا تھا۔

"اماں پہلے بھی اسے کبھی ایسا درد ہوا ہے؟"

"نہیں۔" میرے بالوں میں حرکت کرتی ہوئی خالہ کی انگلیاں ٹھہر گئی تھیں۔

"یہ اچانک کیا ہو گیا ہے اسے۔ ابھی تو سکون سے سو رہی ہے۔ سونے دیں۔ صبح میں اسے کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔" عباد میری نیند میں خلل کے خیال سے بہت دھیمی آواز میں بول رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کے لہجے کی تشویش میں محسوس کر رہی تھی اور میرا دل چاہا میں ساری زندگی اسی طرح اسے اپنے آپ میں الجھائے رکھوں۔ ایک پل کو بھی اس کا دھیان ادھر ادھر نہ ہونے دوں۔ لیکن اس کم بخت کا جادو چل گیا تھا۔ جب ہی میں اپنی ہر کوشش میں ناکام ہوتی گئی تھی۔

وہ ہر دوسرے دن آن موجود ہوتی اور عین اس وقت جب عباد کے آنے کا وقت ہوتا۔ حالانکہ میں اسے منہ نہیں لگاتی تھی اور خالہ کو بھی اس کا ہر دوسرے دن آنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ شروع کے کچھ دن تو مروتاً انہوں نے خوش اخلاقی برت لی تھی۔ اس کے بعد ان کی تیوری چڑھ جاتی پھر بھی اس نے آنا نہیں چھوڑا۔ جانے کس مٹی کی بنی تھی۔ کئی بار میں نے سوچا اسے کھری کھری سنا دوں۔ لیکن میں عباد سے ڈرتی تھی۔ جو پہلے ہی میرے اور خالہ کے اس کے ساتھ نامناسب رویئے پر ہم سے نالاں رہنے لگا تھا۔ اور اس روز تو اس نے حد ہی کر دی، اس کے سامنے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا تھا۔

"تمہیں اتنی تمیز نہیں ہے کہ گھر آئے مہمان سے چائے کا ہی پوچھ لو۔" عباد نے الماس کے سامنے مجھے اس بری طرح ٹوکا کہ احساس توہین سے میں گنگ ہو گئی تھی اور چاہا کہ وہاں سے ہٹ جاؤں لیکن الماس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ نے ایک دم میرا دماغ گھما دیا تھا میں تڑخ کر بولی تھی۔

"کون مہمان؟ ہر روز کوئی منہ اٹھا کر چلا آئے تو اسے مہمان نہیں کہتے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔" وہ زور سے دھاڑا تھا۔

"تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ اور اگر تمہیں زیادہ ہی مہمانداری کا شوق ہے تو خود بنا لو چائے۔" میں کہتی ہوئی بھاگ کر اندر آ گئی۔ کیونکہ میرے گلے میں آنسوؤں کا پھندا لگ گیا تھا اور الماس کے سامنے میں رونا نہیں چاہتی تھی۔ البتہ خالہ کی گود میں سر رکھ

کر بہت روئی اور مسلسل ایک ہی جملہ کہے جا رہی تھی۔

"عباد نے مجھے اس کے سامنے ذلیل کیا ہے۔ میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔"

خالہ مجھے چپ کرانے کے ساتھ عباد کو کم الماس کو زیادہ کوسنے لگیں اور ساری فساد کی جڑ تھی تو وہی، لیکن مجھے اب عباد پر غصہ تھا کہ وہ کیوں اسے اتنی لفٹ کرا رہا تھا اگر اس کی شہہ نہ ہوتی تو وہ کہاں اتنی جرأت کر سکتی تھی۔ بہر حال اس کے جانے کے بعد عباد بہت تلملایا ہوا کمرے میں آیا تھا۔

"اماں! آپ کو الماس کے آنے پر کیا اعتراض ہے؟"

"تم کیوں اس کی اتنی طرفداری کر رہے ہو؟" خالہ نے الٹا اسے لتاڑنا چاہا تھا کہ وہ بول پڑا۔

"میں اسے پسند کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔ آپ کل ہی میرا پیغام لے کر اس کے گھر جایئے گا۔" اس نے کھڑے کھڑے میرے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ یوں لگا جیسے میں بھری دنیا میں اکیلی ہو گئی ہوں۔ میرے خواب جو اس گھر سے شروع ہو کر اسی گھر پر ختم ہوتے تھے سب چکنا چور ہو گئے۔ اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔

"ہرگز نہیں۔ میں کبھی اس لڑکی کو اپنی بہو نہیں بناؤں گی۔" خالہ نے صاف انکار کر دیا۔

"میری شادی ہو گی تو صرف اسی سے اور بس۔" وہ دو ٹوک انداز میں کہتا کمرے سے نکل گیا۔ تو میں نے اپنی چیخوں کا گلا گھونٹنے کے لیے سختی سے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا تھا۔

اس کے بعد سے گھر کے ماحول میں ایسی کشیدگی سمٹ آئی تھی کہ میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ عباد نے مجھ سے اور خالہ سے بھی بات چیت بالکل بند کر دی تھی۔ صبح بہت خاموشی سے ناشتا کر کے نکل جاتا۔ شام میں آتا تو اپنے لیے خود ہی چائے بناتا پھر جو چھت پر جا کر بیٹھتا تو رات میں ہی اترتا تھا۔

اس دوران میں جلے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں چکراتی رہتی تھی۔ خالہ کو

بھی ضد ہو گئی تھی کہ وہ الماس کے گھر نہیں جائیں گی۔ کتنی بار میرے سامنے رو چکی تھیں کہ وہ مجھے اپنی بہو بنانا چاہتی ہیں وہ ڈائن جانے کہاں سے بیچ میں آگئی ہے اور سوچتی تو میں بھی ایسا ہی تھی اور چاہتی تھی کہ خالہ اسی طرح اپنی ضد پر قائم رہیں لیکن عباد کی ناراضگی بھی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میں اندر ہی اندر کڑھتی رہتی اور اس روز وہ جیسے ہی چھت پر گیا میں دبے پاؤں اس کے پیچھے چل پڑی تھی۔

''سنو! تم مجھ سے کیوں ناراض ہو؟'' میں نے کہا تو اس نے فوراً پلٹ کر میری طرف دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔

''بتاؤ ناں، میرا کیا قصور ہے؟'' میری عاجزی پر وہ طنز سے بولا۔

''کوئی قصور نہیں تمہارا۔ تم تو بہت معصوم ہو۔ ہے ناں۔'' میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو دانت پیس کر بولا۔

''خبردار میرے سامنے ٹسوے بہائے تو۔ سارا وقت اماں کو پٹی پڑھاتی رہتی ہو اور میرے سامنے معصوم بنتی ہو۔''

''میں۔ قسم لے لو۔ میں نے خالہ سے کچھ نہیں کہا۔ وہ خود ہی۔''

''زیادہ صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جاؤ اپنا کام کرو۔'' وہ میرے آنسوؤں سے قدرے نرم پڑ گیا۔

''تم پہلے اپنی ناراضگی دور کرو۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی۔'' میں نے کہا تو وہ کچھ دیر تک مجھے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

''ایک شرط پر، اگر جو تم اماں کو الماس کے حق میں ہموار کر لو تو میری ناراضگی اپنے آپ دور ہو جائے گی۔''

اف کیسا ظالم تھا پھر بھی میں نے اس کی شرط مان لی۔ اور اس روز سے خالہ کی خوشامدیں کرنے لگی تھی اور خالہ بھی مانی تو اسی شرط پر کہ پہلے وہ میری شادی کریں گی اس کے بعد الماس کے ہاں جائیں گی، جس پر عباد نے کوئی احتجاج نہیں کیا بلکہ شاید اسے بھی یہی مناسب لگا تھا۔ کیونکہ خالہ نے سب کو بتا رکھا تھا کہ میں ان کی بہو بنوں گی۔ پھر بھلا کوئی کیسے میرے بارے میں سوچ سکتا تھا۔ بہر حال مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں

تو بس عباد کی خوشی چاہتی تھی اور وہ ان دونوں بہت خوش تھا۔ روزانہ میرے جہیز میں دینے کے لیے کوئی نہ کوئی چیز لا کر خالہ کو دیتا۔ پھر ان کے ساتھ بیٹھ کر شادی کے اخراجات کی لسٹ بناتا۔

اور جب خالہ کہتیں کہ کہیں اچھا رشتہ ملے گا تب ہی تو شادی ہو گی تو اس پر وہ انہیں اطمینان دلاتا کہ فکر نہیں کریں بہت اچھا رشتہ ملے گا۔ بس آپ شادی کی تیاری کریں۔ جانے وہ اس سلسلے میں خود کوئی کوشش کر رہا تھا یا کیا تھا میں بہر حال سمجھنے سے قاصر تھی اور سچ تو یہ ہے کہ میں بڑی شدت سے دعائیں مانگ رہی تھی کہ اللہ کرے میرے لیے کوئی نہ آئے۔ ساری زندگی عباد کی اسی انتظار میں گزر جائے۔ لیکن مجھ جر ماں نصیب کی دعاؤں میں بھی اثر نہیں تھا۔ جیسے میری برسہا برس کی محبت اس پتھر کو نہیں پگھلا سکی تھی۔

مجھے سمیر کے پروپوزل پر اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ میں تو شاید کہیں بھی اعتراض نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ خالہ کے بہت احسانات تھے مجھ پر اور ابھی بھی اپنے بیٹے سے زیادہ انہیں میرا خیال تھا۔ اگر ان میں ذرا سی بھی خود غرضی ہوتی تو آرام سے عباد کی شادی کر سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے پہلے میرا گھر آباد کرنا چاہا۔ جیسے ہر ماں بہو لانے سے پہلے بیٹی رخصت کرنا چاہتی ہے۔ بہر حال سمیر کے بارے میں زیادہ چھان بین کی ضرورت یوں نہیں تھی کہ وہ اسی محلے میں رہتا تھا۔ اس کی والدہ کا ہمارے ہاں زیادہ تو نہیں لیکن آنا جانا تھا۔

اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے پہلی بار خالہ کو انہی سے یہ کہتے سنا تھا کہ وہ مجھے اپنے عباد کی دلہن بنائیں گی، اس کے بعد بھی ان کا اپنے بیٹے کے لیے جھولی پھیلانا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یا تو وہ بھول گئی تھیں یا پھر انہیں عباد اور الماس کا چکر معلوم ہو گیا تھا۔ دوسری بات زیادہ ٹھیک لگ رہی تھی۔ کیونکہ چھت پر کی جانے والی محبت کی آنکھ مچولی جانے کس کس نے دیکھی ہو گی، بہر حال بہت جلد میری شادی طے ہو گئی تو عباد نے خالہ کو ان کا وعدہ یاد دلانا شروع کر دیا۔ شاید وہ یہ چاہتا تھا کہ میرے ساتھ ساتھ اس کی شادی بھی ہو جائے اور خالہ مان بھی گئی تھیں لیکن اتفاق سے انہی دنوں الماس کے

والدین کسی عزیز کی شادی میں لاہور چلے گئے۔ جس سے عباد کا سلسلہ آگے بڑھنے سے رہ گیا، یوں میری شادی میں اب چند دن ہی تھے اور پتا نہیں الماس کے گھر والے چٹ منگنی پٹ بیاہ پر راضی ہوتے بھی کہ نہیں۔ اس لیے بھی خالہ اطمینان سے تھیں کہ میری شادی کے بعد سہولت سے عباد کی بات چلائیں گی۔

ان دنوں میں بہت چپ چپ رہنے لگی تھی۔ کیونکہ اس گھر سے جانے کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہی حال خالہ کا تھا۔ جبکہ وہ ستمگر بہت خوش تھا۔ جتنی دیر گھر میں رہتا مجھے چھیڑتا رہتا۔ اس کی شوخیاں عروج پر تھیں۔ جو مجھے بہت رلاتی تھیں اور یونہی روتی ہوئی میں اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ میرے خواب وہی تھے جو اس گھر سے شروع ہو کر اس گھر پر ختم ہوتے تھے اور میں ان ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں اس کی دہلیز پر چھوڑ آئی تھی۔

''السلام علیکم'' سمیر کی آواز میں پالینے کا سرور تھا۔ میں اپنے آپ میں سمٹنے لگی تھی کہ اس نے ایک دم سے میرا گھونگھٹ الٹ دیا۔

''بہت چھپ لیا تم نے، اب نہیں چھپنے دوں گا۔'' وہ سرشادی سے بول رہا تھا۔ میں ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگی۔

''تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیے میں گھنٹوں اپنی بالکونی میں کھڑا رہتا تھا۔ لیکن تم مجھے دیکھتے ہی غائب ہو جاتی تھیں۔ تب میں نے امی کو تمہارے ہاں بھیجا تو معلوم ہوا تمہاری خالہ تمہیں اپنے گھر سے نکالنے کو تیار ہی نہیں۔ یعنی وہ تمہیں اپنے بیٹے کی دلہن بنانا چاہتی تھیں، جبکہ تمہیں میری دلہن بننا تھا۔ یہ میں نے تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی سوچ لیا تھا۔ اور دیکھ لو تم میری دلہن بن گئیں۔'' آخر میں وہ شرارت سے مسکرایا۔ لیکن میں اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی۔

''پوچھو گی نہیں یہ سب کیسے ممکن ہوا؟'' اس نے میرا ہاتھ ہلا کر کہا تو میں چونک کر بولی۔

''ہاں کیسے؟''

''الماس کی بدولت، اس نے میرا بڑا ساتھ دیا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں

تمہارے سحر میں گرفتار ہو کر اپنی نیندیں گنوا بیٹھا ہوں لیکن تمہیں اپنی طرف راغب نہیں کر سکتا کیونکہ تم اپنی خالہ کے گھر رہتی ہو۔ جہاں اس خوف نے تمہیں بہت محتاط کر دیا ہوگا کہ کہیں خالہ کے گھر میں تمہارے لیے جگہ تنگ نہ پڑ جائے اور اسی خوف کے باعث تم ان کی ہر بات پر سر جھکانے پر مجبور ہو۔ تب الماس نے میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ تمہارے بجائے اگر عباد کا دھیان ہٹایا جائے تو میرا راستہ خود بخود صاف ہو جائے گا اور اس کے لیے الماس کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا یہ تم بھی جانتی ہو کہ تمہارا کزن کتنی جلدی میری کزن کے جال میں پھنس گیا تھا۔''

''الماس۔ آپ کی کزن؟'' میں تحیر میں تھی۔

''ہاں صرف کزن ہی نہیں میری محسن بھی ہے۔ اسی کی بدولت میں تمہیں یعنی اپنی محبت کو پا سکا ہوں۔ تھینک یو الماس تھینک یو۔'' اس نے آنکھیں بند کر کے بہت سرشاری سے کہا پھر ایک دم میری آنکھوں میں دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''تم خوش ہو ناں؟'' میں نے پلکیں جھکا لیں۔ اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی خاطر، لیکن وہ اعتراف سمجھ کر بہت خوش ہو گیا اور میرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہنے لگا۔

''اس کے لیے تمہیں الماس کا شکر گزار ہونا چاہیے اور ہاں پرسوں ہم لاہور جائیں گے۔ الماس کی شادی میں، اس کے لیے کوئی اچھا سا گفٹ سوچنا۔''

''الماس کی شادی؟'' میں نے بے اختیار پلکیں اٹھائیں تو میری آنکھوں سے چند قطرے ڈھلک گئے تھے۔ جنہیں وہ بہت احتیاط سے اپنی انگلیوں میں سمیٹتے ہوئے بولا۔

''ارے، یہ انمول موتی کیوں لٹا رہی ہو؟''

میرے پاس اور کیا ہے جو میں الماس کو دے سکوں اور اُسے، جسے صبح معلوم ہوگا کہ نارسائی صرف میرا ہی نہیں اس کا بھی مقدر ہے۔ میں نے پلکیں موند کر دُکھ سے سوچا تھا۔

.....۞.....

دروازہ کھلا رکھنا

یہ گلیاں یہ راستے مجھے یوں ازبر تھے کہ میں آنکھیں بند کر کے چل سکتی تھی، بلکہ ہمیشہ مسجد کا موڑ مڑتے ہی بھاگتی تھی اور اسی رفتار سے میرا دل خوشی سے بے قابو ہو کر دھڑکتا تھا۔ دوسری پھر تیسری اور چوتھی گلی کے اختتام پر خالہ جی کا گھر تھا۔ جس کا ایک دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا۔ میں بے دھڑک پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی تو خالہ جی کچن میں بیٹھی نظر آتی تھی خواہ کوئی سا بھی وقت ہو۔ کھلے آنگن میں بچے قرآن شریف پڑھ رہے ہوتے اور خالہ جی کچن میں بیٹھی کام کرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کو سبق یاد کرنے کی تلقین کرتی رہتیں۔

ان کا کچن خاصا کشادہ تھا، اِدھر اُدھر کئی پیڑھیاں رکھی ہوئی تھیں۔ میں جیسے ہی سامنے جا کر سلام کرتی اُن کا چہرا کھل اُٹھتا اور بازو وا ہو جاتے۔ تو میں چھوٹی بچی کی طرح ان کی آغوش میں سما جاتی۔

''کتنے دنوں سے تمہارا چہرا میری نظروں میں گھوم رہا تھا میں سمجھ گئی تم آنے والی ہو۔ کب آئیں؟''

وہ محبت کے والہانہ اظہار کے ساتھ پوچھتیں۔

''پانچ دن ہو گئے ہیں خالہ جی مجھے آئے ہوئے۔ رجو کہاں ہے؟'' میں انہیں جواب دیتے ہوئے رجو کی تلاش میں نظریں دوڑاتی۔

''یہیں پھوپھو کے گھر گئی ہے ابھی بلواتی ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی کسی بچے کو

پکار کر رجو کے پاس دوڑاتیں پھر مجھ سے ایک ایک کا حال احوال پوچھنے لگتیں۔

''سب ٹھیک ہیں خالہ جی! سب ٹھیک ہیں۔'' میں ان کے روانی سے بولنے پر ہنستی اور ادھر سے رجو کا ہنستا ہوا چہرہ نمودار ہوتا۔ اس کا خوشی کا اظہار ایسا ہی ہوتا۔ الفاظ کم ہنسی زیادہ۔ یونہی ہنستی ہوئی وہ مجھ سے لپٹ جاتی تو میں شرارت سے اسے گدگداتی۔

''اب تمہارا کراچی کا پروگرام نہیں بنتا۔''

''نہیں، وہ اٹھلاتی۔''

''بڑی بے مروت ہو۔'' میرے شکوے پر بھی وہ ہنستی جاتی۔ پھر کہتی۔ ''چلیں اندر چل کر بیٹھیں۔''

''نہیں۔ یہیں ٹھیک ہے خالہ جی کے پاس'' میں خالہ جی کو دیکھتی تو وہ میرا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہتیں۔

''بڑے دنوں بعد آئی ہو۔''

''بس خالہ جی! گھر کی مصروفیات کہاں نکلنے کی اجازت دیتی ہیں۔''

اور پھر یونہی باتوں کے دوران خالہ جی الماری کھول کر ایک کے بعد ایک شاپر نکال کر پلیٹوں میں الٹتی جاتیں۔ نمکو، بسکٹ، سوہن حلوہ، چلغوزے، مونگ پھلی، جانے کیا کیا۔ ساتھ ساتھ کھانے پر اصرار اور یہ بھی ضرور بتاتیں کہ کون سی چیز کہاں سے منگوائی ہے۔ میں حیران ہوتی اور اسی دوران کھانا بھی تیار ہو جاتا اور کھانے کے وقت تک خالو جی آ جاتے۔ گو کہ وہ دیکھتے تھے کہ ہمارے سامنے پلیٹوں میں بہت کچھ رکھا ہے اور کھانا بھی تیار ہے پھر بھی پوچھتے۔

''کیا کھاؤ گے؟'' خالو جی بڑے دل والے بڑے مہمان نواز تھے۔ بس نہیں چلتا تھا کہ دنیا کی ساری نعمتیں دسترخوان پر سجا دیں۔ اللہ نے انہیں نوازا بھی اسی حساب سے تھا۔

''یہ سب بہت ہے خالو جی! بس اور کچھ نہیں۔'' میں اپنے سامنے رکھی پلیٹوں کو دیکھ کر واقعی شرمندہ ہو جاتی۔

''چکن کھاؤ گے؟''

خالو جی میری بات یکسر ان سنی کر کے پوچھتے اور جواب کا انتظار کیے بغیر جانے کیسے پکار کر چکن لانے کو کہتے او رپھر ہر ایک منٹ کے بعد تکے کھاؤ گے ربڑی، دہی بڑے، چاٹ، اُف میں پریشان ہو جاتی۔

اس دوران رجو اندر دسترخوان لگانے چلی جاتی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میں نے کبھی کسی کو چکن، تکے وغیرہ لاتے نہیں دیکھا تھا لیکن جب اندر جاتی تو دسترخوان پر یہ ساری چیزیں موجود ہوتی تھیں جنہیں دیکھ کر مجھے گمان ہوتا کہ شاید ان کے پاس اللہ دین کا چراغ ہے ادھر منہ سے بات نکلتی ہے ادھر پوری ہو جاتی ہے۔

پھر کھانے پر محبت بھرا اصرار کہ پیٹ بھرنے کے بعد بھی کھانا پڑتا۔ اچانک ایک ہاتھ میری طرف بڑھتا تو میں چونک کر دیکھتی پھر قدرے جھینپ کر منہ کھولتی تو خالہ جی نوالہ میرے منہ میں ڈالتیں۔ اتنی محبتیں ہر ایک کو نہیں ملتیں۔ اس معاملے میں، میں جتنی خوش قسمت تھی شاید اتنی ہی بدقسمت کہ ہمیشہ جھولیاں بھر بھر کر سمیٹتی رہی۔ جواب میں اظہار کرنا مجھے کبھی نہیں آیا۔ لیکن شاید محبتیں اظہار کی محتاج نہیں ہوتیں۔ میں زبان سے کچھ نہیں کہتی تھی البتہ میرے ہر انداز سے والہانہ پن اور عقیدت چھلکتی تھی اور جواب میں خالہ جی کا بس نہیں چلتا تھا میرے لیے کیا کچھ کر ڈالتیں۔

مجھے یاد ہے ایک بار میں گرمیوں کی تپتی ہوئی دوپہر میں گئی تھی۔ اس وقت بھی خالہ جی کچن میں موجود تھیں، لیکن مجھے انہوں نے وہاں نہیں بیٹھنے دیا۔

''بہت گرمی ہے اندر چلو۔''

''آپ بھی چلیں۔'' میں ان کے ساتھ کمرے میں گئی تو رجو کے ساتھ مونا اور فری کو دیکھ کر خوش ہو گئی۔ وہ تینوں وی سی آر پر کوئی فلم دیکھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے وی سی آر بند کر دیا اور اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ بولی۔

''آپ کو گرمی نہیں لگتی؟''

''کیوں میں انسان نہیں ہوں۔''

''نہیں۔'' رجو اور میری نوک جھونک پر خالہ جی مسکراتی رہیں پھر اسے ٹوکتے ہوئے بولی تھیں۔

''ایک تو وہ اتنی گرمی میں آ رہی ہے جاؤ ستو بنا لاؤ۔''

اور اس وقت برف میں گھلا ٹھنڈا میٹھا ستو۔ حقیقتاً دنیا میں اس سے اچھی کوئی اور نعمت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ دل، دماغ، آنکھیں، روح تک میں ٹھنڈک اُتر گئی تھی۔ اس کے بعد میں مونا اور فری کو چھیڑنے میں لگ گئی میری یہ ماموں زاد بہنیں اپنے آپ میں سمٹنے والی عمر میں تھیں۔ جب ہی مجھے انہیں چھیڑنے میں مزا آ رہا تھا۔

''فلم کیوں بند کر دی؟ لگاؤ ناں۔'' میں نے فری کے بازو میں چٹکی کاٹتے ہوئے کہا تو وہ جھینپ کر بولی۔

''باجی! وہ۔ اچھی نہیں ہے۔''

''جیسی بھی ہے۔'' میں نے اُٹھ کر ٹی وی اور وی سی آر آن کر دیا۔ پھر ان دونوں کے پیچھے خالہ جی کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگی۔ مجھے فلم نہیں دیکھنی تھی لیکن جہاں فری کو فارورڈ کا بٹن دباتے دیکھتی فوراً ٹوکتی۔

''یہ کیا کر رہی ہو، دیکھنے دو۔''

''باجی!'' فری اور مونا کا شرمیلا احتجاج میری ہنسی میں دب جاتا۔ مجھے لجاتی ہوئی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ میں انہیں مزید چھیڑتی۔

''تم آنکھیں بند کر لو، میں دیکھوں گی۔'' اور خالہ جی میری شرارت پر محظوظ ہوتی رہی تھیں۔

پھر جب دھوپ کی شدت میں کمی ہوئی تو خالہ جی میری مٹھی میں پیسے دباتے ہوئے کہنے لگیں۔

''فلاں دکان پر لان کے بڑے اچھے پرنٹ آئے ہیں تم اپنے لیے لے آؤ۔''

''اُف نہیں خالہ جی! مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ یہاں کے راستے بھی میں نہیں جانتی۔'' میں نے انہیں پیسے لوٹانے چاہے تو میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے وہ بولی تھیں۔

''مونا تمہارے ساتھ جائے گی۔ جاؤ مونا! باجی کو فلاں دکان پر لے جاؤ۔''

کوئی ضروری تو نہیں ہے خالہ جی۔ میں پھر''

اور خالہ جی کہاں سنتی تھیں۔ میرے لیے ان کی محبتیں بہت تھیں اور وہ تحائف کی

صورت ان میں مزید اضافہ کرتی رہتیں۔ پھر بھی ان کا دل نہیں بھرتا تھا۔

اور میں یونہی تو نہیں مسجد کا موڑ مڑتے ہی بھاگنا شروع کر دیتی تھی کہ اس ساری زمین پر اگر کوئی جنت نظیر گوشہ تھا تو وہ خالہ جی کا گھر جس کے در و دیوار تک میں محبت کی خوشبو رچ بس گئی تھی۔ ایک انوکھا سا احساس ملتا تھا۔ تپتی ہوئی دوپہریں ہوں یا کہر میں ڈوبی شامیں۔ اس گھر کی فضا کبھی نہیں بدلی تھی، نہ چاہتوں میں کمی ہوئی بلکہ وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوا تھا۔

پھر رجو کی شادی ہوگئی اور میں باوجود شدید خواہش اور کوشش کے اس کی شادی میں نہیں جاسکی تھی۔ جس کا ملال مجھے یوں زیادہ تھا کہ وہ خالہ جی کی اکلوتی اولاد تھی اور پھر جب جانا ہوا تو رجو کی گود میں پیاری سی بچی کھیل رہی تھی۔

یہ بھی اچھا تھا کہ رجو کا گھر خالہ جی کے گھر کے قریب ہی تھا۔ دن میں کام کاج کے دوران وہ بچی کو خالہ جی کے پاس بھیج دیتی تھی۔ میکہ قریب ہونے کا یہ بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ مجھے پھوپھو کی بات یاد آئی۔ رجو سے کہتی تھیں۔

''جتنے بچے پیدا کرنے ہیں ایک ساتھ کر لو۔ بڑے آرام سے پل جائیں گے۔''

''کیسے پھوپھو؟'' میں نے بے دھیانی میں پوچھا تھا۔

''ارے کون سا جان کھپانی پڑتی ہے۔ سارا دن تو بچی تمہاری خالہ جی کے پاس رہتی ہے۔'' پھوپھو کی وضاحت پر میں نے شرارت سے رجو سے پوچھا تھا۔

''کیوں رجو، کتنے بچے؟''

''جتنے اللہ دے گا۔''

اور پھر ایک کے بعد ایک خالہ جی کے آنگن میں رجو کی تین بیٹیاں کھیلنے لگی تھیں۔ اور خالہ جی کی محبت سب کے لیے ایک سی تھی۔ ایک پل کو مجھے لگا جیسے میں پس منظر میں چلی جاؤں گی لیکن خالہ جی کے بازوؤں میں سمٹتے ہی میں اپنی ایک پل کی سوچ پر بے حد نادم ہوئی تھی کہ ان کی آغوش میں محبت کی وہی نرمی گرمی تھی۔ رتی برابر بھی تو کمی نہیں ہوئی تھی۔

شاید کچھ لوگ صرف محبتیں لٹانے ہی کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور خالہ جی انہی لوگوں میں سے تھیں۔

میں پورا سال اس ایک دن کا انتظار کرتی تھی جب خالہ جی کے گھر جانے والی پہلی گلی میں قدم رکھتے ہی میرا بچپن لوٹ آتا تھا پلک جھپکتے میں ساری گلیاں پھلانگ جاتی تھی لیکن آج میرے قدم اُٹھ کے نہیں دے رہے تھے۔ جبکہ پورے دو سال بعد آئی ہوں۔ مسجد کے موڑ تک بمشکل خود کو گھسیٹا۔ اس کے بعد آنکھوں کے سامنے دھند چھانے لگی۔ تو میں نے خود کو مسجد کی دیوار کے ساتھ سہارا دیا اور بے بسی سے سامنے دیکھا تو دھند کی چادر سے خالہ جی کا چہرا جھانکتا محسوس ہوا۔

''خالہ جی!'' میرے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی اور میرا ذہن پھر کہیں پیچھے بھٹک گیا۔

دو سال پہلے جب میں آئی تھی تو ہمیشہ کی طرح خالہ جی کے پاس کچن میں بیٹھ کر ڈھیروں باتیں کی تھیں اس سے اگلے روز میری کراچی واپسی تھی اور خالہ جی بطورِ خاص کراچی لے جانے کے لیے مجھے سوہن حلوے کا ڈبہ ضرور دیا کرتی تھیں۔ اور اس وقت شاید باتوں میں وہ بھول گئی تھیں اور اگلے روز جب میں اسٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اپنوں نے دور جانے کے خیال سے بے حد آزردہ اور ذہن پر کچھ مسائل کا بوجھ بھی تھا جنہیں میں اپنے چند دن کے قیام میں بہت کوشش کے باوجود حل نہیں کرسکی تھی کہ اچانک خالہ جی پر نظر پڑی۔ ہاتھوں میں سوہن حلوے کا ڈبہ لیے چلی آرہی تھیں۔ ان کے ساتھ رجو بھی تھی۔ مجھے اپنی بصارت پر شبہ ہوا۔ پھر بے حد حیران ہو کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی اور پوچھا تھا۔

''آپ میرے لیے آئی ہیں؟''

''اللہ دی قسم اے باجی! ہم آپ کے لیے آئے ہیں۔''

رجو نے کہا تو میں نے خالہ جی کو دیکھا اور وہ سوہن حلوے کا ڈبہ مجھے تھماتے ہوئے بولی تھیں۔

''تمہارا حلوہ رہ گیا تھا میں نے رجو سے کہا چلو دے آئیں۔

اُف۔ پتا نہیں یہ کون سا جذبہ تھا جس کی شدتوں نے میری آنکھیں نم کر دی تھیں۔ خالہ جی کو اپنی جگہ پر بٹھایا اور خود ان کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس محبت کی دیوی کے چرنوں میں بیٹھنے کے قابل بھی نہیں تھی۔ پتا نہیں وہ کس حساب سے میرا دامن بھرتی چلی آ رہی تھیں۔

''کیا بات ہے۔ اداس کیوں ہو؟''

خالہ جی نے جھک کر میرا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر پوچھا تو میری آنکھیں بے اختیار چھلک گئی تھیں جبکہ ذہن سارے مسائل کے بوجھ سے یکلخت آزاد ہو گیا اور خالہ جی کے سینے سے لگ کر میں آزردگی سے بھی نکل گئی۔ کیسے نہ نکلتی۔ ڈھیروں محبتیں جھولی میں آن گری تھیں۔ آنسوؤں کی جگہ ہنسی نے لے لی۔ کتنی شانت ہو گئی تھی میں اور مجھے کیا معلوم تھا کہ ساری خوشیاں میرے ساتھ کر کے خود کس سفر کی تیاری کر بیٹھی ہیں۔ شاید انہیں پتا تھا کہ اگلی بار جب میں آؤں گی تو وہ مجھے یوں رخصت کرنے تو کیا میرے استقبال کو بھی موجود نہیں ہوں گی۔

''امی چلیں ناں۔'' بچے نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلایا تو میں نے چونک کر پوچھا۔

''کہاں؟''

''خالہ جی کے گھر۔''

''ہاں!'' میں نے پلکوں تک آئی نمی انگلیوں پر سمیٹی اور بچے کا ہاتھ تھام کر چلنے لگی۔ پتا نہیں فاصلہ اتنا طویل کیسے ہو گیا تھا شاید میرے قدم رُک رُک کر اُٹھ رہے تھے۔

ہمیشہ کی طرح خالہ جی کے گھر کا ایک دروازہ کھلا تھا لیکن میں ہمیشہ کی طرح بے دھڑک اندر داخل نہیں ہو سکی۔ بلکہ دل چاہا یہیں سے پلٹ جاؤں۔ کہ اندر وہ مہربان محبت کرنے والی ہستی نہیں تھی۔ معاً رجو کا خیال آنے پر میں تڑپ کر اندر داخل ہوئی تو دل پر شدید چوٹ پڑی کہ سامنے کے دونوں دروازے بند تھے۔ یوں جیسے خالہ جی کے بعد کسی کو وہاں جانے کی اجازت نہ ہو۔

میں نے بمشکل ان بند دروازوں سے نظریں ہٹا کر کمرے کا رُخ کیا تو اندر سے آتی رجو ایک دم میرے سینے سے لگ گئی۔ کاش ہمارے آنسو خالہ جی کو واپس لا سکتے۔

تو خدا کی قسم ہم اپنا وجود آنسو کر دیتے۔

بے چارے خالو جی اپنی رفیقِ حیات کے غم میں بستر سے جا لگے تھے۔ وہ جو ایک ایک منٹ پر پوچھتے تھے۔ چکن کھاؤ گے تکے، ربڑی اور سب حاضر کر دیتے۔ وہ چائے تک نہیں پوچھ سکے۔ رجو کہتی رہ گئی لیکن میں بند دراوزوں سے ایسی خائف ہوئی تھی کہ اس نے اٹھنے نہیں دیا۔

''نہیں رجو اس وقت کچھ نہیں۔ چائے بھی نہیں۔''

جبکہ میرا دل احتجاج کر رہا تھا۔ چیخنا چاہتا تھا، یہ دروازے بند کیوں ہیں۔ کھول دو انہیں وہ محبت کی دیوی اندر کہیں موجود ہو گی۔''

''میری بیٹیاں پوچھتی ہیں، امی کب آئیں گی۔'' رجو بتا رہی تھی اور میری نظریں اس کی معصوم بچیوں کا طواف کرنے لگیں۔ جن کی خوبصورت آنکھوں میں انتظار کی شمعیں روشن تھیں۔ جنہیں وقت کا کوئی لمحہ یوں بجھائے گا کہ انہیں پتا بھی نہیں چلے گا کیونکہ یہ بہت چھوٹی بہت معصوم ہیں۔ جن محبتوں کو ابھی انہوں نے ڈھنگ سے پایا ہی نہیں تھا انہیں کھونے کا دکھ ایسا تو نہ تھا جو ہمارے اندر آن ٹھہرا ہے۔

''میں چلتی ہوں رجو! پھر آؤں گی۔''

میں اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی تو رجو نے خاموش نظروں سے مجھے دیکھا اور کچھ کہے بغیر میرے ساتھ برآمدے تک آئی پھر رُک گئی اور میں نے بہت چاہا کہ کچن کے بند دروازے سے نظریں چرا کر نکل جاؤں لیکن میری نظریں شاید خالہ جی کی تلاش میں بے اختیار اسی دروازے پر جا ٹھہریں اور اگلے پل میں پلٹ کر رجو کے سینے سے جا لگی۔

''رجو! اگلی بار جب آؤں تو یہ دروازہ کھلا رکھنا۔''

''باجی! امی نہیں ہیں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور میں اسے چپ نہیں کرا سکتی تھی کہ مجھے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں تھا جانے محبت کے باب اتنی جلدی بند کیوں ہو جاتے ہیں۔

اچھا نہیں ہوتا اتنا ہنسنا

اچانک سامنے آغا کو دیکھ کر میری بے ساختہ اور بے تحاشہ ہنسی کو ایک دم بریک لگ گئے۔ حالانکہ ایسا تو کبھی نہیں ہوا تھا بلکہ اسے دیکھ کر تو میں نہ بھی ہنس رہی ہوتی تو ہنسنے لگتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اس کی شکل کوئی مضحکہ خیز سی تھی۔ ''نہیں''وہ تو اچھا خاصا ہینڈسم اور اسمارٹ بندہ تھا البتہ اس کا ''اینگری مین'' والا حلیہ اور رویہ مجھے ہنساتا تھا۔ ہر وقت ماتھے پر بل اور آنکھوں میں غصہ جیسے اس کا بس چلے تو اس پوری دنیا کو پل میں تہس نہس کر دے۔

میرا خیال تھا بلکہ مجھے یقین تھا کہ وہ محض دوسروں کو متوجہ کرنے کے لیے اس طرح پوز کرتا ہے۔ ورنہ اس کے ساتھ ایسی کوئی انہونی تو نہیں ہوئی تھی اور اگر انہونی ہوئی بھی تھی تو اس میں ہم سب کا کیا قصور تھا جو وہ ہم سے خفا خفا اور اکھڑا اکھڑا رہتا تھا۔

مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی اسے ہنستے مسکراتے یا سب کے ساتھ بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے دیکھا ہو۔ سب سے الگ تھلگ اس کی اپنی ایک دنیا تھی۔ جس کے بارے میں، میں بالکل نہیں جانتی تھی کہ وہ کیسی ہے اور میں تو آغا کو بھی شروع سے نہیں جانتی۔ میرا مطلب ہے بہت زیادہ نہیں جانتی۔ بس جس طرح اور کزنز کے نام معلوم تھے اور یہ کہ وہ کون سے چچا یا تایا کی اولاد ہیں اس طرح آغا کے بارے میں بھی صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ تایا جی کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔ کیونکہ میں شروع سے امی، ابو کے ساتھ لاہور میں رہی۔ سال دو سال بعد پندرہ بیس دن کے لئے کراچی آنا ہوتا بھی تو وہ دن گھومنے پھرنے

اور سب کے ساتھ ہلڑ بازی کرنے میں اتنی جلدی گزر جاتے کہ خاص طور سے کسی کو جاننے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔

ابھی دو سال پہلے دادا ابو کے بے حد اصرار پر ابو لاہور چھوڑ کر کراچی شفٹ ہوئے تھے۔ جب سب کے ساتھ رہنے کا موقع ملا تو آہستہ آہستہ سب کے مزاج سے آشنائی بھی ہونے لگی۔

مجھے یاد ہے کراچی شفٹ ہونے کے کوئی تیسرے دن میری آغا سے ملاقات ہوئی تھی بلکہ میں خود ہی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ کیونکہ پہلے اور دوسرے دن میں نے اسے غیروں کی طرح گھر میں آتے جاتے دیکھا تھا۔ اور اس وقت میں نے سوچا تھا جس طرح میں اور سب کزنز سے ملی ہوں مجھے آغا سے بھی ملنا چاہئے۔ ہوسکتا ہے وہ اسی انتظار میں ہو اور تیسرے دن میں اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''آغا تم نے مجھے پہچانا؟'' میرے پوچھنے پر اس نے بغور میری طرف دیکھا پھر سر ہلاتا ہوا بولا تھا۔

''ہاں۔ تم غالباً رمشہ ہو ناں۔''

''ارے۔ تم نے تو واقعی مجھے پہچان لیا میں تو سمجھی تھی......''

''تم جو بھی سمجھی تھیں مجھے اس سے کوئی غرض نہیں'' وہ کھردرے لہجے میں کہتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور میں پتا نہیں کیوں کچھ مرعوب سی ہو گئی تھی۔ ایک تو اس کی پرسنالٹی دوسرے رعونت بھرا انداز کہ مجھے اپنا آپ اس کے سامنے بہت چھوٹا لگا۔

اس کے بارے میں میری پہلی رائے یہ تھی کہ وہ کسی اونچے عہدے پر فائز خاصی معتبر شخصیت اور اپنے سے کم درجے کے لوگوں سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتا ہے اس لیے اگلے کئی دن تک میں اس کے سامنے بڑی مہذب بنی رہی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ ایسے لوگ ویل مینرڈ اور ڈسپلن کے کتنے پابند ہوتے ہیں۔ اس کے سامنے میں اپنی آواز دھیمی کر لیتی۔ چال متوازن اور بے سروپا گفتگو سے پرہیز۔

اور جب مجھے اس کی حقیقت معلوم ہوئی تو پہلے تو میں کتنی دیر تک حیرتوں کے سمندر میں غوطے کھاتی رہی۔ اس کے بعد اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ مہذب پوز

کرنے پر بے حد خجالت محسوس ہوئی اور آ کر میں ایسی ہنسی جو آغا کو سامنے موجود پا کر بھی نہیں رکی تھی۔

''نان سنس۔'' اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور میری پوری بتیسی اسی طرح باہر تھی۔ تب وہ میری کلائی تھام کر مجھے سب کے درمیان سے گھسیٹ لے گیا۔ راہداری میں آتے ہی دانت پیس کر کہنے لگا۔

''کیوں ہنس رہی تھیں؟''

''اس گھر میں ہنسنے پر پابندی ہے کیا؟'' میں نے بمشکل ہنسی روک کے اطمینان سے پوچھا تھا۔

''میرا بس چلے تو میں پوری دنیا میں ہنسنے پر پابندی لگا دوں۔''

''اچھا۔'' میں پھر ہنسی تو وہ ایک جھٹکے سے میری کلائی چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا تھا۔

اور اس رات جب میں سونے کے لئے لیٹی تو اس کے بارے میں سوچتے ہوئے ایک بار پھر حیران ہو رہی تھی۔

وہ بہت چھوٹا سا تھا غالباً دو یا تین سال کا جب تائی جی یعنی اس کی امی تایا جی سے طلاق لے کر یہ گھر چھوڑ گئی تھیں۔ انہیں دادا ابو کے گھر کا مخصوص یا روایتی قسم کا ماحول پسند نہیں تھا۔ شروع میں انہوں نے یقیناً تایا جی کو الگ گھر لینے پر مجبور کیا ہو گا لیکن تایا جی پرانے خیال کے آدمی تھے وہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر جانے پر آمادہ نہیں ہوئے اور ان کی قدرے آزاد خیال بیگم اس ماحول سے سمجھوتہ نہ کر سکیں اور طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ ایسے میں انہیں آغا کا خیال بھی نہیں آیا۔ کہ ان کے اس اقدام سے اس پر کیا اثر پڑے گا۔ پتا نہیں انہوں نے اپنی ماتا کا گلا کیسے گھونٹا بہر حال بظاہر وہ بخوشی آغا سے دستبردار ہو گئی تھیں۔ اور کوئی چھ مہینے بعد نیا گھر بھی بسا لیا۔

البتہ تایا جی اگلے کئی بروں تک سنبھل نہیں سکے تھے۔ ان کا خیال تھا وہ آغا کے لیے سرمایہ حیات تھے کیونکہ وہ تایا جی کی محبتوں کا بلا شرکت غیرے مالک رہا تھا۔ پھر دادا ابو نے تایا جی کو احساس دلانا شروع کیا کہ وہ اتنی طویل زندگی تنہا بسر نہیں کر سکتے۔ کبھی نہ

کبھی انہیں کسی ساتھی کی ضرورت ضرور محسوس ہو گی۔ شروع میں تایا جی ٹالتے رہے لیکن پھر شاید وہ خود کسی ساتھی کی ضرورت محسوس کرنے لگے تھے جو ان کے دکھ سکھ شیئر کر سکے۔

جس وقت انہوں نے دادا ابو کے سامنے ہتھیار ڈالے اس وقت آغا دس سال کا تھا۔ یہ وہ عمر ہوتی ہے جب بچہ چیخ چیخ کر رونا اور ایڑیاں رگڑ کر ضد کرنا تقریباً چھوڑ چکا ہوتا ہے۔ اسی عمر میں انا اور خودداری کا جذبہ بیدار ہونے لگتا ہے۔ کوئی بھی غلط کام کرنے سے پہلے یہ خیال ضرور آتا ہے کہ کہیں دوسرے کی نظروں میں گر کر ذلیل نہ ہونا پڑے ایک طرح سے انا اور خوداری کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ زندگی کا یہ پہلا اسٹیج جہاں دل پر لگی شدید چوٹ کو دوسروں سے چھپایا جائے تو پھر باقی تمام حیات بھرم رکھنا پڑتا ہے۔ اور اسی پہلے اسٹیج پر آغا کے معصوم دل کو شدید چوٹ اس وقت لگی جب ایک دوسری عورت اس کے اور تایا جی کے درمیان آ گئی۔

محبت کے بٹوارے پر اس وقت اس کا دل چاہا تھا کہ وہ چیخ چیخ کر روئے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ضد کرے کہ اس تیسرے وجود کو اس کے اور تایا جی کے درمیان سے نکال کر کہیں دور پھینک دیا جائے لیکن وہ اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گیا۔ اپنے دل پر لگی شدید چوٹ دوسروں سے محض اس لیے چھپا گیا کہ کہیں تماشا نہ بن جائے۔ لیکن پھر بھی وہ تماشا بن گیا۔ شاید اس لیے کہ وہ چیخ چیخ کر رویا نہیں تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی آواز سخت اور لہجہ کھردرا ہو گیا اور اگر اس وقت وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ ضد کر لیتا تو آج چلتے ہوئے اس کے قدم اتنی زور سے زمین پر نہ پڑتے۔ پھر تایا جی اس سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ لیکن وہ اتنا متنفر ہو چکا تھا کہ پھر کبھی ان کے قریب نہیں گیا اور ان کی ہر بات کا الٹ کرنا، جیسے اس نے اپنا مقصد بنا لیا تھا۔

اس سے کسی اور کا اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا خود اس کا تعلیمی میدان میں۔ وہ گھر کا سب سے بڑا ہونے کے باوجود سب سے پیچھے رہ گیا۔ انٹر تک بمشکل پہنچا اور اس کے بعد پڑھائی چھوڑ دی۔ دادا ابو، تایا جی اور گھر کے ہر فرد نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ کم از کم اپنی زندگی تو برباد نہ کرو۔ لیکن اس پر کسی کے سمجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا بلکہ وہ گھر سے ہی دور رہنے لگا۔ سارا سارا دن پتا نہیں کہاں کہاں کی خاک چھانتا شام ڈھلے

لوٹتا تو کسی سے بات کیے بغیر اپنے کمرے میں بند ہو جاتا اور کبھی تو بہت دن اپنے کمرے نکلتا ہی نہیں تھا۔

میں یہ سارے حالات نہیں جانتی تھی کبھی امی ابو نے بتایا ہی نہیں تھا۔ جبھی میں اس کے اکھڑے اکھڑے اور لفٹ نہ کرانے والے رویئے سے مرعوب ہو گئی تھی اور یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ وہ کوئی بہت اونچی شے ہے۔ پھر جب عالیہ اور سدرہ کی زبانی مجھے اس کی حقیقت معلوم ہوئی تو میں بہت ہنسی حالانکہ یہ ہنسنے والی باتیں نہیں تھیں اور اس وقت تو مجھے ہنسی اپنے آپ پر آئی تھی کہ میں اسے کیا سمجھی تھی اور وہ کیا نکلا؟

بہر حال جب میں نے سنجیدگی سے اس کے حالات کو سوچا تو فطری طور پر مجھے دکھ ہوا تھا اور میں دل ہی دل میں اس کے لیے کڑھی بھی تھی لیکن پھر مجھے اس پر غصہ آنے لگا کہ اس پوری دنیا میں ایک وہی تو نہیں ہے جس کے ساتھ ایسا ہوا اور بہت سے لوگ ہیں جن کا دنیا میں کوئی بھی نہیں ہوتا پھر بھی وہ خوش رہتے ہیں۔ جب کہ آغا کی تو صرف امی اس سے دور ہوئی تھیں باقی سب لوگ تو موجود تھے اور اس سے محبت بھی کرتے تھے۔ اس کے باوجود وہ خفا تھا۔

میرے نزدیک اس کی یہ خفگی بے معنی تھی۔ شروع میں میں نے اسے یہ سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ وہ مرد ہے اور اسے حالات کو مردوں کی طرح فیس کرنا چاہیے۔

لیکن اس نے مجھے اس بری طرح ڈانٹا کہ اس وقت میرا دل چاہا میں اپنے ناخنوں سے اس کا چہرہ نوچ کر لہولہان کر دوں جس پر جمی بڑی بڑی آنکھیں میری طرف نفرت کے شعلے پھینک رہی تھیں اور اس کی زبان سے نکلا ہر لفظ مجھ پر واضح کر رہا تھا کہ وہ دنیا کی ساری عورتوں کو اپنی ماں جیسا سمجھتا ہے۔ جو اپنی آزادی کی راہ میں اولاد کو بھی پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیتیں۔ میں اس کا منہ نہیں دبوچ سکی تھی اس لیے اس پر ہنسنے لگی۔

اس کے بعد میری یہ عادت بن گئی کہ جب اس پر نظر پڑتی میں ہنسنے لگتی۔ پتا نہیں اس سے میرے اندر کے کس جذبے کو تسکین ملتی تھی کہ میں اپنی ہنسی سے اس کے اندر آگ لگا کر خوش ہوتی۔

کئی بار عالیہ اور سدرہ نے مجھے ٹوکا۔ مجھے احساس دلانے کی کوشش کی کہ میں

اس شخص کے ساتھ جو پہلے ہی ٹوٹا اور بکھرا ہوا سا ہے، اس کے ساتھ بہت غلط کر رہی ہوں لیکن میں ان کی باتوں کو بھی ہنسی میں اڑا گئی تھی۔

اور ابھی میں عالیہ کی کسی بات پر بے تحاشہ ہنس رہی تھی کہ اچانک آغا کو سامنے دیکھ کر میری ہنسی کو ایک دم بریک لگ گئے۔ پہلے میں حیران ہوئی، سٹپٹائی کہ یہ مجھے کیا ہوا پھر بغور اسے دیکھا اس کی سرخی مائل آنکھوں میں جانے کیا تھا کہ میں نظریں چرا گئی وہ اپنے مخصوص انداز میں فرش پر زور سے پاؤں مارتا ہوا میری طرف آیا پھر بس ایک پل کو وہ میرے قریب رکا اور فوراً آگے بڑھ گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میری پوری ہستی اس کے پیروں کی زوردار ٹھوکروں میں آ گئی ہو۔

''آج تم بچ گئیں آغا کے ہاتھ سے۔'' عالیہ میرے پاس آ کر کہنے لگی۔ ''ورنہ اس کے تیور بڑے خطرناک تھے۔''

''کیا کر لیتا وہ......؟'' میں ایک دم ہوش میں آ گئی۔

''بہت جنونی لگ رہا تھا وہ کچھ بھی کر سکتا تھا میرا مطلب ہے تمہیں قتل'' سدرہ خود سہمی ہوئی لگ رہی تھی مجھے ڈراتے ہوئے مری مری آواز میں بولی تو مجھے ہنسی آ گئی۔

''تم ہنس رہی ہو؟''

''تم نے بات ہی ایسی کی ہے۔ ابھی کوئی ایسا پیدا نہیں ہوا جس کے ہاتھ میری گردن تک پہنچ سکیں۔ سمجھی تم'' میں نے بظاہر اپنے آپ کو مضبوط پوز کیا لیکن سینے کے اندر میرا دل بڑی زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اس سے پہلے کہ دھڑکنوں کا شور ان دونوں کو سنائی دیتا میں ان کے پاس سے ہٹ گئی۔

پھر اگلا پورا ہفتہ آغا اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ اس دوران مجھ پر عجیب سی جھنجھلاہٹ سوار رہی یوں لگا جیسے میں اس کے سامنے ہار گئی ہوں۔ اور مجھے کیونکہ اپنی ہار منظور نہیں تھی اس لیے چاہتی تھی کہ وہ سامنے آئے اور میں اپنی ہنسی کو تمسخرانہ رنگ دے کر وہیں سے شروع کروں جہاں سے ہفتہ بھر پہلے اس کے سامنے روکی تھی۔ بلکہ خود بخود رک گئی تھی۔ لیکن وہ تھا کہ کمرے سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

کوئی ہفتے بھر بعد ناشتے کی ٹیبل پر تایا جی کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ

آج صبح ہی صبح وہ کہیں نکل گیا ہے۔ تایا جی اس کے لئے خاصے فکر مند تھے اور کہہ رہے تھے۔

''جس طرح وہ ہفتہ بھر کمرے میں بند رہا ہے اسی طرح اب پورا ہفتے گھر سے غائب رہے گا۔''

مجھے خاصی مایوسی ہوئی کہ مزید ایک ہفتہ اس کا انتظار کرنا پڑے گا۔ ناشتے کے بعد میں اخبار لے کر برآمدے میں آ بیٹھی اور ابھی شہ سرخیوں پر نظریں دوڑا رہی تھی کہ عالیہ اور سدرہ باتیں کرتی ہوئی میرے پاس آ بیٹھیں۔ عالیہ کہہ رہی تھی۔

''تایا جی کو معلوم کرنا چاہئے کہ آخر آغا اتنے دن رہتا کہاں ہے؟''

''پہلے یہ تو معلوم کرو کہ اتنے دن وہ کمرے میں بند رہ کر کیا کرتا ہے؟'' میں نے یونہی ایک بات کہی لیکن اچانک میرے اندر تجسس نے سر ابھارا اور میں ان دونوں کی طرف جھک کر اشتیاق سے بولی۔

''کیوں نہ ہم معلوم کریں۔''

''کیسے......؟''

''اس کے کمرے میں جا کر دیکھتے ہیں۔''

''وہ کمرہ لاک کر کے جاتا ہے۔'' سدرہ نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے اطلاع دی۔

''لاک توڑا بھی جا سکتا ہے یا پھر دوسری چابیوں کو آزما لیتے ہیں۔'' میں نے تجویز پیش کی لیکن وہ دونوں نفی میں سر ہلانے لگیں۔

''نہیں بھئی، اسے پتا چلا تو جان سے مار دے گا۔''

''کوئی نہیں، تم لوگوں نے تو خواہ مخواہ اسے ہوا بنا لیا ہے۔ ٹھہرو میں چابیاں لے کر آتی ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی میں اٹھ کر اندر چلی گئی پھر جب گھر بھر سے چابیاں جمع کر کے میں واپس آئی تو ان دونوں نے میرا ساتھ دینے سے انکار کر دیا وہ آغا سے خوفزدہ تھیں اور انہوں نے مجھے بھی ڈرانے کی بہت کوشش کی لیکن میں اس وقت اتنی متجسس تھی کہ ان کے ڈرانے کا کوئی اثر نہیں لیا اور اکیلی ہی اس کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

راہداری کے آخری سرے پر اس کا کمرہ تھا۔

میں نے ایک کے بعد ایک چابی ا کے لاک پر آزمائی شروع کی اور اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب چوتھی چابی اس کے لاک میں فٹ ہو گئی اور ذرا سی کوشش سے لاک کھل گیا۔ پہلے میں نے سوچا عالیہ اور سدرہ کو بھی بلا لوں لیکن پھر ان کی سہمی ہوئی شکلیں یاد کر کے میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور بہت آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی اور اپنے پیچھے دروازہ اسی طرح بند کر دیا۔

پہلی نظر میں مجھے کمرے پر اسٹور کا گمان ہوا جو گھر بھر کا فالتو سامان اپنے اندر چھپائے مدتوں سے بند پڑا ہو۔ عجیب نامانوس اور ناگوار سی مہک تھی جس نے میرے قدم دروازے کے پاس ہی روک لئے تھے۔ میں نے شاید ایک ہی نظر میں سب کچھ دیکھ اور جان لینا چاہا تھا اس لیے نہ کچھ دیکھ سکی اور نہ جان سکی۔ مایوس ہو کر پلٹنے لگی کہ نظریں دیوار سے ٹکرائیں اور وہیں جمی رہ گئیں۔

بے حد خوبصورت پینٹنگ تھی رنگوں کے حسین امتزاج نے میری ساری توجہ یوں اپنی جانب کھینچی کہ میرے قدم آپ ہی آپ اس کی طرف اٹھنے لگے دیوار کے پاس آئی تو نیچے فرش پر اور بہت سے فن پارے رکھے نظر آئے۔ میں بے اختیار وہیں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی اور ایک ایک تصویر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ ان ساری تصویروں میں جو قدر مشترک تھی وہ چہروں پر اداسی اور پس منظر میں صحرا۔ مجھے یاد آیا اس نے کہا تھا۔

''میرا بس چلے تو ساری دنیا میں ہنسنے پر پابندی لگا دوں۔''

''گویا اسے صرف میری نہیں کسی کی بھی ہنسی اچھی نہیں لگتی'' میں نے سوچا اور قدرے فاصلے پر رکھی پینٹنگ کو اپنی طرف کھینچنے کے لیے آگے جھک اس پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ میرے ہاتھ پر بھاری جوتے والا پیر آ ٹھہرا۔

''آغا'' میں نے ایک دم سر اٹھا کر دیکھا وہ میرے سر پر کھڑا تھا۔ انتہائی غصیلی نظریں مجھ پر جمائے انداز سے یوں لگ رہا تھا جیسے سچ مچ مجھے قتل کر دے گا۔

''تمہیں یہاں آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' لہجہ تو اس کا شروع ہی سے کھردرا تھا اور اب تو اور بھی کرخت ہو گیا تھا۔

''میرا ہاتھ چھوڑو'' اس کی بات نظر انداز کر کے میں نے اپنے ہاتھ کی طرف

اشارہ کیا جو اس کے بھاری جوتے تلے دب کر سن ہو گیا تھا۔

"پہلے میری بات کا جواب دو" اس نے میرے ہاتھ پر مزید دباؤ ڈالا تو تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تب وہ اپنا پیر ہٹا کر پنجوں پر میرے سامنے بیٹھا اور بغور میری آنسوؤں بھری آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"ان آنسوؤں کو چھلکنے مت دینا۔ یہ پلکوں کے حصار میں ٹھہرے رہیں تو آنکھوں کو بے حد حسین بنا دیتے ہیں۔" ہمیشہ سے مختلف اس کا لہجہ مجھے چونکا گیا اور میں بے خیالی میں پلکیں جھپک گئی۔ جس سے آنکھوں میں ٹھہرا پانی رخساروں پر ڈھلک آیا۔ اور اس کا موڈ بدل گیا۔

"یہاں کیوں آئی ہو......؟" وہ پھر اکھڑے لہجے میں بولا اور میں پھر نظر انداز کر گئی۔ تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"آغا یہ سب تم نے بنائی ہیں؟"

"تمہیں اعتراض ہے کیا؟"

"نہیں بلکہ مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے تم نے اب تک بتایا کیوں نہیں کہ تم؟"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو بتانے کی۔" وہ میری بات کاٹ کر بولا۔

"سنو تم نے کبھی اپنی پینٹنگز کی نمائش بھی کی ہے" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں اس سے کیا اور اب فوراً نکل جاؤ میرے کمرے سے۔" وہ فرش پر بکھری پینٹنگز سمیٹنے میں لگ گیا۔

"اور اگر میں نہ جاؤں تو۔" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا میرے ہونٹوں میں دبی مسکراہٹ نے اس کی پیشانی شکن آلود کر دی۔ دانت پیس کر بولا۔

"تو میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔"

"میں خود ہی چلی جاتی ہوں" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر دروازے کے پاس جا کر پلٹ کر بولی۔

"سنو ان تصویروں کی طرح اپنے آپ پر جتنے مرضی رنگ پھیر لو۔ میں تمہاری

شخصیت کا اصل رنگ دیکھ چکی ہوں۔"

"رمشہ" وہ متعجب ہوا اور میں اسے اسی حالت میں چھوڑ کر باہر نکل آئی۔

برآمدے میں آئی تو عالیہ اور سدرہ راہداری کی طرف نظریں جمائے اسی جگہ بیٹھی تھیں۔

"تم زندہ سلامت واپس آ گئی ہو۔" میں ان کے پاس بیٹھی تو عالیہ باقاعدہ مجھے چھو کر پوچھنے لگی۔

"کیوں کیا ہوا؟" میں نے لاپرواہی کا مظاہرہ کیا۔

"تمہارے پیچھے آغا آ گیا تھا۔"

"ہاں" میں ہنسی۔

"کچھ کہا نہیں اس نے تمہیں۔"

"کہا تھا، میرا مطلب ہے خفا ہوا لیکن جب میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تو نرم ہو گیا۔"

"کیا آغا نرم پڑ گیا۔" سدرہ کے منہ سے باقاعدہ چیخ نکل گئی۔

"ہاں اور تم لوگوں نے خواہ مخواہ اسے ہوا بنا رکھا ہے۔ ورنہ وہ تو خیر چھوڑو یہ سنو کہ میں اس کے کمرے میں کیا دیکھ کر آئی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی میں نے آغا کی شخصیت کے اس پہلو کے بارے میں بتانا شروع کیا تو وہ دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگیں۔

"سچ کہہ رہی ہو......" میری بات سن کر عالیہ غیر یقینی سے پوچھنے لگی۔

"بالکل، اگر یقین نہیں آیا تو خود جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔ ایمان سے اتنی خوبصورت پینٹنگز ہیں کہ میں کیا بتاؤں اور مجھے تو لگتا ہے وہ اچھا خاصا مشہور بندہ ہے۔"

"کیسے۔"

"یہ اتنے اتنے دن جو گھر سے غائب رہتا ہے تو یقیناً اپنی تصویروں کی نمائش کے سلسلے میں کہیں جاتا ہوگا۔"

"کمال ہے ایک نامور مصور ہمارے گھر میں رہتا ہے اور ہمیں خبر ہی نہیں۔" سدرہ اپنی بے خبری پر ماتم کرتی ہوئی بولی تو مجھے بے تحاشہ ہنسی آ گئی۔

"اب تو خبر ہو گئی ہے ناں، پہلی فرصت میں اپنی دوستوں کو مطلع کرو۔" عالیہ نے چھیڑنے کے انداز میں کہا تو جس طرح سدرہ نے اسے گھورا اس پر میں بہت زور سے ہنسنا چاہتی تھی لیکن اچانک کسی خیال سے میرے ہونٹ بھنچ گئے۔

پھر میں جسے آغا کے سامنے ہارنا منظور نہیں تھا بخوشی ہار گئی۔ اور ابھی اس کی اصل شخصیت تک رسائی حاصل کرنے کی سوچ ہی رہی تھی کہ اس نے تایا جی کے سامنے مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ میرے لیے حیران کرن لمحے تھے۔ گویا دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی۔ بہر حال پہلے تایا جی نے پس و پیش سے کام لیا کیونکہ ان کے خیال میں وہ کسی طرح بھی میرے قابل نہیں تھا اور انہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ میرے ابو انکار کر دیں گے اور واقعی ابو نے انکار کر دیا تھا۔ لیکن کیونکہ گھر کا معاملہ تھا اس لیے ابو زیادہ دیر اپنے انکار پر قائم نہیں رہ سکے۔ پھر دادا ابو نے بھی سمجھایا تھا۔ یوں ابو کے ہامی بھرتے ہی گھر میں شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا اور ٹھیک پندرہ دن بعد وہ مجھے اپنے بازو کا سہارا دے کر اس کمرے میں لے آیا جہاں ایک دن میں چوری چھپے داخل ہوئی تھی۔

"سنو" میرے چہرے سے زرتار آنچل ہٹا کر وہ کہنے لگا "تمہیں یاد ہو گا ایک دن میں نے کہا تھا کہ اگر میرا بس چلے تو میں پوری دنیا میں ہنسنے پر پابندی لگا دوں۔" میں نے ذرا سی پلکیں اٹھا کر دیکھا تو کہنے لگا۔

"پوری دنیا پر میرا بس نہیں چل سکتا، لیکن تم پر تو چل سکتا ہے اور تم اچھی طرح میری بات سمجھ لو کہ مجھے ہنستے کھلکھلاتے چہرے زہر لگتے ہیں۔ اور خاص طور سے تم مجھے اپنی ہنسی کا زہر دینے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔"

"آغا" میں فقط اسی قدر کہہ سکی۔ اول شب کے اولین لمحوں میں اس کے لہجے، اس کے انداز اور اس کی ایسی باتوں نے میرے جذبوں کی کھلتی کلیوں کو جس بے دردی سے مسل ڈالا تھا اس سے میرے حلق میں گولا سا اٹک گیا اور آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

"مجھے یہ پیمانے اسی طرح لبریز اچھے لگتے ہیں۔" وہ میری آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "کیا تم میری خاطر انہیں اسی طرح لبریز رکھ سکو گی؟"

"ہاں" میں نے اپنی پلکیں ساکت کر لیں، مبادا ذرا سی جنبش سے پیمانے چھلک

نہ جائیں۔

"سچ وہ بچوں کی طرح خوش ہوا۔"

"آزما دیکھو"

"اچھا اگر تم اس آزمائش میں پوری اتریں تو" وہ پرسوچ انداز میں بس کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر اٹھ کے سامنے جا کھڑا ہوا پہلے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ پھر جب اسے شیٹ پر لکیریں کھینچتے دیکھا تو میں سمجھ گئی کہ وہ میری تصویر بنا رہا ہے۔ اس کے بعد میں نے کوئی سوال نہیں کیا چپ چاپ ایک ہی نقطے پر نظریں مرکوز کئے بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ ویسے بھی آنکھوں میں بھرے پانی نے میرے سامنے دھند کی چادر سی تان دی تھی جس کے پار مجھے کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔

وقت جیسے ٹھہر سا گیا تھا ایک ایک پل صدیوں پر محیط ہو کر میرے وجود کو سن کر گیا۔ یہ ستمگر اگر ان چند دنوں میں مجھے اتنا عزیز نہ ہو گیا ہوتا تو میں کبھی بھی اس کی خواہش پوری نہ کرتی۔ بلکہ پہلے ہی مرحلے میں اپنی ہنسی کا زہر اس کی رگوں میں اتار کر خود آرام سے سو جاتی لیکن وہ مجھے اپنی زندگی سے بڑھ کر عزیز ہو گیا تھا جبھی تو اس رات کا ہر پل میں نے اسے دان کر دیا تھا۔

اور اس رات کی سحر جب ہوئی تو وہ جسے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا تھا بے حد خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔

"دیکھو رمشہ میں نے ایک شاہکار تخلیق کیا ہے۔ ان لبریز پیمانوں کو امر کر دیا ہے۔ میں نے۔ دیکھو...... دیکھو......" اور وہ کیسے دیکھتی کہ اس کی آنکھوں کے پیمانے تو چھلکنے کی حسرت لیے رات کے جانے کس پہر وہیں ساکت ہو گئے تھے اور وہ اتنا بے خبر تھا یا اپنا شاہکار تخلیق کرنے میں اتنا مگن کہ جان ہی نہ سکا۔ کبھی نہ جان سکا وہ دیوانہ برسہا برس بیت گئے آج بھی وہ اپنے شاہکار کے سامنے کھڑے ہو کر منت بھرے لہجے میں کہتا ہے۔

"رمشہ چھلکا دو۔ ان پیمانوں کو تاکہ تمہاری آنکھیں شفاف ہو جائیں اور پھر میں اپنی چاہتوں کے جگنوؤں سے انہیں جگمگا دوں۔"

سمے کی رہگزر پر

"آپی! اکیلی کیسے رہیں گی۔ میرے ساتھ چلیں۔"

میرے کندھے سے لگی روتی ہوئی گڑیا نے سرگوشی میں پھر وہی بات کہی جو وہ گزشتہ کئی دنوں سے کہہ رہی تھی اور میں اپنے آنسو پینے میں لگی ہوئی تھی، اس لیے اسے تسلی کے دو لفظ نہیں کہہ سکی۔ بس دھیرے دھیرے اس کا سر تھپکتی رہی۔ پیچھے سے نوشی نے مجھے ٹہوکا مارا، تب میں نے گڑیا کو خود سے الگ کر کے اس کا ہاتھ سرمد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

لڑکیاں رخصتی کا گیت گاتی ہوئی ان دونوں کے پیچھے چلنے لگی تھیں۔ نوشی نے مجھے بھی آگے بڑھنے کو کہا لیکن مجھ میں اب چلنے کی سکت نہیں تھی۔ وہیں ستون کا سہارا لے کر میں دھندلائی آنکھوں سے گڑیا کو جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ سامنے دروازے کے دونوں پٹ پورے کھلے تھے۔ ایک کے بعد ایک ساری گاڑیاں میری نظروں کے سامنے سے گزر گئیں۔ اس کے بعد مہمانوں کے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو ایک ایک نے میرے پاس رک کر گڑیا کی شادی کی مبارک باد دینے کے ساتھ میرے حوصلے اور قربانی کو سراہا تھا۔

کچھ دیر میں سارا گھر خالی ہو گیا تو ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ میں نے جلدی سے جا کر دروازہ بند کیا پھر پھیلاوا سمیٹنے کا سوچ رہی تھی کہ نوشی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی آ گئی۔

"میں نے سوچا، پہلے کپڑے بدل لوں پھر تمہاری کچھ مدد کر سکوں گی۔ بتاؤ کیا کرنا ہے۔ برتن دھو دوں؟"

"نہیں۔ برتن وغیرہ صبح ماسی دھو دے گی، بس یہ دریاں اٹھوا دو۔ باقی کام صبح ہو جائیں گے۔ اس وقت تو کمر اکڑ گئی ہے۔"

میں نے کہا، پھر اس کے ساتھ مل کر دریاں لپیٹ کر ایک طرف رکھنے لگی۔ اس کام سے فارغ ہو کر نوشی نے مزید کسی کام کا پوچھا تو میں نے منع کرنے کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا۔

"چلو اب سو جاؤ۔ بہت تھک گئی ہو تم۔ اور ہاں اکیلے میں اگر ڈر لگے تو اوپر آ جانا۔" نوشی نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا تو مجھے ہنسی آ گئی۔

"اچھی بات ہے۔ چائے پیو گی؟"

"نہیں بھئی۔ اور تم بھی مت پینا ورنہ جاگتی رہو گی۔ جاؤ سوؤ، مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔ شکر ہے صبح چھٹی ہے ورنہ مشکل ہو جاتی۔ اچھا شب بخیر۔"

وہ مجھے کمرے کی طرف دھکیل کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔ تو میں نے رک کر برآمدے کی لائٹ آف کی پھر کمرے میں آ گئی تھی۔

گزشتہ کئی دنوں سے میں گھن چکر بنی ہوئی تھی اور اب جب سونے کے لیے لیٹی تو جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اس پر ایک دم اکیلے ہو جانے کے خیال نے میری نیند اڑا دی تھی۔ حالانکہ میرے اندر کوئی ڈر، کوئی خوف نہیں تھا۔ اس کے برعکس گڑیا کی شادی کر کے میں اطمینان سے تھی اور بہت خوش کہ یہ آخری ذمہ داری بھی احسن طریقے سے ادا ہو گئی تھی پھر بھی اکیلے پن کا احساس تو ہونا ہی تھا۔

کل تک گڑیا اسی کمرے میں میرے پلنگ سے پلنگ ملا کر سوتی تھی۔ اور آج صبح مہمانوں کے لیے جگہ بنانے کی خاطر نوشی نے اس کا پلنگ ہی کمرے سے نکال دیا تھا۔ جس سے کمرہ کھلا کھلا لگ رہا تھا۔ لیکن میں شاید اس کی عادی نہیں تھی اس لیے مجھے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ دل چاہا، اسی وقت گڑیا کا پلنگ گھسیٹ کر لے آؤں اور میں اٹھ کر بیٹھ بھی گئی پھر خیال آیا کہ یہ کام میں اکیلی نہیں کر سکتی۔ کچھ مایوس سی ہو کر میں نے دوبارہ تکیے پر سر رکھا تھا کہ ساعتوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

"... جب تم اکیلی ہو جاؤ تو مجھے بلا لینا۔"

"کون؟" میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نہیں تھا لیکن آواز ابھی بھی آ رہی تھی۔

"اف نہیں۔ اتنے برس بیت گئے۔ وہ میرے بلانے کا منتظر تو نہیں ہوگا۔" میں نے کروٹ بدل کر آنکھیں زور سے بند کر لیں۔

"میں کوئی وعدہ نہیں کرتا اور نہ یہ یقین سے کہہ رہا ہوں کہ تمہارے بلانے پر ضرور آؤں گا۔ لیکن آ بھی سکتا ہوں۔"

ایک مبہم سی آس کے سہارے چھوڑ کر وہ مجھ سے رخصت ہوا تھا۔ جب ہی تو اس تمام عرصے میں میں نے کبھی ماہ و سال شمار نہیں کیے، لیکن میں اسے بھولی بھی نہیں تھی۔ گو کہ وہ ہر پل میرے ساتھ نہیں ہوتا تھا، لیکن اکثر یاد آتا تھا۔ شاید اس لیے کہ ہر پل میں ہر روز ان ہی راستوں سے گزرتی تھی۔ جن پر کبھی وہ میرے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ اور آفس بھی وہی تھا۔ پھر کیسے نہ وہ یاد آتا۔ البتہ اسے بلانے کا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ کیونکہ اس نے آنے کا یقین نہیں دلایا تھا نہ کوئی وعدہ کیا تھا اور اگر کرتا بھی تو اتنے برس بعد کہاں اسے یاد رہتا۔

میری طرح وہ بھی خاصا حقیقت پسند تھا۔ شاید زندگیوں کی تلخیوں نے ہمیں کچھ زیادہ ہی حقیقت پسند بنا دیا تھا۔ ہماری آنکھیں خواب افورڈ نہیں کر سکتی تھیں۔ اور اب تو میں خواب سجانے کی عمر سے آگے نکل آئی تھی۔ جب ہی میں نے آنکھیں زور سے بند کر لی تھیں اور آوازوں کا رستہ روکنے کے لیے کانوں پر بھی ہاتھ رکھ لیے۔ لیکن ذہن کا کیا کرتی جس میں دریچے کھلتے جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

"مجھے لگتا ہے، میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں"

پورے ایک سال بعد اس کے اعتراف پر میں بجائے خوش ہونے کے آزردگی میں گھر کر بولی تھی۔

"اس سے آگے اور کچھ مت کہنا۔ کہیں میں خود غرض نہ ہو جاؤں۔"

"کیا مطلب؟" وہ حیران ہوا تھا۔

"میں اپنے بارے میں سوچنے لگی تو ان کا کیا ہوگا، جن کی میں پہلے ماں اور پھر باپ بن گئی۔ نہیں عاطف! مجھے میرے مقصد سے نہیں ہٹانا بہت گناہ گار ہوں گی میں۔"

"کس کی بات کر رہی ہو؟" اس نے کچھ ٹھٹک کر پوچھا تھا۔

"اپنے چھوٹے بہن بھائی کی۔ پتا ہے جب اماں کا انتقال ہوا، اس وقت میں بارہ سال کی تھی اور اتنی سی عمر میں میں مونا، فواد اور گڑیا کی ماں بن گئی پھر ابا کا بھی اسی طرح خیال رکھتی جیسے ماں رکھتی تھیں۔ گھر کے کام کاج اور اسکول بھی جانا۔ یوں لگتا تھا جیسے اماں کی روح بھی میرے اندر سما گئی ہے۔ جب ہی تو کوئی کام رکا نہیں۔ سب چلتے رہے وقت کے ساتھ۔"

میں پہلی بار اس کے سامنے اپنی زندگی کے اوراق الٹ رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے مونا میرے برابر آ گئی۔ فواد اور گڑیا بھی مڈل کلاس میں آگے نکل آئے۔ تو میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اور ابا بھی شاید اسی انتظار میں تھے۔ انہوں نے فوراً ایک جگہ میری نسبت طے کر دی۔ کیونکہ آگے دو بیٹیاں اور بھی تھیں۔ اس لیے وہ جلد سے جلد میرے اور پھر مونا کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے لیکن خدا کو شاید یہ منظور نہیں تھا۔ جب ہی وہ میری ذمہ داری سے تو کیا نکلتے الٹا سب کی ذمہ داریاں مجھ پر ڈال گئے۔

پتا نہیں انہیں کیا ہوا تھا، ایک رات مجھے سوتے سے اٹھا کر کہنے لگے۔

"جس طرح تو نے چھوٹوں کو ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی اسی طرح میری کمی بھی محسوس نہیں ہونے دینا۔"

مجھے لگا تھا جیسے میں نے خواب میں دیکھا سنا ہے لیکن جب صبح اٹھی تو ابا تھے ہی نہیں۔ میرے چیخ چیخ کر پکارنے پر بھی انہوں نے آنکھیں نہیں کھولیں شاید میں حواس کھو بیٹھتی لیکن ابا جو ذمہ داریاں مجھ پر ڈال گئے تھے انہوں نے صرف مجھے اپنے سے بیگانہ کیا اور سب تو اسی طرح چلنے لگا تھا جیسے اماں کے بعد۔

"اور وہ جو تمہاری نسبت طے ہوئی تھی؟" یہ بات پوچھتے ہوئے وہ کچھ متوحش

ساتھا۔

''وہاں میں نے مونا کی شادی کر دی۔'' میں نے بتایا تو وہ گہری سانس کھینچ کر بولا تھا۔

''اچھا کیا، بہت اچھا کیا۔''

''ہاں اور اب فواد اور گڑیا ہیں۔ دعا کرو، میں ان کے ساتھ بھی اچھا کر سکوں۔''

''فکر نہیں کرو، سب اچھا ہو گا۔ یہ بتاؤ۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' اس نے بڑے خلوص سے پوچھا تھا۔

''تمہیں کچھ نہیں کرنا۔ انتظار کرنے کو بھی نہیں کہوں گی، کیونکہ فواد ابھی میٹرک میں ہے۔ اور جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو جاتا اور میں گڑیا کی شادی نہیں کر لیتی، تب تک میں اپنے بارے میں نہیں سوچوں گی۔''

میں نے صاف گوئی سے کہا تو وہ پرسوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا تھا۔

''اس میں تو بہت سال لگیں گے، فواد کو گریجویشن کرنے میں ہی چار سال اس کے بعد......''

''اسی لیے میں نے تمہیں انتظار کرنے کو نہیں کہا۔'' میں نے اسے حساب لگاتے دیکھ کر ٹوکا تھا۔

''اس کے باوجود میں اپنے الفاظ واپس نہیں لوں گا۔ یعنی میں تمہیں پسند کرتا ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ، محبت کرتا ہوں۔ اور اس محبت کے ناتے اگر میں یہ کہوں کہ فواد اور گڑیا کے لیے ہم دونوں مل کر بھی......''

''نہیں۔'' میرے فوراً منع کرنے پر وہ کچھ دیر خاموشی سے دیکھنے کے بعد بولا تھا۔

''تمہیں شاید میری محبت پر بھروسا نہیں ہے۔''

''یہ بات نہیں کرو۔ حالانکہ تم آج اعتراف کر رہے ہو جبکہ میں بہت پہلے جان گئی تھی اور بھروسا نہ ہوتا تو میں تمہارے ساتھ یہاں آتی؟''

''پھر کیوں منع کر رہی ہو؟''

''اس لیے کہ میں محبت کو کسی آزمائش میں ڈالنا نہیں چاہتی۔ یہ دو چار دن یا سال چھ مہینے کی بات نہیں ہے۔ ابھی تو خود کہہ رہے تھے بہت سال لگیں گے۔ اور شادی کے بعد اتنے سال تمہیں بہت کٹھن لگیں گے۔''

میری حد درجہ حقیقت پسندی پر اس وقت وہ خاموش ہو رہا لیکن بعد میں شاید اسے بھی احساس ہو گیا تھا۔ جب ہی اس نے پھر کبھی اس موضوع کو نہیں چھیڑا۔ البتہ وقتاً فوقتاً مجھ سے فواد اور گڑیا کے بارے میں پوچھتا ضرور تھا اور یہ کہ میرے ساتھ کوئی اور مسئلہ تو نہیں ہے۔ پھر گھما پھرا کر یہ بھی ضرور کہتا کہ کسی بھی ضرورت کے لیے میں بلا جھجک اس سے کہہ سکتی ہوں اور مجھے بھی یقین تھا کہ خدانخواستہ کبھی کوئی ایسی ضرورت ہوئی تو میں صرف اسی سے رجوع کروں گی۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ اس نے ایک دم سے نہ صرف باہر جانے کا سوچ لیا بلکہ اس کے لیے کوششیں بھی شروع کر دی تھیں اور مجھے اس نے اس وقت بتایا جب وہ ایک کمپنی کے ساتھ ایگریمنٹ کر کے ویزا حاصل کر چکا تھا۔

''میں دو سال کے ایگریمنٹ پر کویت جا رہا ہوں اور ہو سکتا ہے یہ مدت پوری ہونے کے بعد وہاں سے امریکہ نکل جاؤں۔''

میں اچانک گم صم سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ میں نے کوئی خواب نہیں سجائے تھے نہ خود کو فریب دیا تھا پھر جانے کیوں میرے اندر توڑ پھوٹ شروع ہو گئی تھی۔

''کیوں؟ کیوں جا رہے ہو؟'' کتنی دیر بعد میں نے پوچھا تھا۔

''تمہاری محبت سے آزاد ہونے کے لیے جو کہ یہاں رہ کر ممکن نہیں ہے۔ تم اپنی ذمہ داریاں نبھاؤ۔ میں اپنی زندگی جیوں گا۔''

اس نے کہا تو میں بمشکل ٹوٹے لہجے میں بولی تھی۔ ''ہاں، تمہیں اس کا حق ہے۔''

''بہت کٹھور ہو تم۔ پھر بھی میں کہوں گا کہ جب تم اکیلی ہو جاؤ تو مجھے بلا لینا لیکن میں اپنے آنے کا یقین نہیں دوں گا، نہ کوئی وعدہ کرتا ہوں۔''

''پھر بلانے کو کیوں کہہ رہے ہو؟'' میرا شاکی ہونا فطری تھا۔

''آ بھی سکتا ہوں۔'' وہ مسکرایا تھا۔ ''اگر تمہاری محبت سے آزاد ہونے میں

ناکام ہو گیا تب۔''

''مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم کامیاب ہوئے کہ ناکام؟'' میں نے یونہی پوچھا تو

''میرے آنے یا نہ آنے سے۔'' وہ بڑے آرام سے بولا تھا۔ ''میرا آنا
بات کا ثبوت ہو گا کہ میں تمہیں بھلانے میں ناکام ہو گیا ہوں اور نہ آنے کی صورت میں
سمجھ لینا کہ......''

''نہیں۔'' میں نے فوراً ٹوک کر کہا تھا۔ ''اس طرح تو میں ساری زندگی انتظار
کرتی رہوں گی کہ شاید اب تم آ جاؤ۔ اب تم آ جاؤ۔''

''چلو نہ آنے کی صورت میں میں تمہیں اطلاع دے دوں گا، لیکن تم مجھے لکھنا
ضرور کہ اپنی ذمہ داریوں سے نکل کر اب تم اپنے بارے میں سوچنے لگی ہو۔''

''اس وقت تم پتا نہیں کہاں ہو گے؟'' یوں لگ رہا تھا جیسے ہم اپنے آپ کو
ایک دوسرے کو بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''تم میرے اسی پتے پر خط لکھنا، میں جہاں بھی ہوا، تمہارا خط مل جائے گا۔''

''اچھی بات ہے۔ اگر اس دوران میری زندگی میں کوئی اور نہ آیا تو میں تمہیں
خط ضرور لکھوں گی۔'' میں نے اس کی بات [illegible]ائی تھی۔

اور پھر وہ چلا گیا تو مہینوں میرا کسی بات کسی کام میں دل نہیں لگا، میں راہ
چلتے ہوئے رک رک جاتی اور آفس میں گھنٹوں اسی کی ٹیبل کو دیکھا کرتی تھی۔ کسی
وقت دل چاہتا پھوٹ پھوٹ کر روؤں کہ میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ کیا مجھے اپنی زندگی
جینے کا کوئی حق نہیں میں کیوں اتنی پابند ہوں؟

پھر ان ہی دنوں جب مجھے زندگی میں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔ مونا کے
بیٹے کی ولادت نے کچھ ہلچل مچا دی تھی۔ میں آفس سے لوٹتی تو کتنی دیر اس کے بچے
ساتھ کھیلتی رہتی۔ پھر مجھے کسی بات کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ کوئی پندرہ دن مونا ہمارے
رہی۔ اس کے بعد بھی روزانہ شام میں فواد اس کے بچے کو لے کر آ جاتا۔ کیونکہ مونا کا
قریب ہی تھا۔

یوں دھیرے دھیرے میرا دھیان بٹ گیا تھا اور پھر میں تھی بھی حقیقت پسند

لیے چند مہینوں کے بعد ہی میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ میری آئندہ زندگی میں
عاطف کا کوئی تصور نہیں ہے۔ نہ مجھے اس کا انتظار کرنا ہے اور نہ وہ آئے گا اور اس حقیقت
کو تسلیم کرنے کے بعد میں پھر پہلے کی طرح صرف فواد اور گڑیا کے لیے سوچنے لگی تھی اور
میری ساری جدوجہد بھی ان ہی دونوں کے لیے تھی۔

☆......☆......☆

فواد نے بی ایس سی کر لیا تو میرا خیال تھا وہ جاب کر کے میرا ہاتھ بٹائے گا
کیونکہ گڑیا کی شادی کرنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں تھا۔ ابا نے میری شادی کے لیے
جو کچھ جمع کیا تھا وہ تو مونا کی شادی پر خرچ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد صرف میری تنخواہ تھی یا
پھر اوپر کا ایک کمرہ جو ابا کی زندگی میں ہی کرائے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے چار سو مل جاتے
تھے۔ لیکن بڑھتی ہوئی مہنگائی میں اتنی آمدنی میں کہاں پورا ہوتا ہے۔

میں ہر مہینے گڑیا کے لیے کچھ نہ کچھ خریدنے کا بس سوچ کر رہ جاتی اور یہ
حالات فواد کے سامنے تھے۔ اس کے باوجود اس نے مزید آگے پڑھنے کی خواہش کا اظہار
کر دیا۔ اس کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ صرف گریجویٹ کو کون پوچھتا ہے۔ بہر حال اس کی
خواہش کے پیش نظر میں نے اسے پڑھنے سے نہیں روکا۔ البتہ یہ ضرور کہہ دیا تھا کہ اب وہ
اپنے تعلیمی اخراجات خود اٹھائے۔ اس کے لیے وہ ٹیوشنز کر سکتا تھا اور اس نے وہی کیا۔
جس میں ہر ماہ گڑیا کے لیے کچھ نہ کچھ پس انداز کرنے لگی تھی اور دو سال میں اتنا ہو گیا کہ
میں اس کے جہیز کا سامان خرید سکتی تھی۔

پھر فواد نے ایم ایس سی کر لیا تھا جب ہی میں نے سوچا اس کی جاب لگتے ہی
ہم گڑیا کی شادی کر دیں گے، لیکن فواد جانے کیا سوچے ہوئے تھا۔ جب میں نے اس سے
جاب کی بات کی تو اس نے کہا تھا۔

''نہیں آپی! میں یہاں جاب نہیں کروں گا۔ میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ یہاں
مجھے ایک تو جاب کے لیے بہت خوار ہونا پڑے گا، دوسرے میری مرضی کی جاب بھی نہیں

ہو گی۔ اور پیسہ بھی کم۔ جبکہ میں بہت کمانا چاہتا ہوں۔ آپ کے لیے گڑیا کے لیے۔"

اور میں نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ وہ یہاں رہ کر بھی گڑیا کے لیے کر سکتا ہے لیکن وہ نہیں مانا اور اس کی ضد سے ہار کر میں ہی مجبور ہو گئی تھی۔ اور گڑیا کے لیے جو کچھ جمع کیا تھا، وہ اسے باہر بھیجنے پر خرچ کر دیا۔ جس کا مجھے افسوس یوں نہیں تھا کہ اتنا بلکہ اس سے کہیں زیادہ تو وہ مجھے چند مہینوں میں بھیج دے گا، لیکن وائے قسمت کہ میرے ماں جائے نے بھی مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ بس شروع کے تین چار مہینے کچھ پیسے بھیجے تھے۔ اس کے بعد جانے اس کے ساتھ کیا مجبوریاں تھیں۔ جو پیسے کیا لکھنا ہی بھول گیا تھا۔ اور میرے لیے یہ الگ فکر، سارا سارا وقت اسکی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی۔ ساتھ خط پر خط بھیجتی۔

اور مہینوں بعد اس کا ایک خط آیا تھا۔ جس میں اس نے اپنی خیریت کے ساتھ شادی کا بھی لکھا تھا۔ تب گڑیا نے اسے بہت برا بھلا کہا تھا۔ لیکن میرے اطمینان کو یہ بہت تھا کہ وہ خیریت سے تھا۔

میں ایک بار پھر گڑیا کے لیے جدوجہد میں مصروف ہو گئی تھی۔

اور آج گڑیا کو رخصت کر کے میں جہاں اپنی ذمہ داریاں نبھا دینے پر اطمینان سے ہو گئی تھی، وہاں اکیلے ہو جانے کے احساس کے ساتھ ہی ایک بھولی بسری یاد نے دل کا دامن تھام کر مجھے خاصا بے چین کر دیا تھا۔

وہ بھولا بسرا نہیں تھا لیکن اس کی باتیں میں نے بھلا دی تھیں۔ اور اس تمام عرصے میں کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اپنی ذمہ داریوں سے نکلنے کے بعد میں اسے خط لکھوں گی۔ کیونکہ مجھے شروع ہی میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں مجھے بہت سال لگیں گے، اور آٹھ سال لگ گئے تھے۔ یہ عرصہ کم تو نہیں ہوتا۔ محبت کو زندہ رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً ایک دوسرے سے وابستگی کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔ اور یہاں تو اتنے برسوں میں ایک دوسرے سے کوئی رابطہ ہی نہیں رکھا گیا تھا۔ جب ہی اسے خط لکھنے کی سوچ ہی مجھے احمقانہ لگ رہی تھی۔ البتہ اسے سوچنے سے میں باز نہیں رہ سکی تھی۔

اگلا سارا دن میرا گھر کی صفائی ستھرائی میں گزر گیا۔ شام میں نہا دھو کر میں نے

اپنا حلیہ ٹھیک کیا۔ کیونکہ اگلے روز سے پھر وہی روٹین شروع ہونے والی تھی۔ گڑیا کی شادی کے لیے میں نے جو چھٹیاں لی تھیں وہ بھی آج ختم ہو گئی تھیں۔ اس لیے میں نے سارے کام آج ہی نپٹا دیئے اور فارغ ہو کر چائے بنانے جا رہی تھی کہ گڑیا اور سرمد آ گئے۔

"سارا دن یہ لڑکی آپ کے لیے پریشان رہی ہے۔ گھر میں اتنے مہمان تھے ورنہ میں صبح ہی اسے لے آتا۔"

سرمد نے کہا تو میں نے دھیرج سے گڑیا کو ٹوکا۔

"میرے لیے پریشان ہونے کی تمہیں ضرورت نہیں ہے۔ دیکھو، میں کتنے آرام سے ہوں۔"

"مجھے آپ کے اکیلے ہونے کا خیال آ رہا تھا۔"

"میں اکیلی نہیں ہوں چندا! اوپر خالہ اور نوشی ہیں۔ پھر کل سے تو میرا آفس شروع ہو جائے گا۔ اچھا اب تم آرام سے بیٹھو۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

میں گڑیا کا گال تھپک کر کچن میں آ گئی۔

☆......☆......☆

پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ مونا کی ساس میرے لیے اپنے رنڈوے بھتیجے کا رشتہ لے کر آ گئیں۔ جیسے میرے گڑیا سے فارغ ہونے کے انتظار ہی میں بیٹھی تھیں۔ بہر حال مجھے اس وقت پہلی بار اپنی بڑھتی عمر کا احساس ہوا تھا اور یہ احساس کوئی ایسا دکھ دینے والا نہیں تھا جتنا مجھے مونا کی بات سے ہوا تھا۔

"آپی! تم ہاں کر دینا ناں۔ لیکن اس حقیقت سے نظریں مت چرانا کہ تمہارے لیے اب ایسے ہی رشتے آئیں گے۔"

میری وہ بہن مجھے حقیقت بتا رہی تھی جس کی جھولی میں میں نے اپنی خوشیاں ڈالی تھیں۔

اس رات میں پہلی بار اپنے بارے میں سوچنے لگی تھی کہ وہ چھم سے آن موجود

ہوا۔

"تم مجھے لکھنا ضرور کہ اپنی ذمہ داریوں سے نکل کر اب تم اپنے بارے میں سوچنے لگی ہو۔"

"ہاں سوچ رہی ہوں پھر۔" میں اس کے تصور پر چیخ پڑی۔ "تمہیں کیوں لکھوں۔ تم نے کون سا آنے کا وعدہ کیا تھا؟"

"آ بھی سکتا ہوں۔" وہ اس وقت بھی مسکرایا تھا، ابھی بھی مسکرا رہا تھا۔

"جھوٹے ہو تم، پکے جھوٹے۔"

میں نے سختی سے اس کے خیال کو جھٹکا تھا۔ لیکن وہ بھی ایک ڈھیٹ تھا۔ ہر روز چلا آتا۔ جیسے مونا ہر روز آ رہی تھی۔

"آپی! تم ساری زندگی اسی طرح نہیں رہ سکتیں۔ ابھی کچھ ہمت ہے تم میں جو نوکری کر رہی ہو۔ جب ریٹائر ہو جاؤ گی تب کیا کرو گی؟ بھائی وہی ہے جس نے پلٹ کر خبر نہیں لی۔ وہ یہاں ہوتا تو اور بات تھی۔ اس کے بیوی بچوں کے ساتھ تم رہ سکتی تھیں۔ اکیلی نہیں رہ سکتیں۔ لوگ ابھی سے باتیں بنانے لگے ہیں۔"

"لوگ اب باتیں بنانے لگے ہیں کیوں؟ اب کیا میں دنیا سے نرالا کام کرنے لگی ہوں۔" مجھے غصہ آ گیا تھا۔ "اس وقت جب میں تم سب کے لیے گھر سے باہر نکلتی تھی۔ تب تو کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس لیے کہ کہیں ان سے نہ مانگ بیٹھوں۔ میں ابھی بھی کسی سے نہیں مانگوں گی۔ سمجھیں تم۔ جاؤ کہہ دو اپنی ساس سے کہ مجھے نہیں کرنی شادی۔"

"تم ناحق بگڑ رہی ہو۔ ایک تو وہ تمہارا بھلا سوچ رہی ہیں۔"

"اپنی بیٹی کا بھلا سوچیں، میری عمر کی وہ بھی ہے۔ اس کی کیوں نہیں کر دیتیں اس رنڈوے کے ساتھ۔" میں نے تپ کر کہا۔

"اس کی ایک جگہ بات چل رہی ہے۔" مونا کے سفید جھوٹ پر میں تلملا گئی تھی۔ لیکن اس پر جتایا نہیں۔

"بہر حال تمہاری ساس کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری طرف

سے انہیں صاف جواب دے دو۔" مونا کچھ ناراض ہو کر چلی گئی۔ جس کا مجھے افسوس ضرور ہوا لیکن میں نے اسے روکا نہیں تھا۔

پھر اگلے کئی دن میں یونہی اکھڑی اکھڑی سی رہی۔ اپنے آپ جھنجھلاتی رہتی۔ کوئی پاس ہوتا تو کسی بھی بہانے لڑ جھگڑ کر دل کی بھڑاس نکال سکتی تھی لیکن کوئی نہیں تھا۔ گڑیا بھی سرمد کے ساتھ مری گئی ہوئی تھی اور یہ بھی اچھا ہی تھا ورنہ اس بے چاری کو میری باتیں سننی پڑتیں۔

اس وقت مجھے مونا پر غصہ آ رہا تھا۔ جو ناراض ہو کر گئی تھی تو اس کے بعد سے اپنے بچوں کو بھی میرے پاس نہیں آنے دے رہی تھی۔ شاید اس طرح وہ میرے اکیلے پن کو مجھ پر جتانا چاہ رہی تھی کہ کوئی میرا ساتھ نہیں دے گا اور میں کیا نہیں جانتی تھی۔ میں نے تو اسی وقت جان لیا تھا جب فواد نے میرا احساس نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد کسی سے کوئی امید رکھ کر میں نے کبھی خود کو فریب دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود مجھے مونا کا رویہ بہت دکھ دے رہا تھا اور اس پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ کیونکہ آج چھٹی کا سارا دن میں لاشعوری طور پر اس کے بچوں کا انتظار کرتی رہی تھی کہ شاید انہیں میری محبت کھینچ لائے۔ لیکن کوئی نہیں آیا۔

تب میں اپنا دھیان بٹانے کے لیے نوشی اور خالہ کے پاس جا بیٹھی۔ یہ دونوں ماں بیٹی بھی بس میری ہی طرح تھیں کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں تھا۔

نوشی میری طرح جاب کرتی تھی اور خالہ کو بس ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح نوشی کا گھر بس جائے۔ میں جب بھی جاتی، خالہ یہی موضوع لے کر بیٹھ جاتیں اور آج تو انہوں نے نوشی کے ساتھ مجھے بھی شامل کر لیا تھا۔ میں جب آنے لگی تو نوشی میرے پیچھے زینے تک آ کر بولی۔

"سنو۔ تم تو اب آزاد ہو۔ میرا مطلب ہے شادی کر سکتی ہو۔"

"تمہاری اماں نے جو کچھ کہا کیا وہ کافی نہیں ہے جو اب تم......" میں خوامخواہ چڑ گئی۔

"صرف میں نہیں سب ہی کہیں گے، بلکہ گڑیا کی شادی والے دن میں نے کتنی

عورتوں کو کہتے سنا ہے کہ......"

"بکومت......" میں اس کی بات پوری سنے بغیر سیڑھیاں اتر آئی۔

اندھیرا پھیل رہا تھا۔ برآمدے اور پھر کمرے کی لائٹ جلا کر میں نے کچن کا رخ کیا۔ ایک اکیلی جان کے لیے کھانے کا مسئلہ یہ تھا کہ بس سوچتی رہ جاتی کہ صرف اپنے لیے کیا پکاؤں۔ کچھ بھی کھالوں گی اور جب بھوک لگتی تو "کچھ بھی" کھایا نہیں جاتا تھا۔

اس وقت میں نے ایک روٹی ڈال کر آملیٹ بنا لیا۔ پھر چولہے پر چائے کا پانی رکھ کر وہیں کھڑے کھڑے کھانے سے فارغ ہوئی۔ اس کے بعد چائے کا کپ لے کر اندر آئی۔ تو کتنی دیر تک کوئی مصروفیت سوچنے میں لگی رہی۔ لیکن اب کوئی کام ہی نہیں تھا۔

حالانکہ گھر کے کام میں نہیں کرتی تھی۔ یہاں تک کہ میرے کپڑے بھی گڑیا استری کر کے دیتی تھی۔ اس کے باوجود جانے کس بات کی جلدی رہتی تھی۔ میرا وجود ہر دم متحرک رہتا تھا اور اب ایک دم جمود طاری ہو گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ میرے سامنے اب کوئی مقصد نہیں تھا۔ جس کے حصول کے لیے جدوجہد کرتے ہوئے میں چاق و چوبند رہتی تھی۔ میرا دل چاہا، پھر وہی دن لوٹ آئیں۔ فواد کی فیس اور کتابوں کی فکر پھر گڑیا کے لیے کچھ نہ کچھ جوڑنا۔ اس طرح کم از کم اپنی اہمیت کا احساس تو ہوتا تھا۔ پھر انتظار کہ کب فواد تعلیم سے فارغ ہوگا اور کب گڑیا کی شادی ہوگی، اور اس وقت کے انتظار نے ہی تو مجھے زندہ رکھا ہوا تھا۔ انتظار ختم ہوا تو زندگی بے معنی لگ رہی تھی اور ایسی زندگی میں نہیں جی سکتی تھی۔

میں نے بہت بے زاری سے چاروں اوڑ دیکھا پھر اس فریم شدہ تصویر پر نظریں جما دیں جس میں فواد اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد میں نے اسے خط لکھنے کے ارادے سے پیڈ اٹھا لیا۔ پھر دراز میں سے تلاش کر کے پین لے کر بیٹھی تو اچانک جانے کیا ہوا میں فواد کے بجائے اسے مخاطب کر کے لکھ رہی تھی اور زیادہ نہیں بس ایک جملہ۔

"سنو۔ میں اب اپنے بارے میں سوچنے لگی ہوں۔"

اور پھر اسی وقت سے میرا انتظار شروع ہو گیا تھا حالانکہ خط میں نے اگلی صبح آفس جاتے ہوئے پوسٹ کیا تھا اور اسی شام واپس لوٹی تو میری نظریں پورے آنگن میں بھٹکنے لگیں جیسے اس کا جواب آج ہی آیا ہوگا۔ پھر مجھے اپنے آپ پر ہنسی آئی تھی اور پھر ہر روز میں اسی طرح گھر میں داخل ہوتے ہی اس کا جواب ڈھونڈتی۔ کبھی ہنستی، کبھی مایوس ہوتی۔ لیکن اس انتظار نے مجھے پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ جب ہی متلاشی نظروں سے آنگن میں دیکھتے ہوئے میرا دل ان اندیشوں میں دھڑکتا تھا کہ کہیں اس کا جواب مجھ سے میرا انتظار نہ چھین لے۔

یونہی کتنے دن گزر گئے۔ گڑیا ہنی مون سے لوٹ آئی تھی اور اب روزانہ شام میں کچھ دیر کے لیے وہ اور سرمد میرے پاس آنے لگے تھے۔ جس سے میرا دھیان بٹ جاتا لیکن اب مجھے دھیان بٹا کر کوئی خوشی نہیں ہوتی تھی کیونکہ میں اپنی تنہائیوں میں بھی تنہا نہیں رہی تھی۔

"آپی! آپ نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

اس روز سرمد نے مجھ سے پوچھا تو میں بہت اطمینان سے مسکرائی۔

"اپنے بارے میں سوچنے کا کبھی وقت ہی نہیں ملا۔ اب وقت ملا ہے تو دیکھو کیا کرتی ہوں۔ ابھی کچھ طے نہیں کیا۔"

"اب اور کیا کرنا ہے آپی! آپ کو، بس سیدھے سیدھے گھر بسائیں۔" گڑیا نے میری بات سن کر کہا۔

"گھر بسانا اپنے اختیار نہیں ہوتا۔ یہ تو قسمت کی بات ہے اور میری قسمت کے دروازے کی چابی جس شخص کے پاس ہے وہ اگر اس نے سنبھال کر رکھی ہوگی تو ضرور آئے گا۔ ورنہ پھر......" میں نے یونہی ذرا سے کندھے اچکائے تو گڑیا نے بہت شوق سے پوچھا۔

"کون ہے وہ؟"

"بتاؤں گی لیکن ابھی نہیں۔"

میں نے گڑیا کو ٹال دیا تھا۔ کیونکہ میرے پاس اس کا دیا ہوا یقین نہیں تھا نہ کوئی

وعدہ بس مبہم سی آس جس پر ماہ و سال کی جمی ہوئی گرد ابھی کچھ دن پہلے ہی میں نے صاف کی تھی۔ وہ بھی اس لیے کہ زندہ رہنے کو بہانا چاہیے تھا اور میں یہ بہانہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ جس نے مجھے جمود سے نکال کر پھر سے متحرک کر دیا تھا۔

اس وقت گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے روزانہ کی طرح پہلے دروازے کے آس پاس دیکھا پھر اسی طرح ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے برآمدے میں آ کر خود کو تخت پر گرایا تھا کہ آواز پر اچھل پڑی۔

"کیا تلاش کر رہی تھیں؟" اسے دیکھ کر میرا دل سینے کے اندر بے قابو ہو گیا اور کھنکتی ہوئی آواز میں میں بس اسی قدر کہہ سکی۔

"تمہیں۔"

"مجھے؟" وہ حیران ہو کر بولا۔ "میں کوئی ذرہ تو نہیں جسے تم فرش پر تلاش کر رہی تھیں۔"

"تمہیں سے۔ میرا مطلب ہے۔" میں گڑ بڑا گئی۔ کیونکہ اچانک خیال آیا تھا کہ اس نے نہ آنے کی صورت میں خط لکھنے کو کہا تھا اور میں اسے یہ کبھی نہیں بتاؤں گی کہ میں اس کے خط کا انتظار کر رہی تھی۔

......❁......

روشنی کی کرن

قصور میرا نہیں ہے۔ ساری گڑ بڑ میرے نام نے پھیلا ہوئی ہے اور اگر دیکھا جائے تو سارا قصور ہی ڈیڈی کا ہے جنہوں نے مغرب سے متاثر ہو کر میرا نام ڈیزی رکھ دیا تھا۔ کل تک تو مجھے بھی اپنے نام میں کوئی برائی نظر نہ آتی تھی لیکن آج...... میرے نام کی بدولت رابی نے اتنا بڑا انکشاف کر کے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔ اُف میرے خدا۔ میرے نام کی وجہ سے شروع دن سے رابی مجھے کرسچین لڑکی سمجھتا رہا۔ میں حیران ہوں کہ یہی بات میں نے رابی کے بارے میں کیوں نہ سوچی لیکن نہیں، میں بھلا اس کے بارے میں ایسا کیسے سوچ سکتی تھی جب کہ میرا اپنا نام ڈیزی ہے۔ اگر یہ میرا نِک نام ہوتا تو مجھے رابی کا اصل نام پوچھنے کا خیال آتا۔ میں تو یہی سمجھتی رہی کہ جیسے میرا نام ڈیزی ہے ویسے اس کا نام رابی۔ آج جب اس نے مجھے چرچ چلنے کے لیے کہا تو میں حیران ہو گئی۔

"کیا کرو گے وہاں جا کر؟"

"کیوں، تم کیا کرتی ہو وہاں جا کر؟" وہ الٹا مجھی سے پوچھنے لگا۔

"لیکن میں تو کبھی نہیں گئی۔"

"کیوں۔ کیا تم خداوند اور اس کے بیٹے کو نہیں مانتیں؟"

"رابی تم!" میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"اتنی حیران کیوں ہو رہی ہو ڈیزی! کیا تم نے بائبل نہیں پڑھی؟"

"رابی پلیز۔" میں چیخ پڑی۔ "میں مسلمان ہوں۔ میں نے قرآن شریف پڑھا ہے۔"

"کیا؟" اب کے حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔ "لیکن تمہارا نام؟"

"نام سے کیا ہوتا ہے؟"

"نام سے کچھ نہیں ہوتا ڈیزی؟ میں اب تک تمہیں اپنا ہم مذہب سمجھتا رہا۔"

"تو کیا تم......؟"

"ہاں میں کرسچین ہوں۔ میرا پورا نام روبن مارک ہے اور میں تمہیں بھی......"

"نہیں......" میں نے اسے آگے بولنے سے روک دیا۔

"دیکھو ڈیزی! یوں اتنی جذباتی مت ہو۔ اگر تمہارے خیال میں نام سے کچھ نہیں ہوتا تو پلیز اپنی اور میری محبت کے درمیان مذہب کی دیوار حائل مت ہونے دو۔"

"یہ دیوار تو ازل سے ہمارے درمیان حائل ہے رابی۔ کیا تم اسے پھلانگنے کا حوصلہ رکھتے ہو؟"

"نہیں۔ نہیں ڈیزی اس حقیقت کے باوجود کہ میں تم سے شدید محبت کرتا ہوں، میں یہ دیوار نہیں پھلانگ سکتا۔"

میں دکھ سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کتنا عزیز ہے یہ شخص مجھے جس کی محبتوں کی چاشنیاں میری نس نس میں یوں رچ بس گئی ہیں کہ اس کے بنا میں جینے کا تصور ہی نہیں کرسکتی اور اب جب کہ منزل دوگام ہی رہ گئی تھی تو یہ کیسی دیوار ہمارے درمیان حائل ہوگئی ہے کہ جسے نہ وہ پھلانگنے کو تیار ہے اور نہ میں۔

"رابی......!" میں بکھرنے لگی۔

"ڈیزی پلیز، یوں مت روؤ۔"

"رابی۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔"

"میں جانتا ہوں ڈیزی۔ تمہاری محبت پر تو مجھے اپنے آپ سے زیادہ یقین ہے اور اسی یقین کے سہارے میں تم سے التجا کروں گا کہ اپنے اور میرے درمیان حائل اس دیوار کو گرا دو۔"

"کیسے......؟"

"جو حوصلہ مجھ میں نہیں ہے وہ تم اپنے اندر پیدا کرلو۔"

"نہیں......!" میں ایک جھٹکے سے اس سے الگ ہوگئی۔

"تو پھر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ ہم اپنی راہیں الگ کرلیں۔"

"کیا تم میرے بنا رہ سکو گے؟"

"تو پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

"میں جانتی ہوں، میں تمہیں قائل نہیں کرسکوں گی، اس لیے کہ میرے ممی ڈیڈی نے مجھے قرآن شریف پڑھوا کر یہ سمجھ لیا کہ انہوں نے اپنا فرض پورا کردیا۔ انہوں نے کبھی مجھے نماز پڑھنے کی تاکید نہیں کی۔ ہاں جب دادی زندہ تھیں تو وہ نماز پڑھتے ہوئے مجھے اور پنکی کو اپنے ساتھ کھڑا کرلیا کرتی تھیں۔ ہمیں نماز پڑھنا دادی نے سکھایا۔ اور جب دادی کا انتقال ہوگیا تو میں اور پنکی آیا کے رحم وکرم پر رہ گئے۔ ہماری آیا ایک انگریز عورت تھی۔ وہ بھلا ہمیں ہمارے مذہب کے بارے میں کیسے کچھ بتا سکتی تھی ہاں، میں تمہیں اپنی بی بی سے ملوا سکتی ہوں جن سے میں نے قرآن شریف پڑھا ہے وہ یقیناً تمہیں......"

"پلیز ڈیزی......!" اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے آگے بولنے سے روک دیا۔ "کسی تیسرے فرد کو درمیان میں مت لاؤ، جو فیصلہ کرنا ہے خود کرو۔" وہ ذرا توقف کے بعد پھر بولا۔ "تم نے اعتراف کیا ہے کہ تم مجھے قائل نہیں کرسکتیں، اس کے برعکس میں تمہیں قائل کرسکتا ہوں لیکن...... لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تم سے صرف یہ پوچھوں گا کہ تمہارے پاس تمہاری اپنی کیا چیز ہے؟ اپنے جسموں پر ہمارا لباس سجا کر اپنے آپ کو ایڈوانس کہلوانے پر تم لوگ فخر محسوس کرتے ہو۔ ہونٹوں کے زاویے بدل بدل کر بولنے میں تمہاری شان ہے، یہاں تک کہ نام تک تمہارا اپنا نہیں۔"

"رابی پلیز طنز تو مت کرو۔"

"میں طنز نہیں کر رہا ڈیزی! حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ دیکھو صرف نام کی مسلمانی سے بہتر ہے کہ......"

وہ اور بھی جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ مجھے لگا جیسے میں بھٹک رہی ہوں۔ اپنے مرکز سے ہٹتی جا رہی ہوں۔ اس کی آنکھوں کی مقناطیسی کشش مجھے اپنی جانب کھینچنے لگی، اور اس سے پہلے کہ میں اس کی سحر انگیز شخصیت کے آگے بے بس ہو جاتی کہ جانے کیا ہوا میرے

اندر میرا اپنا آپ رونے لگا اور میں اپنی طرف بڑھا ہوا اس کا ہاتھ جھٹک کر اونچے نیچے راستوں پر بھاگتی ہوئی گھر آ گئی۔

اور آج اس وقت سے جب سے میں رابی کے پاس سے آئی تھی، مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ میرے دل اور دماغ کے درمیان ایک جنگ جاری تھی۔ دل چاہتا تھا ساری بندشیں توڑ کر اس کا ہاتھ تھام لوں جب کہ دماغ مجھے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ جانے کتنا وقت ہو گیا تھا مجھے یونہی بیٹھے ہوئے جب پنکی میرے کمرے کی لائٹ جلاتے ہوئے حیرت سے کہنے لگی۔

''ڈیزی تم اندھیرے کمرے میں کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا۔ مبادا وہ میری سرخ آنکھیں دیکھ لے۔

''میں سمجھی تم گھر پر نہیں ہو۔ کئی بار رابی کا فون آ چکا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ تم گھر پر نہیں ہو تو وہ بہت پریشان ہو رہا تھا۔ کیا تم اس کے پاس نہیں گئی تھیں؟'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''وہ کہہ رہا تھا جب تم آؤ تو اسے فون کر لو۔''

''اچھا......!''

''ڈیزی! تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا تم رو رہی ہو؟''

''نہیں'' اس کے ساتھ ہی میں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک پڑی۔

''ڈیزی پلیز، مجھے بتاؤ تمہیں کیا ہوا ہے؟ کیا رابی سے لڑائی ہو گئی ہے؟'' پنکی نے آگے بڑھ کر میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں جانتی تھی اگر میں یونہی روتی رہی تو کچھ دیر کے بعد پنکی بھی میرے ساتھ رونے بیٹھ جائے گی۔ اس لیے میں جلدی سے آنسو پونچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پنکی! تم نے کھانا کھا لیا؟'' حالانکہ میں جانتی تھی کہ وہ میرے بغیر کھانا نہیں کھاتی، اس کے باوجود میں اپنی طرف سے دھیان ہٹانے کو پوچھنے لگی۔

''نہیں''

''اچھا! تم قاسم سے کہو کھانا لگا دے، میں منہ ہاتھ دھو کر آ رہی ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی میں باتھ روم میں گھس گئی۔

ڈائننگ ٹیبل پر پنکی کو اکیلے بیٹھے دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ ممی ڈیڈی ابھی کلب سے نہیں لوٹے۔ میں چپ چاپ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ مجھے بھوک بالکل نہیں لگ رہی تھی لیکن محض پنکی کے خیال سے میں آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ وہ معصوم لڑکی سمجھی شاید میری رابی سے لڑائی ہو گئی ہے، اس لیے وہ اپنی دانست میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے مجھے بہلانے کی کوشش کرتی رہی اور میں بجائے بہلنے کے اکتا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''پنکی! میں سونے جا رہی ہوں، پلیز مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔''

''اتنی جلدی۔'' وہ حیرت سے بولی

''ہاں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''اور اگر رابی کا فون آئے تو کیا کہوں؟''

''کہہ دینا، میں سو رہی ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی میں اسے گڈ نائٹ کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆......☆......☆

رابی سے میری پہلی ملاقات ایک برتھ ڈے پارٹی میں ہوئی تھی۔ پنکی کی دوست کی برتھ ڈے تھی اور وہ مجھے بھی زبردستی اپنے ساتھ لے آئی تھی وہ خود تو یہاں آتے ہی اپنی سہیلیوں میں کہیں کھو گئی تھی اور میں تنہا کھڑی اپنے آپ کو انتہائی احمق محسوس کرنے لگی تو ہال کے نسبتاً تنہا گوشے میں آ بیٹھی مجھے رہ رہ کر پنکی پر غصہ آ رہا تھا جو گھر سے یہ وعدہ کر کے چلی تھی کہ مجھے بور نہیں ہونے دے گی لیکن یہاں آتے ہی وہ مجھے یوں بھول گئی تھی جیسے میں اس کے ساتھ نہیں آئی۔ میں دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتی ہوئی ہال کا جائزہ لینے لگی دروازے سے داخل ہو کر دائیں جانب کچھ منچلی لڑکیاں بیٹھی تھیں اور ان سے کچھ ہی فاصلے پر نوجوان لڑکے ان سے بے نیاز نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے اور اس کوشش میں ان سے جو حرکتیں سرزد ہوئی تھیں انہیں دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

''اوں ہوں، اکیلے ہنسنے والے کو پتا ہے لوگ کیا کہتے ہیں؟'' اپنے قریب

سرگوشی سن کر میں نے فوراً گردن گھما کر دیکھا، وہ جو کوئی بھی تھا، اسے دیکھ اگر لمحے بھ
میری پلکیں ساکت ہو گئی تھیں تو بخدا اس میں میرا قصور نہ تھا، اس کی شخصیت ہی ا
جاذب نظر تھی کہ ہزار کوشش کے باوجود میں نظروں کا زاویہ نہ بدل سکی۔ میری اتنی محویت
پہلے اس نے مجھے دلچسپی سے دیکھا اور پھر ہلکے سے مسکراتے ہوئے ایک آنکھ بند کر لی
میں جو پوری آنکھیں کھولے اسے ہی دیکھ رہی تھی، اس کی اس حرکت پر بری طرح بھ
گئی۔ ''بدتمیز''

وہ ہنس پڑا۔ ''بدتمیز نہیں، رابی!''

میں کچھ نہیں بولی، اس کی طرف سے رخ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''یہاں اجنبی ہو؟'' وہ شاید بات کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

''ہوں......!''

''چلو، ایک قدر تو مشترک ہوئی ہم دونوں میں۔''

اسی وقت پنکی میرے پاس آ کر کہنے لگی۔ ''آئی ایم سوری ڈیزی! میں ذرا
کے بال بنا رہی تھی، تم بور تو نہیں ہوئیں؟''

''ارے نہیں، میں نے انہیں بور ہونے ہی نہیں دیا۔'' مجھ سے پہلے وہ بول

''بائی دا وے آپ کی تعریف؟'' پنکی اس کی طرف گھوم گئی۔

''تم مجھے رابی کہہ سکتی ہو۔''

''اچھا مسٹر رابی! آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے ڈیزی کو بور نہیں ہونے دیا

''ارے نہیں، اس میں شکریے کی کیا بات ہے تم بے فکر ہو کر جاؤ، میں ا
خیال رکھوں گا۔''

''اوہ تھینک یو سو مچ۔''

میں جو اس کی باتیں دلچسپی سے سن رہی تھی، پنکی کو واپس جاتے دیکھ کر ایک
اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پنکی! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''تم اس کی دوستوں میں جا کر کیا کرو گی، بیٹھو آرام سے۔'' وہ یوں بات

تھا جیسے پتا نہیں کب سے جان پہچان ہو۔

''مجھے خواہ مخواہ فری ہونے والے لوگ اچھے نہیں لگتے۔''

''اور مجھے محویت سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے لوگ اچھے لگتے ہیں۔''

میں سمجھ گئی وہ باز آنے والا نہیں ہے، اس لیے کوئی جواب دیے بغیر پنکی کے
پیچھے چل پڑی۔ پھر پارٹی کے اختتام پر جب میں پنکی کے ساتھ واپس آ رہی تھی تو وہ گیٹ
کے پاس یوں کھڑا تھا جیسے ہمارا ہی انتظار کر رہا ہو۔ میں جیسے ہی اس کے قریب سے
گزری، وہ جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''پھر کب ملو گی؟''

میں نے اس کے بجائے پنکی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی دُھن میں آگے بڑھ گئی
تھی۔ میں نے بھی چاہا کہ اسے نظر انداز کرتی ہوئی گزر جاؤں لیکن وہ قدم بڑھا کر میرے
سامنے آ کھڑا ہوا۔

''جب تک جواب نہیں دو گی جانے نہیں دوں گا۔''

''کیا بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو مجھے جانے دو۔''

''نہیں، پہلے بتاؤ کب ملو گی۔''

''کل......!'' میں نے جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔

''کہاں؟''

''کہیں بھی تم جہاں کھڑے ہو گے، میں تمہیں ڈھونڈتی ہوئی آ جاؤں گی۔'' میں
نے شرارت سے کہا تو وہ حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

''ڈھونڈ لو گی مجھے؟''

''ہاں۔''

''تو پھر میں تمہیں ہر اس راستے پر کھڑا نظر آؤں گا جہاں سے تمہارا گزر ہو گا۔''

''اب میں جاؤں؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تو میں جلدی سے پنکی کے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھی۔

''کیا کہہ رہا تھا؟'' پنکی گاڑی اسٹارٹ کرتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"ارے یونہی خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"خواہ مخواہ" پنکی شرارت سے ہنس پڑی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" میں ایک دم سیریس ہو گئی۔

"کچھ نہیں۔" وہ کچھ دیر خاموشی سے ڈرائیو کرتی رہی پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔

"ویسے ڈیزی! تھا ہینڈسم۔"

"کون؟" بے خیالی میں میرے منہ سے نکل گیا۔

"میں رابی کی بات کر رہی ہوں۔"

"ہاں!" میں نے پوری سچائیوں سے اعتراف کیا۔

اور یہ اعتراف ہی تھا کہ میں اگلے روز مری کی سرسبز وادیوں میں اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ گھنٹے بھر کی تلاش کے بعد آخر میں تھک کر ایک پہاڑی کے دامن میں مایوسی کے عالم میں بیٹھ گئی۔ ابھی مجھے بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اپنے پیچھے اس کی آواز سن کر میں چونک کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی۔"

"وہ تو میں نے کل ہی کہہ دیا تھا کہ میں......"

"نہیں، کل تم نے مجھے ٹالنے کی غرض سے کہا تھا۔" وہ میری بات کاٹ کر درمیان میں بول پڑا۔

"اچھا......!" میں خجالت مٹانے کو ہنس پڑی۔

"کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں۔"

"مجھے خوشی ہے ڈیزی! تم نے جھوٹ نہیں بولا۔ خداوند بھی سچ بولنے والے کو پسند کرتا ہے۔" میں کچھ نہیں بولی۔ بس چپ چاپ سر جھکا لیا۔

واپسی میں جب میں نے پنکی کو بتایا کہ میں رابی سے مل کر آ رہی ہوں تو وہ بے تحاشا ہنستے ہوئے بولی۔

"کل تو وہ خواہ مخواہ فری ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"اور آج میں خواہ مخواہ اس کے پاس پہنچ گئی۔"

"بڑی بے ایمان ہو تم۔ خیر وش یو گڈ لک۔"

"تھینک یو......!"

دروازے پر آہٹ سن کر میں سمجھ گئی کہ پنکی یہ دیکھنے آ رہی ہے کہ میں سو رہی ہوں یا نہیں۔ میں نے جلدی سے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر تک میں یونہی لیٹی کوئی آہٹ سننے کی کوشش کرتی رہی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ پنکی اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلی گئی ہے تو میں نے کمبل ہٹا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر برف باری ہو رہی تھی اندھیرے میں سفید روئی کے گالوں کی طرح گرتی ہوئی برف بڑی بھلی لگ رہی تھی۔ شدید سردی کے باوجود میں کمبل پھینک کر کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ تاریکی میں سفید برف سے ڈھکی وہ پہاڑی جس کے دامن میں بیٹھ کر میں نے رابی کے سنگ بے شمار خوبصورت لمحات امر کیے تھے صاف نظر آ رہی تھی۔

"رابی!" میں شیشے سے سر ٹیک کر رو پڑی۔ اس کے سنگ بیتے بے شمار لمحے میری بھیگی آنکھوں میں سمائے۔

اس روز موسم بہت خوشگوار تھا، آسمان پر بادل برائے نام تھے۔ میں پنک کلر کے پلین سوٹ پر ہلکا سا سیاہ سوئیٹر پہن کر باہر نکل آئی۔ مجھے یقین تھا اس چھوٹی سی سرسبز پہاڑی کے دامن میں اپنے مخصوص پتھر پر بیٹھا رابی میرا انتظار کر رہا ہو گا۔ میں نے اپنے قدموں کی رفتار تیز کر دی اور جب میں وہاں پہنچی تو مجھے دیکھ کر وہ بڑی دلکشی سے مسکرا دیا۔

"یو آر لوکنگ سو سویٹ ڈیزی!" (You are looking so sweet Daisy)

"تھینکس۔" میں اس کے سامنے بیٹھ گئی وہ کچھ دیر تک والہانہ انداز سے مجھے دیکھتا رہا۔

"رابی! یوں نہ دیکھا کرو۔ میں نروس ہو جاتی ہوں۔"

"اور یوں نروس ہو کر تم مجھے اور زیادہ اچھی لگتی ہو۔"

"پلیز!" میں ہاتھ چھڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"دیکھو۔ اس خوبصورت موسم میں خفا ہونے کی کوشش مت کرنا اور نہ ہی جانے کی بات کرنا۔"

"پھر!" میں مسکراہٹ روک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"پھر یہ کہ میرے گھر چلو، میں تمہیں قہوہ پلاؤں گا، اپنے ہاتھ سے بنا کر۔"

"نہیں بلکہ تم میرے ساتھ چلو، ایسے موسم میں پنکی بڑے مزے مزے کی چیزیں بناتی ہے۔"

میں نے کہا تو وہ اٹھتا ہوا بولا۔ "چلو۔"

پھر ابھی ہم آدھے راستے پر ہی تھے اچانک بارش شروع ہوگئی۔ میں نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا کچھ دیر پہلے جو آسمان صاف نظر آرہا تھا اب گھرے بادلوں کے پیچھے کہیں چھپ گیا تھا۔

"رابی! اب کیا کریں۔" میں نے سردی سے اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے کہا تو جواب میں اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگنا شروع کر دیا۔ ان اونچے نیچے راستوں پر بھاگتے ہوئے کئی بار میرا پیر پھسلا لیکن رابی نے مجھے گرنے نہیں دیا۔ جب ہم گھر کے قریب پہنچے تو بری طرح بھیگ چکے تھے۔ مجھے گیٹ کے پاس چھوڑ کر رابی کہنے لگا۔

"تم اندر جاؤ میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔"

"لیکن رابی! اندر تو آؤ جب بارش رُک جائے تب چلے جانا۔"

"یہ مری کی بارش ہے جانم! رُک بھی گئی تو پھر شروع ہو جائے گی۔ چلو اب تم اندر جاؤ۔"

"اور وہ چائے۔"

"پھر کبھی سہی، بائے بائے۔" وہ مجھے ہاتھ ہلاتا ہوا بھاگ گیا۔

پھر بہت سارے دن گزر گئے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ میں نے اپنے دل میں رابی کی محبت کی جڑیں مضبوط کرتے ہوئے کبھی سوچا بھی نہیں کہ زندگی کے کسی موڑ پر کوئی وقت ایسا آئے گا۔ جب میں دوراہے پر کھڑی اپنے آپ میں تنہا ہو جاؤں گی۔ اب

اس موڑ پر جبکہ رابی کو میں نے اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا تو میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں رابی کو قائل نہیں کر سکتی اس کا اعتراف تو میں رابی کے سامنے بھی کر چکی تھی کیونکہ مجھے تو خود ابھی قائل ہونے کی ضرورت ہے۔ رابی کہتا ہے کہ میں صرف نام کی مسلمان ہوں تو وہ غلط تو نہیں کہتا۔

لاشعوری طور پر میں اپنا جائزہ لینے لگی۔ مجھ میں ایسی کیا بات ہے جو میں فخر سے کہہ سکوں کہ ہاں میں مسلمان ہوں۔ بہت ڈھونڈنے سے بھی مجھے اپنے میں ایسی کوئی بات نہ ملی۔ نماز میں نہیں پڑھتی۔ قرآن شریف۔ وہی جو ایک بار بی بی نے پڑھا دیا تھا اسے ہی کافی سمجھ لیا اور روزہ کبھی رکھا بھی تو محض افطار پارٹی اٹینڈ کرنے کی غرض سے یا ڈائٹنگ کے لیے۔ کبھی جو میں نے یہ سوچا ہو کہ کوئی کام خدا کی خوشنودی کے لیے کرلوں۔ نہیں ایسا تو کبھی نہیں ہوا۔ میں نے تو ہمیشہ ہر کام اپنے مفاد کی خاطر کیا ہے۔ اور جس کام میں مجھے اپنا مفاد نظر نہیں آیا میں نے اسے کرنے کا کبھی سوچا بھی نہیں تو کیا میں اپنے آپ کو مسلمان کہلانے کی حقدار ہوں۔

"نہیں۔"

ایک کرب انگیز نہیں میرے ہونٹوں سے ادا ہو کے مجھے اندر تک لرزا گئی۔

"تو پھر کیا ہوں میں۔ کیا ہوں میں؟ میں نے کھڑکی سے سر ٹیک دیا۔ چپ چاپ کئی آنسو میری پلکوں کا بند توڑ کر میرے رخساروں پر بہنے لگے۔

رات دھیرے دھیرے بیتی جا رہی تھی۔ اور میں یونہی یخ شیشے سے پیشانی ٹکائے اپنے دُکھ پہ تنہا روتی رہی۔ دور کسی مسجد سے صبح کی اذان کی ہلکی ہلکی آواز میری سماعتوں سے ٹکرا کر ان گھور اندھیروں میں مجھے روشنی کی کرن دکھا گئی اور اس ننھی سی کرن کی طرف پہلا قدم بڑھاتے ہوئے میں نے وضو کیا اور جاء نماز بچھا کر کھڑی ہوگئی۔

مجھے نماز پڑھے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تھا اور اس وقت میں نے نیت تو باندھ لی تھی اُس کے بعد بہت سوچنے پر بھی مجھے یاد نہ آیا کہ ابتدا کہاں سے کروں۔ جب کافی دیر ہوگئی اور میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں وہیں سجدے میں گر کر رو پڑی۔ میرے خدا۔ اتنے برسوں سے میں غفلت کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہوں کہ اپنی پہچان تک کھو بیٹھی

ہوں۔ خداوند اب جبکہ تو نے مجھے روشنی کی کرن دکھا ہی دی ہے تو اسے میرے لیے اتنا وسیع کر دے جو میرے اطراف پھیلے تمام اندھیروں پر حاوی ہو جائے۔ آمین!

پھر میں نے جاء نماز لپیٹ کر رکھ دی اور خود بستر پر لیٹتے ہوئے کمبل سر تک اوڑھ لیا۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی اس لیے جلد ہی مجھے نیند آ گئی۔

''ڈیزی! تم ابھی تک سو رہی ہو۔'' پنکی میرے چہرے سے کمبل ہٹاتی ہوئی بولی تو میں نے ناگواری سے پوچھا۔

''ابھی تک کیا مطلب؟''

''جناب میں کالج سے واپس آ چکی ہوں۔''

''کیا؟'' میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''تم نے مجھے صبح کیوں نہیں اٹھایا۔''

''اٹھایا تھا لیکن تم اتنی گہری نیند میں تھیں مجھے گالیاں دے کر دوبارہ سو گئیں۔''

''اچھا!'' میں ہنس پڑی۔

''بس اب اپنے کارنامے پر ہنسو مت، جلدی اٹھو مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''ارے تم نے ابھی کھانا نہیں کھایا؟'' میں جلدی سے کمبل پھینک کر کھڑی ہو گئی۔

''نہیں اور خلاف معمول ممی ڈیڈی بھی اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر موجود ہیں، تم جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر آ جاؤ۔''

اس کے ساتھ ہی وہ میرے کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی میں نے جلدی جلدی منہ دھویا اور ہاتھوں سے بال ٹھیک کرتی ہوئی ڈائننگ روم میں آ گئی۔

''ہیلو ڈیزی ہاؤ آر یو؟'' مجھے دیکھتے ہی ممی کہنے لگیں اور پہلی بار میں ہونٹوں کا زاویہ بدل کر بولنے کے بجائے چپ چاپ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''تم آج کالج نہیں گئی تھیں؟'' میرے بیٹھتے ہی ڈیڈی پوچھنے لگے۔

''نہیں، صبح میری آنکھ نہیں کھلی۔'' انہیں جواب دے کر میں خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔ کچھ دیر تک ہم سب کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ آخر میں نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

''ممی میرا نام کس نے رکھا تھا؟''

''میں نے۔'' ممی...... فخر سے بولیں۔

''اور پنکی کا؟''

''وہ بھی میں نے۔''

''لیکن ممی! ہم تو مسلمان ہیں پھر ہمارے نام......''

''اوم کم آن ڈارلنگ! نام سے کیا ہوتا ہے؟''

''نام سے بہت کچھ ہوتا ہے ممی اور اس لیے میں نے اپنا نام بدلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''رئیلی ڈیزی! کیا نام رکھو گی تم اپنا؟'' پنکی اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

''عائشہ! اور آئندہ مجھے اسی نام سے پکارا جائے۔'' میں کرسی کھسکا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہ اچانک تم نے نام بدلنے کا فیصلہ کیسے کر لیا بیٹا!'' ڈیڈی حیران ہو کر پوچھنے لگے۔

''اس لیے کہ میرے نام کی وجہ سے لوگ مجھے کرسچین سمجھتے ہیں اور یہ مجھے کسی صورت گوارا نہیں۔''

میں ڈیڈی کو جواب دے کر پنکی کی طرف گھوم گئی۔ ''اور پنکی اس سے پہلے کہ تمہارے ساتھ بھی کوئی ایسا حادثہ پیش آ جائے تم بھی اپنا نام بدل ڈالو۔ اور پھر اس سے پہلے کہ ممی ڈیڈی میں سے کوئی کچھ کہتا، میں ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی۔ کوریڈور میں فون کی گھنٹی بج رہی تھی، میں نے آ کر ریسیور اٹھایا۔

''ہیلو!!''

''ہیلو ڈیزی! یہ میں ہوں رابی۔''

''کیسے ہو رابی؟'' اس کی آواز سن کر مجھے اپنے آپ پر اختیار نہ رہا۔

''ٹھیک ہوں، تم یہ بتاؤ، کل کہاں چلی گئی تھیں؟ میں نے کتنی بار تمہیں فون کیا۔''

''وہ کل...... کہیں نہیں میں سو رہی تھی۔''

"اچھا!" وہ ہنس پڑا شاید خواہ مخواہ ہی۔ "ابھی آ رہی ہو نا!"

"نہیں! آج شاید نہ آسکوں۔"

"کیوں؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ڈیزی! کیا تم نے کوئی فیصلہ کرلیا ہے؟"

"کیسا فیصلہ؟" میں اُلٹا اسی سے پوچھنے لگی۔

اب کے جواب نہ دینے کی اس کی باری تھی۔ میں کچھ دیر تک اس کے بولنے کی منتظر رہی جب وہ کچھ نہیں بولا تو میں نے آہستگی سے ریسیور رکھ دیا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

میں بڑے دنوں کے بعد بی بی کے گھر آئی تھی۔ چار سال بعد یا شاید پانچ سال کے بعد جبھی وہ مجھے نہیں پہچانیں۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگیں۔

"بی بی میں ڈیزی ہوں۔" میں نے آگے بڑھ کر انہیں کندھوں سے تھام لیا۔

"ارے تم ڈیری ہو، کتنی بڑی ہوگئی ہو۔"

"ڈیری نہیں بی بی ڈیزی۔" میں ہنستی ہوئی ان سے لپٹ گئی۔

"تمہارا فرنگیوں جیسا نام میری زبان پر کبھی نہیں چڑھا۔"

"اس لیے تو میں نے اپنا نام بدل کر عائشہ رکھ لیا ہے۔"

"یہ تم نے بہت اچھا کیا بیٹا! چلو اب تم یہاں کیوں کھڑی ہو آؤ، اندر چل کر بیٹھو۔" اور میں یوں ہی بی بی کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے اندر چلی آئی۔

"اتنے عرصے بعد تجھے میری یاد کیسے آ گئی؟ کیا تیری شادی ہو گئی ہے؟" میرے بیٹھتے ہی بی بی نے ایک ساتھ دو سوال کر ڈالے۔

"بی بی! مجھے بہت پہلے آپ کے پاس آنا چاہیے تھا، یہ میری غلطی ہے کہ میں نہیں آئی۔" میں بے اختیار اٹھ کر بی بی کے قدموں میں جا بیٹھی۔

"ارے چندا! یہاں کہاں بیٹھ رہی ہو۔ اوپر بیٹھو۔"

"نہیں بی بی! میں یہیں ٹھیک ہوں۔" میں نے اپنی پیشانی ان کے گھٹنے پر ٹکا دی۔ چپ چاپ کئی آنسو میری آنکھوں میں جمع ہو کر چھلکنے کو بے تاب ہو گئے۔ جنہیں میں نے روکا نہیں۔

"ارے بیٹی! تم رونے لگیں۔ کیا ہوا ہے؟" بی بی ایک دم پریشان ہو گئیں۔

"بی بی! میں بھٹک رہی ہوں، مجھے راستہ دکھانے والا کوئی نہیں، خدا کے لیے میری راہنمائی کیجیے۔ اگر مجھے صحیح راستہ نہ ملا تو میں گہری تاریکیوں میں کہیں کھو جاؤں گی۔ مجھے بچا لیجیے۔ بی بی میں کھونا نہیں چاہتی۔"

"کیا کہہ رہی ہو تم۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"بی بی! مجھے نماز پڑھنی نہیں آتی۔"

"ہائیں......!" میرے بالوں میں حرکت کرتے بی بی کے ہاتھ رُک گئے۔

"ہاں بی بی! صبح میں نے کوشش کی تھی نماز پڑھنے کی لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔"

"اچھا۔ روؤ مت میری بچی، میں تمہیں سکھا دوں گی۔ اور ہاں قرآن شریف بھی یاد ہے یا وہ بھی۔"

"یاد تو ہے بی بی! لیکن روانی سے نہیں پڑھ سکتی۔"

"روزانہ پڑھو گی تو روانی خود بخود آ جائے گی۔ چلو اب اٹھ کر منہ ہاتھ دھولو۔ میں تمہارے لیے دودھ کی سویاں بناتی ہوں کھاؤ گی نا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو بی بی نے میرے بال سمیٹ کر میری پیشانی چوم لی۔

پھر میں روزانہ شام کے وقت بی بی کے پاس آ جاتی۔ ان کے اندر علم کا ایک سمندر تھا جس سے وہ آہستہ آہستہ سیراب کرنے لگیں۔ انہوں نے مجھے چند کتابیں بھی پڑھنے کے لیے دیں جو احادیث اور سیرت کے موضوع پر مبنی تھیں میں جیسے جیسے ان کتابوں کو پڑھتی گئی مجھے لگا روشنی کی وہ ننھی سی کرن بڑھتے بڑھتے ہالے کی شکل اختیار کر گئی جس میں، میں دور تک دیکھ سکتی تھی۔ پھر وقت کے ساتھ ساتھ یہ ہالہ میری پوری کائنات کو منور کر گیا۔ میرے اندر کے اندھیرے آپ ہی آپ چھٹ گئے اور میں صرف نام کی مسلمان

سے نکل کر فخریہ یہ کہہ سکتی تھی کہ میں مسلمان ہوں۔ ہاں البتہ رابی کے معاملے میں، میں اب بھی مجبور تھی، دل کسی طور پر یہ حقیقت ماننے کو تیار ہی نہ تھا کہ میں اور وہ ندی کے ایسے دو کنارے ہیں جو ساتھ ساتھ تو چل سکتے ہیں لیکن مل نہیں سکتے۔ فون پر اس کی آواز سن کر میں اب بھی بے اختیار ہو جاتی اور ہزار کوشش کے باوجود میں اپنے آپ کو اس سے ملنے سے نہ روک پا رہی تھی۔ ایک بات جو میں محسوس کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ پہلے جب میں رابی کے پاس جاتی تھی تو مجھے دیکھ کر وہ کِھل اٹھتا تھا۔ اور اب مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک اداس سے مسکراہٹ ٹھہر جاتی۔ وہ مجھے اپنے سامنے بٹھا کر یوں حسرت سے تکنے لگتا کہ میرا دل رونے لگتا۔

''رابی! میں اب بھی تم سے پیار کرتی ہوں۔'' میں نے بے اختیار کہا۔

''انجام جانتی ہو؟''

''ہاں۔''

''پھر بھی......''

''پھر بھی۔ میں کیا کروں رابی! ان راہوں پر میرے قدم اتنی دور تک آ گئے ہیں کہ واپسی کا خیال میرے لیے سوہانِ روح ہے۔''

''واپس تو جانا پڑے گا ڈیزی۔ اس لیے کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔''

میں نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنی بات کہہ کر وہ خود بھی آزردہ بیٹھا تھا۔ میں چپ چاپ اُٹھ کر چلی آئی۔

میں رابی کے پاس سے اُٹھ کر تو آ گئی تھی لیکن اب مجھے کسی صورت چین نہیں آ رہا تھا۔ وہ جو میری محبت تھا اور اس نے اپنی سحر انگیز محبتوں کا جو جال میرے گرد بُن دیا تھا اس سے نکلنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت میں ریلنگ پر جھکی مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ تبھی پنکی نے آ کر مجھے چونکا دیا۔

''عائشہ! کیا سوچ رہی ہو؟''

میں خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''اگر تم نے اپنا نام عائشہ رکھ ہی لیا ہے تو اسے ذہن میں بھی رکھو۔ تم تو مجھے

یوں دیکھ رہی ہو جیسے میں تم سے نہیں کسی اور سے مخاطب ہوں۔'' میرے یوں دیکھنے پر اس نے مجھے لمبا چوڑا لیکچر دے دیا۔

''یہ بات نہیں پنکی! میں دراصل کچھ اور سوچ رہی تھی۔''

''یقیناً رابی کے بارے میں سوچ رہی ہو گی؟''

''ہاں۔''

''تو پھر اتنا سنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے سوچتے ہوئے تو تمہارے چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ ہونی چاہیے تھی۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''جدائی کی گھڑیاں قریب ہوں تو مسکراہٹیں آپ ہی آپ کہیں کھو جاتی ہیں۔''

میرا لہجہ آپ ہی آپ دھیما ہو گیا۔

''کیوں؟ رابی کہیں جا رہا ہے کیا؟''

''نہیں۔''

''تو پھر......؟''

میں کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے بولی۔ ''تم جانتی ہو پنکی رابی کرسچین ہے۔''

''کیا؟'' وہ ایک دم چیخ پڑی۔ ''تمہیں کس نے بتایا؟''

''خود رابی نے، اور وہ مجھے بھی کرسچین سمجھا تھا۔ میرا بھی یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا پنکی بتاؤ میں کیا کروں؟''

''رابی کیا کہتا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''اور تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں...... میں اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتی اور میں رابی کو بھی......''

''رابی کو تمہیں بھولنا ہی ہو گا عاشی۔''

''پنکی! وہ میری محبت ہے۔''

''لیکن ہمارا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ......''

"میں جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں پنکی لیکن میرا دل کسی طور اسے چھوڑنے،
اسے بھول جانے پر آمادہ نہیں ہوتا۔"

"تو پھر رابی سے کہو۔"

"وہ نہیں مانتا۔"

"دیکھو عاشی! اگر وہ نہیں مانتا تو پلیز تم فوراً اس سے قطع تعلق کرلو، ورنہ تم ؟
ہو جاؤ گی۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں جانتی ہوں تمہارے لیے یہ بہت مشکل ہے لیکن یہ بھی تو سوچو کہ اسی میں
تمہاری بھلائی ہے۔"

"ہاں، میں کوشش کر رہی ہوں۔"

"خدا کرے، تم جلد اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤ، چلو اب تم اندر جاؤ، میں
تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔"

وہ جو مجھ سے چھوٹی تھی۔ اس وقت یوں مجھ سے بات کر رہی تھی جیسے میں اس
کے سامنے کوئی ننھی منی بچی ہوں۔

"چائے کے ساتھ کچھ اور بھی کھاؤ گی؟"

"نہیں۔" میں بے ساختہ ہنس پڑی۔ "تم صرف چائے لے آؤ۔" مجھے ہنستے
دیکھ کر وہ ہلکے سے مسکرائی پھر بھاگتی ہوئی نیچے چلی گئی۔

اگلے روز جب میں اس مخصوص جگہ پر پہنچی جہاں رابی میرا انتظار کرتا تھا تو وہاں
رابی نہیں تھا۔ میں سمجھی وہ مجھے ستانے کی غرض سے کہیں چھپ گیا ہے، اس لیے اِدھر اُدھر
دیکھتی ہوئی میں اپنے مخصوص پتھر پر آ بیٹھی۔ میری نظریں اب بھی اسے ہی تلاش کر رہی
تھیں اور وہ تھا کہ کہیں نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ آخر تھک کر میں نے بازوؤں میں چہرہ چھپا
لیا۔ ایک دم ہی جانے کہاں سے اتنی ڈھیر ساری اداسیاں میرے من میں آ سمائیں کہ میری
آنکھوں کے فرش گیلے ہونے لگے۔ میرے خدا ایک دن رابی نظر نہ آئے تو میں اتنی بے
کل ہو جاتی ہوں، پھر یہ ہمیشہ کی جدائیاں میرا مقدر کیوں ہو گئی ہیں۔

میں نے اٹھتے ہوئے دُکھ سے سوچا اور بوجھل قدموں سے واپس آ گئی۔ پھر
اگلے کئی روز مجھے یونہی واپس آنا پڑا، پتا نہیں وہ مجھے ستا رہا تھا یا اسے میری آزمائش
مطلوب تھی کہ یوں بنا بتائے جانے کہاں چلا گیا تھا۔ میں کئی بار اُس کے گھر فون کر چکی تھی
لیکن وہ وہاں بھی نہیں ملا حالانکہ فیصلے کا اختیار تو وہ مجھے دے چکا تھا پھر اُس کا یوں چُھپ
جانا میری سمجھ میں نہیں آیا۔

زندگی کے سارے خوبصورت رنگ اُسی کی بدولت تو تھے اب جب وہ نظر نہیں
آ رہا تھا تو لگتا تھا جیسے یہ سرسبز و شاداب وادیاں اپنا سارا حُسن کھو بیٹھی ہوں۔ اس کے
بارے میں بے تحاشہ سوچتے ہوئے بارہا میں نے اپنے آپ کو ملامت کی کہ وہ جو میرے
لیے شجر ممنوعہ کی مانند ہے تو اس کی سحر انگیز شخصیت میں کھو کر یقیناً میں گناہ کی مرتکب ہو
رہی ہوں۔ لیکن ہر بار میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر بہلا لیا کہ بس آخری بار!

ہاں آخری بار میں اُس سے مل کر اُسے اپنا فیصلہ سنانا چاہتی ہوں اور شاید مجھے
فیصلہ سُنانے کی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی کہ میں پہاڑی کے دامن میں بیٹھ کر اُس کا انتظار
کرنے کے بجائے اُس کے گھر جا پہنچی۔ مجھے دیکھ کر وہ تھوڑا حیران ہوا۔ پتا نہیں یہ اس
سے اتنے دنوں کی دوری کا اثر تھا یا جانے کیا تھا کہ پہلی بار میں اُسے دیکھ کر بے اختیار
نہیں ہوئی بلکہ اس کے حیران چہرے پر نظریں جمائے ہوئے ہلکے سے مسکرا کر بولی۔

"کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں۔" وہ افسردگی سے مسکرایا۔

میں اپنے اطراف دیکھتے ہوئے سوچنے لگی کہ مجھے بیٹھنا چاہیے یا یونہی کھڑے
کھڑے اس سے بات کر لینی چاہیے۔

"بیٹھو گی نہیں؟" اس نے مجھے چونکا دیا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" میں صوفے کے کنارے ٹک گئی۔

"چائے پیو گی؟"

میرے خدا یہ کیسی رسمی گفتگو تھی جو ہم دونوں کے درمیان ہو رہی تھی۔

"نہیں۔ اب خدا کے لیے یہ مت پوچھ لینا کہ ٹھنڈا چلے گا۔"

وہ ہنس پڑا۔ ''اور کیا پوچھوں؟''

''میرے آنے کا سبب پوچھ لو یا اپنے نہ آنے کی وجہ بتا دو۔''

''مجھے اچانک کام کے سلسلے میں اسلام آباد جانا پڑ گیا۔ اس لیے میں تمہیں بتائے بنا ہی چلا گیا۔ تم بتاؤ، کیسے آئیں؟''

''میں تمہیں یہ بتانے آئی ہوں رابی! کہ میں نے ڈیزی سے عائشہ بننے تک کا سفر مکمل کر لیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ میں صرف نام کی مسلمان نہیں رہی، اب میں اس مقام پر آ گئی ہوں کہ تمہیں قائل کر سکوں۔''

''اور اگر میں قائل نہ ہونا چاہوں تب۔''

''میں زبردستی نہیں کروں گی۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ میرے مذہب نے زبردستی کسی پر اپنی مرضی ٹھونسنے کا درس نہیں دیا اور پھر میں تمہیں قائل کرنے نہیں آئی، میں تو تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ آئندہ میں تم سے ملنے نہیں آ سکوں گی۔''

''ڈیزی!'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

''اگر تم مجھے میرے اصل نام سے پکارو تو مجھے خوشی ہو گی۔''

''کیا تم نے فیصلہ کر لیا ہے؟'' وہ میری بات نظر انداز کرتا ہوا بولا۔

''ہاں!''

''اتنی جلدی!''

''تم اسے جلدی کہتے ہو رابی! مجھے تو یہ فیصلہ بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا، بہر حال مجھے خوشی ہے کہ میرے خدا نے مجھے بھٹکنے نہیں دیا۔''

''ڈیزی! ادھر دیکھو میری طرف۔''

وہ قدم بڑھا کر میرے مقابل آ کھڑا ہوا۔ میں جانتی تھی اس کی آنکھوں کی

مقناطیسی کشش میرا سارا اعتماد چھین لے گی اور میں لمحہ بھر کو ہی سہی ڈگمگا ضرور جاؤں گی اس لیے میں نے اس کی طرف سے رُخ موڑ لیا۔

''ڈیزی پلیز، میری طرف دیکھ کر بتاؤ کیا تم زندگی کا سفر میرے بنا طے کر سکو گی؟''

''ہاں!'' ایک سسکی تھی جو میرے ہونٹوں سے آزاد ہوئی۔

''تمہارا لہجہ تمہارا ساتھ نہیں دے رہا ڈیزی!'' اُس نے مجھے کندھوں سے تھام کر اپنی طرف گھما دیا تو میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔

''پلیز، مجھے ہاتھ مت لگاؤ۔''

''کیوں کیوں؟'' وہ چیخ پڑا۔

''میرا مذہب اس بات کی اجازت نہیں دیتا اور پھر ہم فاصلہ رکھ کر بھی بات کر سکتے ہیں۔''

''کیا تم تہیہ کر کے آئی ہو کہ ہر بات اپنے مذہب کے حوالے سے کرو گی۔''

''ہاں اس لیے کہ تم نے مجھے نام کی مسلمانی کا طعنہ دیا تھا اور تم نہیں جانتے رابی اُس وقت میں اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔''

''مجھے افسوس ہے کہ میری ذرا سی بات۔''

''نہیں رابی!'' میں اُس کی بات کاٹ کر جلدی سے بول پڑی۔ ''یہ تو تمہارا مجھ پر احسان ہے اور پھر جسے تم ذرا سی بات کہہ رہے ہو تمہاری اسی بات نے میرے لیے سوچ کی نئی راہیں کھول دیں ورنہ اب تک میں شاید انہی گھور اندھیاروں میں بھٹکتی رہتی بہر حال دیر سے ہی سہی میں نے اپنا راستہ پا لیا ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس راستے پر چلنے سے نہیں روک سکتی۔''

''او کے او کے! اب چھوڑو اس موضوع کو، یہ بتاؤ دوستی تو رکھو گی نا۔''

''نہیں۔''

''کیا تمہارا مذہب دوستی کی اجازت بھی نہیں دیتا۔''

میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے اندازہ لگانا چاہا کہ وہ محض ایک بات کہہ رہا ہے یا میرے مذہب کے حوالے سے میرا مذاق اُڑانا چاہ رہا ہے۔، جب مجھے

یقین ہو گیا کہ وہ میرا مذاق نہیں اُڑا رہا تو مجھے ایک گونہ خوشی محسوس ہوئی کہ وہ اب بھی اتنا ہی قد آور ہے جتنا کہ پہلے روز مجھے نظر آیا تھا اور میں سرسبز وادیوں میں اسے ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی تھی۔

''تم نے جواب نہیں دیا؟'' وہ آس سے پوچھنے لگا۔

''مجھے افسوس ہے رابی! میں ایسا نہ کرسکوں گی۔''

میرا لہجہ بھیگنے لگا اور اس سے پہلے کوئی کمزور لمحہ مجھے اپنی گرفت میں لیتا میں اس کی طرف دیکھے بنا باہر نکل آئی۔

میں اس سے ہر تعلق توڑ تو آئی تھی، لیکن اب یوں لگتا تھا جیسے وقت ٹھہر گیا ہو، ایک نامعلوم سی اداسی ہر وقت میرے وجود پر چھائی رہتی اور میں پہروں ایک ہی زاویے سے بیٹھی اسے نہ سوچتے ہوئے بھی اسے ہی سوچے جاتی۔ میں نے گھر سے نکلنا بھی تقریباً چھوڑ ہی دیا تھا، مبادا اس پر نظر پڑ جائے اور میرے ضبط کے تمام بندھن پل میں ٹوٹ جائیں۔ اس روز بھی میں بالکونی میں بیٹھی آسمان کے سینے پر آنکھ مچولی کھیلتے بادلوں کو دیکھتے ہوئے جانے کیا سوچ رہی تھی کہ پنکی میرے پاس آ کر کہنے لگی۔

''عاشی! نیچے تمہاری قسمت کا فیصلہ ہو رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''ڈیڈی کے کوئی دوست تمہارے لیے اپنے بیٹے کا پرپوزل لائے ہیں۔'' میں کچھ نہیں بولی چپ چاپ اپنا چہرہ گھٹنوں پہ ٹکا لیا۔

''سنو، ساتھ میں جیجا جی بھی آئے ہیں، دیکھو گی نہیں؟'' وہ شرارت سے بولی۔

''نہیں۔''

''سچ بڑے ہینڈسم ہیں، تمہاری قسمت پر رشک آ رہا ہے چلو میں تمہیں دکھاؤں۔''

''میں نے کہا نا میں نہیں جاؤں گی۔'' میں بیزاری سے بولی۔

''تمہاری مرضی میں تو تمہارے بھلے کو کہہ رہی تھی، اب بعد میں مجھ سے مت لڑنا کہ میں نے تمہیں دکھایا نہیں تھا۔''

''نہیں لڑوں گی، میرا دماغ مت چاٹو۔''

''واہ نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔'' وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی تو مجھے بے اختیار اُس پر پیار آ گیا۔

''ناراض ہو گئی ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''دوستی کی کوئی صورت؟''

''پہلے میرے جیجا جی کا نام پوچھو۔''

''اگر تمہیں بتانے کا اتنا ہی شوق ہے تو بتا دو۔''

''زریاب احمر!'' نام بتا کر وہ یوں میری طرف دیکھنے لگی جیسے میں کچھ کہوں گی لیکن جب میں کچھ نہیں بولی تب وہ خود ہی شروع ہو گئی۔
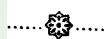
''ایمان سے عاشی جتنا خوبصورت نام ہے، اس سے کہیں زیادہ خوبصورت ان کی شخصیت ہے۔''

''تو پھر ممی سے کہہ دیتی ہوں، میرے بجائے تمہارے لیے ہامی بھر لیں۔''

''کیا؟ کیا کیا خبردار جو ایسی کوئی بات کی میں سر توڑ دوں گی تمہارا اور اپنا بھی۔''

اس کے ساتھ ہی وہ پیر پٹختی ہوئی نیچے چلی گئی میں کچھ دیر تک یونہی خالی الذہن بیٹھی رہی پھر اُٹھ کر مغرب کی نماز کے لیے وضو کرنے نیچے آ گئی۔

یونہی بہت سارے دن گزر گئے، پنکی کی زبانی مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ ممی ڈیڈی نے زریاب احمر کا پرپوزل منظور کر لیا ہے میں نے کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نہیں کیا جبکہ پنکی کو جب بھی موقع ملتا، وہ میرے سامنے زریاب احمد کی تعریفوں کے پل باندھ دیتی پتا نہیں وہ ایسا کیوں کرتی تھی۔ شاید ایسا کر کے وہ میرے ذہن سے رابی کے نقوش مٹانا چاہتی تھی۔ اب میں اسے کیسے سمجھاتی کہ میں تو خود ایسی ہزار ہا کوششیں کر چکی ہیں اس کے باوجود اس کی شخصیت کی سحر انگیزی سے نہیں نکل پا رہی۔

❁

پنکی کے ساتھ میں ایک دوکان پر سینڈل دیکھ رہی تھی۔ مختلف شوکیس دیکھتی ہوئی

میں ایک جگہ جیسے ہی رُکی مجھے احساس ہوا جیسے کوئی مانوس مہک میرے چاروں طرف بکھ
گئی ہو میں نے چونک کر اپنے اطراف دیکھا تو ایک جگہ میری نظریں ٹھہر گئیں۔ مجھ
کچھ فاصلے پر رابی ایک شیشے کے آگے جھکا شاید شوز دیکھ رہا تھا۔ میرا دِل عجیب انداز
دھڑکنے لگا تو میں نے جلدی سے اس کی طرف رُخ موڑ لیا۔

''پنکی گھر چلو، سینڈل پھر کسی وقت خرید لیں گے۔''

''کیوں جب آ ہی گئے ہیں تو ابھی لے لیتے ہیں اور پھر تم کب آسانی سے گ
سے نکلتی ہو اتنی تو تمہاری خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں۔'' پنکی اَڑ گئی۔

''اصل میں پنکی وہاں رابی کھڑا ہے اور میں اس کے سامنے جانا نہیں چاہتی۔''
میں نے اصل بات بتا دی تو وہ ایک دم چاروں طرف دیکھتی ہوئی چیخنے
انداز میں بولی۔

''کہاں ہے؟''

''آہستہ بولو۔'' میرے ٹوکنے پر بھی وہ باز نہ آئی اور رابی کو دیکھ کر وہیں
پکارنے لگی۔

''رابی۔ ہیلو رابی!''

اس نے فوراً گھوم کر دیکھا اور ہم دونوں پر نظر پڑتے ہی وہ مسکراتا ہوا ہمار
پاس آ گیا۔

''کیسی ہو؟'' وہ اپنی مقناطیسی نظریں مجھ پر ٹکاتا ہوا بولا۔

''ٹھیک ہوں۔'' میں نے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجالی۔

''اچھا!'' میں خواہ مخواہ ہنس پڑی۔

''پتا ہے رابی! عاشی کی شادی ہو رہی ہے۔'' پنکی شرارت سے میری طر
دیکھتی ہوئی اسے بتانے لگی۔

''اچھا کب؟'' وہ اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کرتا ہوا بولا لیکن میں نے د
اُس کی آنکھوں کی جوت ماند پڑ گئی تھی۔

''اگلے مہینے، یہ ساری شاپنگ اسی سلسلے میں ہو رہی ہے۔'' پنکی اُسے تفصی

بتانے لگی تو میں اُس کی طرف سے رُخ موڑ کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''بہت بہت مبارک ہو ڈیزی!'' وہ میرے قریب ذرا سا جھک کر بولا تو میں
اس کی طرف دیکھنے کی بجائے پنکی طرف گھوم گئی۔

''پنکی! چلو بھئی، اتنی دیر ہو گئی ہے۔''

''لیکن تم نے اپنے لیے سینڈل تو لی نہیں۔''

''پھر کسی وقت لے لوں گی، اب چلو۔''

''اچھا تم رُکو، میں اپنے شوز کی پے منٹ کر آؤں۔''

وہ مجھے وہیں چھوڑ کر کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔ پنکی کے جاتے ہی وہ میرے
سامنے آ کھڑا ہوا۔

''تم خوش ہو؟''

''کس بات سے؟''

''اپنی شادی ہونے پہ۔''

''میرا خیال ہے، ناخوش ہونے کی کوئی وجہ بھی نہیں۔''

''زریاب تمہیں پسند ہے؟''

''رابی جو کہنا چاہتے ہو صاف صاف کہہ دو، یوں گھما پھرا کر بات کیوں کر رہے
ہو؟'' میں نے ہمت کر کے سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تو وہ کچھ دیر تک
خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

''کیا میری محبتیں اتنی بودی تھیں ڈیزی! کہ تم نے اتنی جلدی اپنے لیے نیا ساتھی
منتخب کر لیا۔''

''تمہاری محبت کی میرے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے۔ رابی! یقین کرو اگر مجھے
شروع دن سے تمہاری حقیقت معلوم ہو جاتی تو میں کبھی تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ نہ
بڑھاتی۔ اس وقت اگر میں نام کی مسلمان تھی تو بھی اتنی سمجھ ضرور رکھتی تھی کہ تمہارے اور
میرے درمیان......''

''پلیز ڈیزی!'' اس نے ہاتھ اٹھا کر مجھے مزید بولنے سے روک دیا۔

''رہا نیا ساتھی منتخب کرنے کا سوال تو زریاب ممی ڈیڈی کی پسند ہیں اور میرا

خیال ہے انہیں میری پسند بننے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔‘‘

’’تم نے کبھی یہ بھی سوچا ڈیزی! کہ میں کیا کروں گا؟‘‘

’’تم اپنی راہیں خود تلاش کرو رابی لیکن پلیز آئندہ کسی لڑکی سے دوستی کرنے سے پہلے یہ ضرور معلوم کر لینا کہ وہ تمہاری ہم مذہب ہے یا نہیں۔‘‘ اور پھر اس سے پہلے کہ میرے لہجے کی لرزش اس پر میرا اندر عیاں کر دیتی میں تیز تیز قدم اٹھاتی دوکان سے باہر نکل آئی۔ میری پلکوں پر جمی شبنم نے مجھے احساس دلا دیا کہ وہ جسے میں نئی راہیں تلاش کرنے کا مشورہ دے کر آ رہی ہوں میرے دل میں اب بھی موجود ہے۔ اور میرے دل کے کسی گوشے میں کہیں یہ آرزو بھی ہے کہ اس کی راہوں کے سنگریزے میں اپنی پلکوں سے چُن لوں۔ واپسی میں میں خواہ مخواہ پنکی سے اُلجھ پڑی۔

’’تم کیوں خواہ مخواہ رابی سے فری ہو رہی تھیں۔‘‘

’’کیا مطلب ہے تمہارا؟‘‘ وہ حیران ہو گئی۔

’’کیا ضرورت تھی، اسے ہیلو ہیلو کر کے پکارنے کی ہم اس سے بات کیے بغیر بھی واپس آ سکتے تھے۔‘‘

’’ہاں لیکن یہ کتنی بری بات ہوتی، وہ ہمارے بارے میں کیا سوچتا؟‘‘

’’اس نے ہمیں دیکھا ہی کب تھا جو کچھ سوچتا۔‘‘

’’نہیں دیکھا تھا تو دیکھ لیتا۔‘‘

’’خواہ مخواہ بحث مت کرو۔‘‘ میں چڑ گئی۔

’’عاشی! کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیوں ذرا سی بات کو اتنا سیریس لے رہی ہو؟‘‘

’’اسے تم ذرا سی بات کہتی ہو، تم کیا جانو، اسے دیکھ کر میں کیا محسوس کرنے لگتی ہوں۔‘‘ میرا ضبط جواب دے گیا اور میں اس تمام عرصے میں پہلی بار...... پنکی کے سامنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

’’عاشی۔ عاشی پلیز آئی ایم سوری۔‘‘ میرے رونے سے وہ ایک دم بہت زیادہ پریشان ہو گئی۔ ’’دیکھو، میں آئندہ خیال رکھوں گی تم پلیز یوں مت روؤ۔‘‘

میں نے جلدی سے آنسو پونچھ لیے۔

’’عاشی کیا تم اب بھی رابی سے۔‘‘ وہ بات ادھوری چھوڑ کر غور سے میری طرف دیکھنے لگی۔

’’پتا نہیں۔‘‘ میں اسے وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

پھر گھر میں میری شادی کے ہنگامے جاگ اُٹھے۔ میں نے پنکی کے اصرار کے باوجود زریاب احمر کو نہیں دیکھا تھا کیونکہ میں صرف نام کی حد تک اس سے منسوب نہیں ہونا چاہتی تھی۔ میری دلی تمنا تھی کہ پوری سچائیوں اور ایمانداری کے ساتھ نئی زندگی کی ابتدا کروں جس میں میرے گئے دنوں کی پرچھائیں تک نہ ہو۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے جیسے شادی کے دن قریب آ رہے تھے میں زریاب احمر کو زیادہ سوچنے لگی تھی شاید ایسا کر کے میں یہ سمجھ رہی تھی کہ رابی کی ذات کی نفی کر لوں گی۔ ہو سکتا ہے میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاتی لیکن اس روز جبکہ میرے ہاتھوں پر زریاب کے نام کی مہندی سج چکی تھی کہ رابی کا فون آ گیا۔ میں سُننا نہیں چاہتی تھی لیکن پھر جانے کیا خیال آیا کہ میں نے ریسیور کان سے لگا لیا۔

’’ہیلو!‘‘

’’ڈیزی! یہ تم ہو نا؟‘‘ میری آواز سنتے ہی وہ بے تابی سے پوچھنے لگا۔

’’ہاں!‘‘

’’کیا کر رہی ہو؟‘‘

’’کچھ نہیں۔‘‘

’’سُنو، مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے، کیا تم اس وقت آ سکتی ہو۔‘‘

’’نہیں۔‘‘

’’پلیز ڈیزی! انکار مت کرو مجھے اس وقت تمہاری سخت ضرورت ہے۔‘‘

’’کس سلسلے میں؟‘‘

’’یہ تم آؤ گی تو بتاؤں گا۔‘‘

’’سوری رابی! میں نہیں آ سکتی۔‘‘ میں نے چاہا کہ ریسیور رکھ دوں لیکن اس نے مجھے روک دیا۔

’’اچھا میری بات تو سُن لو۔‘‘

’’کہو۔‘‘

"ڈیزی اس روز تم مجھے نئی راہیں تلاش کرنے کا مشورہ دے رہی تھیں نا تو میں نے بہت سوچا بہت کوشش کی کہ اپنے لیے جینے کا کوئی سامان ڈھونڈ لوں لیکن ڈیزی ہزار کوشش کے باوجود میں اپنی سوچوں کے دھارے نہیں موڑ سکا۔"

"کیا مطلب؟"

"میری ہر سوچ پر تم اس طرح قابض ہو چکی ہو کہ میں چاہوں بھی تو تمہارے خیال کو اپنے دل سے نہیں کھرچ سکتا۔"

"رابی پلیز، مجھ سے ایسی باتیں مت کرو، میں فون بند کر رہی ہوں۔"

"نہیں ڈیزی، پلیز، میری پوری بات سُن لو۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں نے تمہاری خاطر اس دیوار کو پھلانگ لیا ہے، جو ہمارے درمیان جدائی کا سبب بنی ہوئی تھی۔"

"رابی!" میرے ہونٹ کانپ کر رہ گئے غیر ارادی طور پر میں نے اپنی ہتھیلی اپنے سامنے پھیلا دی جس پر ابھی کچھ دیر پہلے میری نندیں زریاب احمر کا نام لکھ کر گئی تھیں۔ چُپ چاپ کئی آنسو میری پلکوں کا بند توڑ کر زریاب احمر کے نام پر گرنے لگے۔

"ڈیزی! تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔" رابی نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" میں چونک کر بولی۔

"تو پھر کچھ کہو نا، کوئی ایسی بات جو مجھے یہ اطمینان بخش دے کہ تم میری ہو۔"

ارے کوئی ہے جو وقت کو ذرا پیچھے دھکیل دے کہ میں اپنی ہتھیلیوں سے زریاب احمر کا نام کھرچ کر رابی کا نام سجا دوں، اس نے جو ایک قدم میری طرف بڑھایا ہے۔ بدلے میں میں ساری مسافتیں پل میں طے کر کے اسے معتبر کر دوں۔

"ڈیزی! تم بولتی کیوں نہیں؟"

"اب میں اس سے کیسے کہہ دوں کہ رابی! تم نے دیر کر دی۔"

"ہیلو۔ ہیلو ڈیزی! تم سُن رہی ہونا؟" اس کے لہجے کی بے تابی میں تھوڑی پریشانی بھی سمٹ آئی۔

"ہاں سن رہی ہوں۔"

"تو پھر جواب کیوں نہیں دیتیں؟ دیکھو میں نے تمہاری خاطر اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے۔"

"میری خاطر۔" میں ایک بار پھر دوراہے پر آ کھڑی ہوئی۔

"ہاں ڈیزی! تمہاری خاطر۔"

"میرے خدا! میں کیا کروں؟" میرے آنسو اور شدت سے بہنے لگے تب اچانک روشنی کی کرن مجھے راستہ دکھا کر دوراہے سے نکال لے گئی۔

"کاش رابی! جو دیوار تم نے میری خاطر پھلانگی ہے، وہ اگر تم اس ہستی کی خاطر پھلانگ لیتے جو کائنات کے ذرے ذرے کی تقدیر اپنے ہاتھوں سے رقم کرتا ہے تب میں اپنے ہاتھوں سے زریاب احمر کا نام مٹا کر تمہارا نام سجانے میں فخر محسوس کرتی۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں رابی! آج تم نے میری خاطر میرا مذہب اپنا لیا ہے، کل تم کسی اور کی خاطر اس کا مذہب اپنا لو گے۔"

"پلیز ڈیزی! تمہیں اگر میرا ساتھ منظور نہیں تو صاف کہہ دو، یوں عذر مت تراشو۔" وہ چیخ پڑا۔

"میں عذر نہیں تراش رہی رابی! تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، ذرا سوچو تو جس نام کی مسلمانی کا تم نے مجھے طعنہ دیا تھا، کیا تم اپنے لیے پسند کرو گے؟"

"تو کیا میں اپنا نام بدل لوں؟"

"نام بدلنے سے کیا ہو گا، ہاں! راستہ ضرور بدل لو، جس پر چل کر تم خدا کو پہچان سکو اور جو قدم تم نے میری طرف بڑھایا ہے۔ اس کا رُخ خدا کی طرف موڑ لو یقین کرو تم دس قدم بڑھاؤ گے وہ سو قدم بڑھ کر تمہیں تھام لے گا۔"

"ڈیزی!" اس کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ "اس راہ میں اگر کبھی میرے قدم اُکھڑنے لگیں تو میں کیا کروں۔"

"خدا کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھنا رابی! وہ تمہارے قدم کبھی نہیں اُکھڑنے دے گا اور ہاں میں تمہارے لیے دعا کروں گی کہ جو روشنی کی کرن میرے رب نے تمہارے دل میں منور کی ہے۔ اسے تمہارے لیے وہ اتنا وسیع کر دے جو تمہارے اطراف پھیلے تمام اندھیاروں پر حاوی ہو کر تمہاری حیات کے سب راستوں کو درخشانی بخش دے

جس پر چل کر تم اسے پہچان سکو۔ یقین کرو، وہ بڑا مہربان ہے اپنی طرف رجوع کرنے والے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔''

''ڈیزی! اتنی اچھی اچھی باتیں کہاں سے سیکھیں تم نے؟''

میں اُسے جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ باہر گاڑیوں کے رُکنے کی آواز سن کر میں سمجھ گئی کہ سب لوگ زریاب احمر کو مہندی لگا کر واپس آ گئے ہیں۔ میں جلدی سے ریسیور رکھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

پھر یہ دو دن پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ میں عائشہ سے عائشہ زریاب بن گئی.....

میں حجلۂ عروسی میں ہر مشرقی لڑکی کی طرح گھٹنوں پہ چہرہ جھکائے پلکیں موندے بیٹھی تھی۔ دروازے پر شاید زریاب کی بہنیں ان کا راستہ روکے نیگ وصول کر رہی تھیں۔ ان کی شریر ہنسی اور احتجاج کرتی آوازیں اندر تک آ رہی تھیں۔ میں نے زرتار آنچل کو چہرے پر آگے تک کھینچ کر پیشانی گھٹنوں پر ٹکالی۔ پھر دروازے پر آہٹ سن کر میں سمجھ گئی کہ زریاب اندر آ رہے ہیں۔ ان کی بھاری قدموں کی دھمک میرے دل میں ارتعاش پیدا کرنے لگی۔ مسہری کے قریب آ کر وہ رُک گئے اور لمحہ بھر کو جیسے خاموشی چھا گئی۔

''میں نے کہا تھا نا کہ میں تمہیں ہر اُس راستے پر کھڑا نظر آؤں گا جہاں سے تمہارا گزر ہو گا۔''

اُف یہ آواز، یہ انداز، یہ لہجہ میں نے ایک جھٹکے سے اپنا آنچل اُلٹ دیا۔ سامنے وہ اپنی تمام تر وجاہتوں سمیت کھڑا تھا ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ سجائے۔

''رابی! یہ تم ہو؟'' میں حیرت سے بولی۔

''میرے علاوہ کوئی اور ہو سکتا تھا بھلا۔'' وہ شرارت سے کہتا ہوا میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''کیا تم بہت پہلے مسلمان ہو گئے تھے؟''

''بہت پہلے سے کیا مطلب، میں الحمد للہ پیدا ہی مسلمان ہوا تھا۔''

''تو پھر تم''

''یہ سب سوال جواب پھر کسی وقت کے لیے اُٹھا رکھو۔'' وہ میری بات کاٹ کر درمیان میں بول پڑا۔ ''اس وقت تو مجھے اپنے درشن کرنے دو۔''

''رابی پلیز، مجھے بتاؤ۔ یہ سب کیا ہے؟'' میں دبی دبی آواز میں چیخ پڑی۔

''کہا نا پھر کسی وقت۔''

''نہیں ابھی۔'' میں اَڑ گئی۔

''اصل میں ڈیزی پہلی بار جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو تم مجھے بہت اچھی لگی تھیں۔ لیکن تمہارا خالص مغربی انداز مجھے بالکل نہیں بھایا، لہٰذا مجھے شرارت سوجھی اور میں زریاب سے رابی بن گیا اور یہ تو ہم مسلمانوں کی خاص عادت ہوتی ہے کہ ہم کسی معاملے میں سیریس ہوں نہ ہوں لیکن اپنے مذہب کے معاملے میں بڑے سیریس ہوتے ہیں۔ اب دیکھو نا! میں تمہیں ڈیزی سے عائشہ بننے کے لیے کہتا تو تم مجھے بیک ورڈ، دقیانوسی اور جانے کیا کچھ کہتیں اور اس طرح رابی بن کر میرے ایک ہی جملے نے نہ صرف تمہیں بدل کر رکھ دیا بلکہ مجھے میرا آئیڈیل بھی مل گیا کہو کیسا رہا؟''

''اور جو اگر میں بھٹک جاتی تب؟''

''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے کہ ہم کتنے ہی گھور اندھیاروں میں کیوں نہ گھر جائیں ایک ننھی سی روشنی کی کرن ہمارے اندر کہیں موجود رہتی ہے اور جو کبھی ایسا کوئی وقت آتا ہے تو وہ روشنی کی کرن پھیلتے پھیلتے ہمارے گرد پھیلے اندھیاروں پر حاوی ہو جاتی ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہتے ہو؟''

''شاید نہیں یقیناً کیا تمہارے اندر ایسی کرن موجود نہ تھی؟''

''تھی جبھی تو میں نے اپنا راستہ آسانی سے پالیا۔''

''صرف راستہ ہی نہیں منزل بھی کہو۔'' وہ والہانہ انداز میں میرے ہاتھ تھامتا ہوا بولا۔

''اور ہاں پنکی نے بھی مجھے نہیں بتایا۔'' مجھے اچانک پنکی کا خیال آ گیا۔

''اسے میں نے منع کیا تھا۔''

''کل اس سے بھی نمٹ لوں گی۔''

''کل کی بات جانے دو، اب کی بات کرو۔'' وہ اپنی مقناطیسی آنکھیں مجھ پر جماتا ہوا کچھ اس طرح بولا کہ بارِ حیا سے میری پلکیں جھکتی چلی گئیں۔

عجب کھیل عشق کا

عجیب پاگل لڑکی ہے، خواہ مخواہ ایک اجنبی سے الجھنے کھڑی ہوگئی ہے۔ جبکہ غلطی بھی سراسر ہماری تھی۔ کس اطمینان سے بیچ سڑک پر یوں چل رہے تھے جیسے ہمارے باپ کی جاگیر ہو۔ اب اس طرف سے آنے والے کو کیا پتا پھر بیچارے نے موڑ کاٹنے سے پہلے ہارن بھی بجایا تھا۔

یہ الگ بات کہ ہم نے اپنی باتوں میں دھیان نہیں دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی گاڑی کی ٹکر کم، اپنے حواس کھونے سے زیادہ شائلہ دور جاگری۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ گاڑی بھگا لے جاتا۔ شامتِ اعمال اتر کر پوچھنے لگا۔

''آپ کو چوٹ تو نہیں آئی۔'' اور شائلہ اُف پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑگئی۔

''گاڑی چلانے کی تمیز نہیں ہے تو چلاتے کیوں ہیں اور یہ آپ جیسے اندھوں کو لائسنس دیتا کون ہے؟''

''دیکھیں مس! آپ زیادتی کر رہی ہیں غلطی سراسر آپ کی ہے۔'' شائلہ کے تیز بولنے کے باوجود اس نے نرمی سے ٹوکا جس پر شائلہ اور شیر ہوگئی۔

''میری کیا غلطی ہے۔ کیا میں جان بوجھ کر گاڑی کے سامنے آگئی تھی؟''

''آپ بیچ سڑک پر چل رہی تھیں۔'' اس نے ہماری غلطی کی نشاندہی کی جسے تسلیم کرتے ہوئے شائلہ ڈھٹائی سے بولی۔

''ہاں چل رہی تھی بیچ سڑک پر لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ ہمیں ٹکر

مار کر ہٹائیں۔ ہارن بجا سکتے تھے۔

''میں نے ہارن دیا تھا۔'' وہ زور دے کر بولا۔

''اور میں بہری ہوں کیا جو مجھے سنائی نہیں دیا؟''

اور مجھے اس اجنبی پر رحم آنے لگا جو شائلہ کی اتنی بدتمیزی کے باوجود اتنی عاجزی دکھا رہا تھا۔ میں نے وہیں سے اشارہ کر کے شائلہ کو اپنی طرف بلایا لیکن اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ تب مجبوراً مجھے آگے آنا پڑا اور اس کا بازو تھام کر میں نے قدرے سختی سے ٹوکا۔

''بس ختم کرو شائلہ'' اور اس عرصے میں پہلی بار اجنبی کی نظر مجھ پر پڑی۔ حیران ہو کر پوچھنے لگا۔

''آپ ان کے ساتھ ہیں؟'' میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور شائلہ کے بازوؤں میں چٹکی کاٹ کر سرگوشی میں بولی۔

''کیوں خود کو تماشا بنا رہی ہو؟ چلو۔'' اور غالباً شائلہ کو احساس ہوگیا پھر بھی اسے جتا کر بولی۔

''اس کے کہنے پر معاف کر رہی ہوں۔''

''تھینکس گاڈ۔'' وہ اطمینان کا سانس لے کر بولا۔ ''کسی کی بات تو آپ کی سمجھ میں آئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' شائلہ پھر تیز ہوئی تو وہ فوراً بولا۔

''کوئی مطلب نہیں۔'' پھر ایک دم میری آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگا۔ ''شکریہ، آپ کا احسان یاد رکھوں گا۔''

''بڑے آئے احسان یاد رکھنے والے ہونہہ۔'' شائلہ نے اسے دیکھ کر سر جھٹکا تو میں جلدی سے اس کا بازو کھینچ کر کنارے لے آئی۔

''بس اَب چپ چاپ چلو، خبردار ایک لفظ بھی کہا تو۔''

''اچھا میرا بازو تو چھوڑو اور دیکھو میری چیزیں سلامت ہیں کہ نہیں۔'' شائلہ میری گرفت سے اپنا بازو چھڑا کر شاپر میں جھانکنا چاہتی تھی کہ میں نے اسے آگے دھکیل دیا۔ کیونکہ مجھے خدشہ تھا کہ اس کی کسی ایک چیز کو بھی نقصان پہنچا ہوگا تو وہ پھر اس سے

لڑنے کھڑی ہو جائے گی۔

"تمہیں جلدی کس بات کی ہے؟" میرے دھکیلنے اور تیز قدم اٹھانے پر وہ جھنجھلا کر بولی اور میں جواب میں کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ وہ گاڑی ہمارے قریب لا کر بولا۔

"او کے پھر ملاقات ہو گی۔" اس کے ساتھ ہی گاڑی بھگا لے گیا۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ جبکہ شائلہ جواب دینے کا موقع نہ ملنے پر تلملانے لگی۔ گھر آ کر بھی وہ اسی بات کو پیٹ رہی تھی۔

"ذرا دیر رُک جاتا۔ ایمان سے وہ مزہ چکھاتی کہ زندگی بھر یاد رکھتا۔"

"میرا خیال ہے جو کچھ تم نے اُس کے ساتھ کیا ہے اسے وہ بھی نہیں بھولے گا۔" میں نے کہا تو وہ جوش سے بولی۔
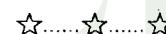
"ارے یہ تو کچھ بھی نہیں میں تو ایسے لوگوں کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتی ہوں۔"

"مجھے پتا ہے لیکن اس بیچارے کو تم نے ناحق لتاڑا کیونکہ غلطی ہماری تھی۔" میں نے بالکل غیر جانبداری سے کہا۔

"اوہو بیچارہ۔ ذرا اِدھر دیکھو میری طرف۔"

"غلط مطلب نہیں لو، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ اور بس اب یہ موضوع ختم۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے باز رکھا تو وہ میرے ہی انداز میں انگلی اٹھا کر بولی۔

"ہاں خبردار۔ اب کوئی اس بیچارے کا نام نہیں لے گا۔" اور میں بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روک پائی تھی۔

☆......☆......☆

شائلہ اور میری دوستی کی عمر بھی اتنی ہی تھی جتنی ہم دونوں کی۔ ساتھ ساتھ گھر ہونے کے باعث ہمارا شروع ہی سے ہر وقت کا ساتھ تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ کوئی بھائی بھی نہیں تھا۔ اس لیے اس کا زیادہ وقت ہمارے گھر گزرتا اور جب اس کی

امی اسے بلاتیں تو وہ مجھے اپنے ساتھ لے جاتی تھی۔

اسکول میں بھی ہم ساتھ داخل ہوئیں اور کالج میں بھی۔ ہمارا خیال تھا ہم انٹر کے بعد یونیورسٹی جوائن کریں گے لیکن اس سے پہلے ہی شائلہ کے ابو کا سیالکوٹ ٹرانسفر ہو گیا۔ وہ ایک سیمی گورنمنٹ ادارے میں ملازم تھے۔ میں نے اور شائلہ نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مجھ سے اتنی دور چلی جائے گی۔ اس وقت ہم دونوں کا ہی رو رو کر برا حال تھا۔ اس کی امی اسے بہلا بہلا کر تھک گئیں کہ وہ ہر سال چھٹیوں میں اسے کراچی لے آیا کریں گی، اور میرے گھر میں امی آپی اور بڑے بھیا بھی مجھے ایسے ہی بہلا رہے تھے۔

"بھئی سیالکوٹ کون سا دور ہے تم جب کہو گی میں تمہیں لے جاؤں گا۔" بڑے بھیا نے مجھے بہت یقین دلایا تھا۔

بہر حال یہ سب بہلاوے تھے۔ دو سال ہو گئے تھے شائلہ کو سیالکوٹ گئے ہوئے نہ تو اُس کی امی چھٹیوں میں اسے لے کر آئیں نہ بڑے بھیا مجھے سیالکوٹ لے کر گئے۔

گزشتہ سال آپی کی شادی پر مجھے یقین تھا کہ شائلہ ضرور آئے گی اور وہ آنا بھی چاہتی تھی۔ لیکن اتفاق سے انہی دنوں اُس کی امی بیمار ہو گئیں تھیں۔ بہر حال ہمارے درمیان خط و کتابت باقاعدگی سے جاری تھی۔ جس سے ہماری دوستی اب بھی اسی طرح قائم تھی۔

اور جب میں بی اے کے امتحانوں سے فارغ ہوئی تو شائلہ اچانک اپنے امی ابو کے ساتھ آ گئی اور میں جو فراغت کے تصور سے ہی پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی آمد پر بے انتہا خوش ہو گئی۔ اصل میں اس کے امی ابو عمرہ کرنے جا رہے تھے اور وہ ضد کر کے ان کے ساتھ آئی تھی کہ اتنے دن وہ میرے ساتھ رہے گی، سچ مچ میری تو عید ہو گئی تھی۔ پوری رات ہماری باتیں کرتے گزر جاتی اور دن میں کسی پرانی دوست سے ملنے کا پروگرام بنتا۔ یا ساحل پر جانے کا یا پھر شاپنگ۔ آج بھی ہم شاپنگ کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں یہ واقعہ پیش آیا۔ اور اس وقت سے تو شائلہ مان نہیں رہی تھی۔ رات میں اچانک جانے کیا خیال آیا کہنے لگی۔

"سنو، غلطی واقعی ہماری تھی۔ میں نے خواہ مخواہ اسے اتنا برا بھلا کہہ دیا۔"

"کسے؟" میں فوری طور پر سمجھی نہیں اور وہ شرارت سے آنکھیں نچا کر بولی۔

"اس بیچارے گاڑی والے کو۔"

"اوہو بیچارا۔ ذرا میری طرف دیکھو۔" میں نے اسی کی بات دہرائی لیکن پھر خود ہی سٹپٹا گئی۔ کیونکہ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی اور وہ بھی معنی خیز مسکراہٹ اور نظروں سے۔

"تمہارا مطلب کیا ہے؟" مجھے غصہ آ گیا۔

"لو میں نے تم سے کچھ کہا ہے؟"

"ایسے دیکھو بھی مت ورنہ۔" میں نے تکیہ اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارا۔ پھر کتنی دیر تک ہمارے درمیان تکیوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔

ان دنوں امی، بڑے بھیا کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی تھیں۔ یوں تو آپی کی شادی کے بعد سے ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن درمیان میں وقفہ آ جاتا کیونکہ بڑے بھیا ہر لڑکی میں کوئی نہ کوئی نقص نکال دیتے جس سے امی کا جوش سرد پڑ جاتا اور تنگ آ کر وہ بڑے بھیا پر چھوڑ دیتیں کہ وہ خود ہی جب کسی لڑکی کو پسند کریں گے تب امی بات آگے چلائیں گی اور بڑے بھیا پتا نہیں کیا سوچے ہوئے تھے۔ نہ خود پسند کرتے، اور ہماری پسند کو بھی ریجیکٹ کر دیتے۔ بہر حال ان دنوں امی کو پھر سے بھیا کی شادی کے لیے فکر مند دیکھ کر مجھے شائلہ کا خیال آیا۔ اگر بھیا راضی ہو جائیں تو شائلہ ہمیشہ اس گھر میں رہ سکتی تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں اسی وقت بھیا کے کمرے میں پہنچ گئی۔ یقیناً اس وقت میرا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ جبھی بھیا مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"لگتا ہے، تمہارے بانڈ پر انعام نکل آیا ہے۔ کتنے لاکھ کا ہے۔"

"کوئی بانڈ وانڈ نہیں نکلا۔ بس ابھی ابھی مجھے ایک خیال آیا ہے اگر آپ میرے خیال سے متفق ہو جائیں تو۔" میں نے تجسس پیدا کرنے کی خاطر بات ادھوری چھوڑ دی۔ تو بھیا اونچے ہو کر بیڈ کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے۔

"گویا تمہاری خوشی کا دارومدار میرے متفق ہونے پر ہے اور اگر میں متفق نہ ہوا تو؟"

"نہیں بھائی ایسی بات نہیں کریں۔" میں نے پہلے ہی سے خوشامد شروع کر دی

تو وہ ہنس کر بولے۔

"اپنا خیال تو بتاؤ!"

"وہ آپ کے لیے شائلہ کیسی رہے گی، میرا مطلب ہے" میں شوق سے اپنی مطلب واضح کرنے لگی تھی کہ بھیا نے سختی سے ٹوک دیا۔

"سمیعہ!"

"آپ میری پوری بات تو سُنیں!"

"شٹ اَپ، جاؤ اپنا کام کرو۔" بھیا کے ڈانٹنے پر میں کچھ ڈر کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور جانے لگی کہ بھیا...... میرا ہاتھ پکڑ کر پھر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہنے لگے۔

"بہت غلط بات کہی تم نے سمیعہ! شائلہ تمہاری دوست ہے اور میں نے اسے ہمیشہ تمہاری طرح ہی سمجھا۔ تمہیں اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔"

"اس میں کوئی برائی تو نہیں ہے۔" میں نے منہ پھلا کر کہا۔

"پھر بھی میں مناسب نہیں سمجھتا اور دیکھ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ موڈ ٹھیک کرو اور جاؤ کھیلو۔" بھیا نے یوں کہا جیسے میں کوئی چھوٹی سی بچی ہوں۔ میں ہنستی ہوئی ان کے کمرے سے نکل کر آئی تو شائلہ پر نظر پڑی۔ وہ ریلنگ پر جھکی نیچے دیکھ رہی تھی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" میں نے اس کے قریب آ کر کہا تو وہ چونکتی ہوئی پوچھنے لگی۔

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟"

"کہیں نہیں، بھیا کے کمرے میں تھی۔ چلو نیچے چلتے ہیں۔"

"صرف نیچے نہیں کہیں باہر چلو۔ میں بور ہو رہی ہوں۔" وہ ریلنگ چھوڑ کر میری کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولی۔

"امی سے تم اجازت لو۔ مجھے تو ڈانٹیں گی۔" میں نے اس کے ساتھ نیچے آتے ہوئے کہا تو وہ فوراً مجھے چھوڑ کر امی کے پاس چلی گئی اور ان سے آپی کے گھر جانے کی اجازت لے کر آئی تھی۔

پھر آپی کے گھر ہم صرف پندرہ منٹ بیٹھیں۔ وہ بیچاری روکتی رہ گئیں کہ رات کے کھانے تک رُک جاؤ۔ اس کے بعد وہ اور دولہا بھائی خود ہمیں گھر چھوڑ آئیں گے اور

میں بھی رکنا چاہتی تھی لیکن شمائلہ جانے کیا سوچ کر آئی تھی۔ آپی کے اتنے اصرار پر ان
کے گلے میں بانہیں ڈال کر لجاجت سے بولی۔

''پلیز آپی! مائنڈ نہیں کریں۔ ہم پھر آئیں گے۔''

''اس وقت کہیں اور جانا ہے کیا؟'' بالآخر آپی سمجھ گئیں اور میں منع کرنا چاہتی
تھی لیکن شمائلہ فوراً بول پڑی۔

''جی آپی! وہ ہماری دوست صبیحہ ہے ناں اُس سے ملنے جانا ہے لیکن آپ خالہ
جان کو نہیں بتایئے گا کیونکہ انہوں نے صرف آپ کے ہاں آنے کی اجازت دی ہے۔''

''ہاں مجھے پتا چلا ہے کہ تم دونوں بہت آوارہ گردی کرنے لگی ہو۔'' آپی نے کہا
تو میں چیخ پڑی۔

''اُف آوارہ گردی۔ کوئی اچھا لفظ استعمال کریں آپی!''

''اس کا متبادل اچھا لفظ تم ہی بتا دو۔''

''وہ کیا کہتے ہیں؟'' میں نے شمائلہ کو دیکھا تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی۔

''راستے میں سوچ لینا۔ اچھا آپی ہم چلتے ہیں۔'' وہ آپی کو خدا حافظ کہہ کر مجھے
اسی طرح کھینچتے ہوئے باہر لے آئی۔

''یہ صبیحہ کون ہے؟'' بس اسٹاپ پر آ کر میں نے اچانک یاد آنے پر اس سے
پوچھا۔ تبھی وین آ کر رکی تو وہ میری بات نظر انداز کر کے وین میں سوار ہو گئی، اور مجھے بھی
جلدی چڑھنے کا اشارہ کیا۔ وین کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، جبھی راستے میں مجھے اس سے بات
کرنے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ ساحل کے قریب اُترتے ہی میں اس پر چڑھ دوڑی۔

''ابھی پرسوں ہی تو ہم یہاں آئے تھے۔ تمہارا دل نہیں بھرا۔ اگر امی کو معلوم
ہو گیا تو!''

''میں تو نہیں بتاؤں گی۔'' میرے بگڑنے کا نوٹس لیے بغیر وہ لہروں کی شوخیاں
دیکھتی ہوئی لاپروائی سے بولی تو میں نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ اُس پر
کچھ اثر نہیں ہونا تھا۔

''چند دنوں کی بات ہے، پھر تو میں چلی جاؤں گی۔'' میری خاموشی محسوس کر کے

کہنے لگی۔ ''اور پتا ہے سمیعہ! مجھے تمہارے ساتھ گزرے یہ سارے لمحات بہت شدت سے یاد
آتے ہیں کبھی کبھی تو میں رو پڑتی ہوں اور کبھی ابو سے بہت ضد کرتی ہوں کہ دوبارہ کراچی
ٹرانسفر کروالیں۔ لیکن اب امی نہیں مانتیں کیونکہ وہاں میری خالہ اور ماموں وغیرہ ہیں۔''

''ظاہر ہے اب وہ اپنے بہن بھائیوں کے قریب رہنا چاہتی ہوں گی۔''

''ہاں لیکن مجھے وہاں بالکل اچھا نہیں لگتا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میرے دن
کتنے بور گزرتے ہیں کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے اُڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں۔'' اس کی اتنی
محبت پر میری آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔

''مجھے پتا ہے شمائلہ کیونکہ میں خود تمہاری دوری کو شدت سے محسوس کرتی ہوں۔''
میری آواز کے بوجھل پن نے اسے چونکا دیا پھر میری لبریز آنکھیں دیکھ کر وہ ایک دم
میرے گلے لگ گئی۔

''خبردار رونا نہیں۔'' اس کی پیار بھری وارننگ پر میں ہنس پڑی۔

''میں رو نہیں رہی اور پلیز مجھے چھوڑو، سب لوگ متوجہ ہو رہے ہیں۔''

''ہونے دو۔'' اس نے پہلے زور سے مجھے بھینچا پھر الگ ہوئی۔

''توبہ تم نے تو میری ہڈیاں چٹخا دیں۔'' میں نے گہری سانس سینے کے اندر
اتارتے ہوئے کہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر گیلی ریت پر چلنے لگی، باتوں میں وقت گزرنے کا پتا
ہی نہیں چلا پھر پہلے مجھے ہی احساس ہوا شام اتر رہی تھی اور ہم دونوں اکیلے تھے جب میں
نے اسے احساس دلایا تو وہ بھی پریشان ہو گئی۔

''بس اب فوراً چلو اور دعا کرو یہیں سے وین مل جائے ورنہ اتنی دور چلنا پڑے
گا۔ کچھ دیر پہلے جتنا اچھا لگ رہا تھا، اب اتنا ہی ڈر لگنے لگا تھا۔ تیز تیز چلتے ہوئے میں
نے کئی بار پیچھے مُڑ کر دیکھا دور دور تک وین کا نام و نشان نہیں تھا۔

''پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں قسمت میں ڈانٹ لکھی جا چکی ہے لہٰذا اب
آرام سے چلو۔'' اس نے کہا تو مجھے غصہ آ گیا۔

''تمہیں کیا فکر تم تو صاف بچ جاؤ گی۔''

''نہیں تمہارے حصے کی مار میں کھالوں گی، یہ میرا وعدہ ہے۔ اب خدا کے لیے

ذرا دم لو، میرا سانس پھول گیا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے قدم روک لیے اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ تبھی ایک گاڑی ہمارے بالکل قریب سے گزری ہم دونوں اُچھل کر پیچھے ہٹیں اور سنبھلی بھی نہیں تھیں کہ وہی گاڑی ریورس ہو کر پھر ہمارے قریب آن رکی اور اس میں بیٹھا اس روز والا شخص شیشے میں سے سر نکال کر بولا۔

''ارے آپ دونوں وہی ہیں ناں!'' اُف میری تو جان نکل گئی جبکہ شمائلہ اُسے دیکھتے ہی تیز ہو کر بولی۔

''ابھی تک آپ کو گاڑی چلانی نہیں آئی۔''

''سیکھ رہا ہوں۔'' وہ ڈھٹائی سے کہہ کر ہنسا اور میں نے شمائلہ کے بازو میں چٹکی کاٹ کر سرگوشی میں اسے چلنے کو کہا تو وہ سمجھ کر فوراً کہنے لگا۔

''آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔''

''فی الحال ہمارا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔'' شمائلہ اسے جواب دے کر میرے ساتھ چل پڑی تو وہ بھی گاڑی ہمارے ساتھ ساتھ چلانے کے ساتھ مسلسل اصرار کرنے لگا۔ کہ وہ ہمیں چھوڑ دے گا۔

''کیا حرج ہے بلکہ اچھا ہے جلدی پہنچ جائیں گے۔'' شمائلہ نے قدم روک کر مجھ سے کہا تو میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ شکل سے شریف آدمی نظر آ رہا ہے۔'' اور ہمارے رکنے پر ہی وہ سمجھ گیا تھا جبھی فوراً فرنٹ ڈور کھول دیا۔

''فکر مت کرو میں سنبھال لوں گی سب۔'' شمائلہ نے مجھے اطمینان دلانے کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں آہستہ سے بولی۔

''میں اس کے ساتھ نہیں بیٹھوں گی۔''

''اچھا پیچھے مرو۔'' وہ مجھے دھکیل کر خود اس کے برابر بیٹھ گئی۔

''شکریہ!'' وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوا بولا۔

''جی نہیں۔ شکریہ ہمیں آپ کا ادا کرنا ہے اگر زندہ سلامت منزلِ مقصود پر پہنچ گئے تب۔'' شمائلہ ذرا بھی نروس نہیں تھی۔

''خیر اَب اتنا اناڑی بھی نہیں ہوں میں۔ خصوصاً خواتین کی موجودگی میں تو بہت محتاط ڈرائیونگ کرتا ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔ اب ذرا اسپیڈ بڑھا دیں تاکہ ہم آج کی تاریخ میں گھر پہنچ سکیں۔'' شمائلہ نے بڑی خوبصورتی سے اُسے احساس دلایا جس پر وہ محظوظ ہو کر ذرا سا ہنسا پھر اسپیڈ بڑھاتا ہوا پوچھنے لگا۔

''کس طرف جانا ہے آپ کو؟''

''فی الحال سیدھے چلتے جائیں آگے میں راستہ بتا دوں گی۔''

''چلیے راستہ تو بتائیں گی۔ اب نام بھی بتا دیجیے اور یہ کہ کیا کرتی ہیں آپ؟''

اس نے شمائلہ سے پوچھتے ہوئے بیک ویو مرر میں ایک اچٹتی نظر مجھ پر ڈالی تو میں اپنی جگہ کچھ اور سمٹ گئی۔ گو کہ میں کوئی دبو قسم کی لڑکی نہیں تھی لیکن پتا نہیں کیوں کسی بھی غیر مرد سے بات کرتے ہوئے میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ ابھی بھی میں یہی سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ کہیں وہ مجھے مخاطب نہ کرے۔

''نام بتانا ضروری ہے کیا؟'' شمائلہ نے اُلٹا اس سے پوچھا تو وہ ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔

''کوئی ضروری نہیں۔'' پھر قدرے توقف سے کہنے لگا۔

''ویسے مجھے ابرار احمد کہتے ہیں۔ غمِ روزگار کے سلسلے میں کویت میں مقیم ہوں آج کل چھٹی پر آیا ہوا ہوں۔''

''یقیناً شادی کرنے آئے ہوں گے؟'' جواب نہیں تھا اس لڑکی کا، اس نے بھی بے ساختہ سراہا۔

''بہت ذہین ہیں آپ؟''

''شکریہ!'' شمائلہ نے گردن اکڑانے کے ساتھ پلٹ کر مجھے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو سن لو، اور اس کے پلٹ کر دیکھنے پر ہی غالباً اسے میری موجودگی کا احساس ہوا تو اس سے پوچھنے لگا۔

''یہ آپ کی سسٹر ہیں؟''

"آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"

"اعتراض کیوں ہوگا البتہ حیرت ہو رہی ہے کہ آپ سے بہت مختلف ہیں۔ یعنی بہت کم گو لگ رہی ہیں۔" میرے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اس نے مرر میں پھر ایک نظر مجھے دیکھا تو یکبارگی میرا دل بڑی زور سے دھڑکا۔ تبھی شمائلہ مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہنے لگی۔

"پہلے یہ ایسی کم گو نہیں تھی۔ اصل میں اس کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔ بہت دکھی ہے بیچاری۔"

"کیا ہوا ہے؟" اس نے ایک دم سنجیدہ ہو کر ہمدردی سے پوچھا تو شمائلہ درد ناک لہجے بولی۔

"اس کے میاں نے اسے چھوڑ دیا ہے اور زیادہ دُکھ کی بات یہ ہے کہ بچہ بھی چھین لیا۔"

"الو کی پٹھی۔" میں اپنی جگہ تلملا کر رہ گئی۔ جبکہ وہ تاسف کا اظہار کرتا ہوا کہنے لگا۔

"بہت افسوس ہوا۔ کون تھا میرا مطلب ہے آپ لوگوں نے دیکھ بھال کر شادی نہیں کی تھی۔"

"لیجیے، آج کل کسی کا پتا چلتا ہے۔ دیکھنے میں اتنا شریف اور ایماندار لگتا تھا۔ آپ سے بھی زیادہ۔" وہ اتنی معصوم بن کر بولی کہ مجھے اپنی بے ساختہ ہنسی روکنی مشکل ہو گئی اور پتا نہیں وہ سمجھا نہیں یا قصداً نظر انداز کر گیا قدرے توقف سے پوچھنے لگا۔

"اب یہ کیا کر رہی ہیں؟"

"کچھ کرنے کے قابل ہو تو کرے۔ ہر وقت تو روتی رہتی ہے۔ ابھی بھی میں اسے بہلانے کی خاطر یہاں لے کر آئی تھی۔"

"آپ ان سے چھوٹی ہیں؟"

"بڑی لگتی ہوں کیا؟" شاید وہ اسے عاجز کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ وہ سچ مچ سٹپٹا کر بولا۔

"نہیں۔"

"پھر پوچھا کیوں؟"

"غلطی ہو گئی۔"

"چلیے معاف کیا اور دیکھیں، یہاں سے بائیں جانب موڑ دیں۔" وہ احتیاط سے موڑ کاٹنے کے بعد بار بار مرر میں مجھے دیکھنے لگا۔ میں سمجھ گئی میرے ساتھ ہونے والی ٹریجڈی پر اسے افسوس ہو رہا تھا جبکہ مجھے ہنسی آ رہی تھی جسے اس سے چھپانے کی خاطر میں شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ اور جیسے ہی شمائلہ نے گھر کے سامنے گاڑی رکوائی۔ میں جلدی سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر نیچے اُتر گئی۔ اس نے شمائلہ سے جانے کیا کہا پھر ایک دم میری طرف منہ کر کے کہنے لگا۔

"سنیں! آپ کے ساتھ جو ہوا اسے بھلانا آسان تو نہیں ہے لیکن کوشش کریں اور اس بات کا یقین رکھیں کہ زندگی میں آپ کو بہت خوشیاں ملیں گی۔"

"میرے خدا" میں اپنی جگہ گم صم کھڑی رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

شمائلہ کی امی ابو عمرہ سے واپس آئے تو ہمارے بہت اصرار پر صرف دو دن ہمارے ہاں قیام کیا۔ اس کے بعد شمائلہ کو لے کر سیالکوٹ چلے گئے اور ظاہر ہے شمائلہ کو جانا ہی تھا۔ میں ایک بار پھر اکیلی ہو گئی بلکہ اب تو اپنا گھر ہی سونا لگنے لگا تھا۔ کیونکہ اتنے دن وہ یہیں میرے ساتھ رہی تھی۔ حقیقتاً اس کے دم سے بڑی رونق تھی اب تو امی بھی اس کے جانے کو محسوس کر رہی تھیں۔ اٹھتے بیٹھتے اسی کی باتیں کرتیں۔ اس روز وہ اسے یاد کر رہی تھیں تو میرے منہ سے نکل گیا۔

"بھیا مان جاتے تو شمائلہ ہمیشہ یہیں رہ سکتی تھی۔"

"کیا مطلب؟" امی نے چونک کر مجھ سے پوچھا تب میں نے انہیں ساری بات بتا دی کہ میں نے بھیا سے شمائلہ سے شادی کرنے کو کہا تھا لیکن وہ نہیں مانے۔

"تمہارے بھیا کا تو دماغ خراب ہے اب بتاؤ بھلا شمائلہ میں کیا کمی ہے۔"

میری پوری بات سن کر امی بھیا پر ناراضگی کا اظہار کرنے لگیں، تبھی اتفاق سے بھیا آ گئے۔ صورتِ حال سے بے خبر امی ہی سے پوچھنے لگے۔

"کیا ہوا امی! کیوں خفا ہو رہی ہیں؟" امی بس انہیں دیکھ کر اور ہڑ بڑا کر رہ گئیں تب انہوں نے اشارے سے مجھ سے پوچھا تو میں نے بڑے آرام سے کہہ دیا۔

"امی آپ پر خفا ہو رہی ہیں۔ یعنی آپ کے شادی نہ کرنے پر۔"

"اس کا مطلب ہے پھر کوئی لڑکی امی کو پسند آ گئی ہے۔" بھیا نے کن اکھیوں سے امی کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر مجھ سے کہا تو میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"شمائلہ!" پھر فوراً ہی میں نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اور خائف سی ہو کر بھیا کو دیکھنے لگی کہ ابھی وہ ڈانٹیں گے لیکن پتا نہیں کیا ہوا۔ بھیا ایک دم خاموش ہو گئے اور رکے بھی نہیں، فوراً اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں اندر ہی اندر سہم کر رہ گئی۔ یقیناً اب وہ میری ٹھیک ٹھاک کلاس لیں گے۔ اسی خیال کے تحت میں ان سے چھپتی پھری۔

صبح جب تک وہ آفس نہ چلے جاتے میں خود کو کچن میں ہی مصروف رکھتی اور شام میں اُن کی آمد پر بھی اِدھر اُدھر ہو جاتی۔ لیکن آخر کب تک اس رات کھانے کے بعد میں ابھی اپنے کمرے میں آئی ہی تھی کہ بھیا بھی میرے پیچھے چلے آئے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے میں بول پڑی۔

"بھیا! ایمان سے میں نے امی سے کچھ نہیں ہا تھا۔ وہ خود ہی۔"

"کیا نہیں کہا تھا تم نے؟" بھیا کے انجان بننے پر میں سٹپٹا گئی۔

"وہ میرا مطلب ہے، شمائلہ کی بات میں نے نہیں چھیڑی تھی۔"

"لیکن مجھ سے تو پہلے تم نے کہا تھا۔" بھیا میرے بیڈ پر بیٹھتے ہی سرسری انداز میں بولے تو مجھ سے کچھ جواب نہیں بن پڑا۔ لیکن میں قدرے اطمینان سے ہو گئی کیونکہ بھیا کے کسی انداز سے غصہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے بھی پھر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔

"تو تم شمائلہ کو اس گھر میں لانا چاہتی ہو، لیکن اس سے بھی تم نے پوچھا ہے کہ آیا وہ آنا چاہتی ہے کہ نہیں؟"

ہائیں! یہ بھیا کیا کہہ رہے تھے مجھ پر سچ مچ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ فوری طور پر کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ تب بھیا اُٹھ کر میرے قریب آئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"سنو، پہلے اس سے معلوم کرو اگر وہ خوشی سے راضی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" پھر جاتے جاتے رُک کر بولے۔

"اور سنو! ابھی امی کو بلکہ کسی کو کچھ مت بتانا۔ او کے۔" میرا دل اچانک خوشی سے بے قابو ہو گیا تھا اور کوئی نعرہ ہونٹوں تک آیا چاہتا تھا کہ بھیا کی بات پر مجھے ضبط کا دامن تھام کر اثبات میں سر ہلانا پڑا۔ بھیا مطمئن ہو کر کمرے سے نکل گئے۔ تب میں چھلانگ لگا کر اپنے بیڈ پر چڑھ گئی۔ میرا دل ناچنے گانے کو چاہ رہا تھا۔ ظاہر ہے دوہری خوشی ملی تھی۔ ایک تو بھیا کا شادی کے لیے ہامی بھرنا۔ دوسرے شمائلہ ہمیشہ کے لیے یہیں آ جائے گی۔ کتنی دیر تک میں اس وقت کا تصور کر کے خوش ہوتی رہی، پھر شمائلہ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ کاش شمائلہ کی یہاں موجودگی میں ہی بھیا میرے خیال سے متفق ہو جاتے تو مجھے اسے چھیڑنے میں کتنا مزہ آتا۔

اگلے دن شام میں آپی کے گھر جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ اسی وقت کچھ مہمان آ گئے، جب امی نے آ کر مجھے جانے سے منع کیا اور چائے بنانے کے لیے کہا تو میں سخت جھنجھلائی۔ کیونکہ بھیا اتنی مشکل سے لے جانے پر تیار ہوئے تھے۔

"مہمانوں کو بھی اسی وقت آنا تھا۔" میں بُڑبڑاتی ہوئی کچن میں آ کر چائے بنانے لگی۔ کچھ دیر بعد امی آئیں اور جب انہوں نے مجھے ڈھنگ سے چائے بنانے اور ٹرالی میں لوازمات سجانے کو کہا تب میں کچھ ٹھٹھک گئی۔ یعنی یہ کوئی عام مہمان نہیں تھے۔ پھر امی کی بوکھلاہٹ نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا۔ اس کے بعد جہاں میرا فطری تجسس جاگ اٹھا وہاں گھبراہٹ بھی ہونے لگی تھی۔ کیونکہ بھیا کی موجودگی میں مہمانوں کے سامنے جانا بہت مشکل لگ رہا تھا۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ امی خود ہی آ کر چائے وغیرہ لے گئیں تب میں چُپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔

کافی دیر بعد غالباً رخصت ہوتے وقت وہ خواتین امی کے ساتھ میرے کمرے

میں آئیں تو انہیں دیکھ میں اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ اُنہوں نے بھی بس کھڑے کھڑے میرا نام پوچھا اور یہ کہ میں کیا کرتی ہوں؟ پھر کچھ تعریفی جملے ساتھ ہی خوشی کا اظہار بھی تھا میں کیونکہ سر جھکائے کھڑی تھی اس لیے ان کے تاثرات نہیں دیکھ سکی۔ پھر جیسے ہی وہ امی کے ساتھ کمرے سے نکل کر گئیں، میں کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ یہاں سے میں ان خواتین کو جاتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی لیکن ان سے پہلے ڈرائنگ روم سے نکل کر بھیا کے ساتھ جو شخص نظر آیا اسے دیکھ میں اُچھل پڑی۔

''ابرار احمد!'' میرے ہونٹوں تک یہ نام آیا تھا کہ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھ لیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے قریب کہیں اس کی سرگوشی سنائی دی۔

''سنیں! آپ کے ساتھ جو ہوا اسے بھلانا آسان تو نہیں ہے لیکن کوشش کریں اور اس بات کا یقین رکھیں کہ زندگی میں آپ کو بہت خوشیاں ملیں گی۔''

اور شاید میرے ساتھ ہونے والی نام نہاد ٹریجڈی نے اسے متاثر کیا تھا جو آپ خود ہی خوشیوں کا پیامبر بن کر چلا آیا تھا اور میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ وہ مجھے اوّل روز ہی اچھا لگا تھا البتہ اس وقت اسے دیکھ کر میرے دل میں ہلچل مچ گئی تھی۔

اگلے روز امی نے آپی کو بلوا بھیجا اور جو کچھ ان سے کہا وہ آ کر مجھ سے کہنے لگیں۔

''سنو، کل تمہارے لیے جو پرپوزل آیا تھا تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' میں خاموشی سے آپی کو دیکھنے لگی۔ تو وہ میرا ہاتھ دبا کر بولیں۔

''اصل میں لڑکا کویت سے آیا ہوا ہے اور اس کی چھٹی بھی بس ایک مہینے کی رہ گئی ہے، اس لیے انہوں نے فوراً جواب مانگا ہے۔ امی اور بھیا دونوں کو لڑکا پسند آیا ہے، اب تم جلدی سے اپنا خیال بتاؤ تاکہ۔'' آپی نے بات ادھوری چھوڑ کر شرارت سے میری کمر میں چٹکی کاٹی تو میرے ہونٹ آپ ہی آپ شرگیں مسکراہٹ کی گرفت میں آ گئے۔ اس کے بعد ظاہر ہے آپی کو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس رات میں بہت دیر تک جاگتی رہی اور جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ خصوصاً یہ تصور بڑا دلکش تھا کہ ابرار احمد کو جب معلوم ہوگا کہ میرے ساتھ کوئی ٹریجڈی نہیں ہوئی وہ

محض شمائلہ کا مذاق تھا۔ اور ظاہر ہے یہ سب میں ہی اسے بتاؤں گی۔ شمائلہ تو یہاں تھی نہیں اور اتنی جلدی اس کی آمد ممکن بھی نہیں تھی۔ پھر اب تو امی کو جانا تھا بھیا کا پرپوزل لے کر۔ کیونکہ میں اسے خط لکھ چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وہ بھیا کو ناپسند نہیں کرتی۔ بہر حال مجھے افسوس اس بات کا تھا کہ وہ میری شادی میں شرکت نہیں کر سکتی تھی کیونکہ سب کچھ آناً فاناً طے ہو گیا تھا۔ امی بھیا اور آپی کو تو ایک لمحے کی فرصت نہیں تھی۔ ظاہر ہے اتنے کم وقت میں تیاری آسان نہیں تھی پھر بھی اپنے طور پر بھیا نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کا کہنا تھا کہ میری کون سی اور بہنیں بیٹھی ہیں۔ یوں تیاری میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا اور میں سنہرے سجیلے خوابوں کو پلکوں کی اوٹ میں چھپائے ابرار احمد کی سیج پر آ بیٹھی۔ یہاں بہت ہنگامہ تھا۔ ابرار کی بہنیں اور کزنز ان سے نیگ وصول کرنے میں بہت شور مچا رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے میری ساس نے آ کر سب کو خاموش کر دیا پھر انہیں اپنے ساتھ لے گئیں تو ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔ لیکن مجھے بالکل احساس نہیں ہوا کیونکہ میں اپنی دھڑکنیں شمار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

''جناب!'' کچھ دیر بعد ان کی شوخی سے بھرپور آواز سنائی دی تو میرا جھکا ہوا سر مزید جھک کر گھٹنوں سے جا لگا۔

''ارے۔'' وہ میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''یہ سب نہیں چلے گا داد دینی پڑے گی کہ آپ نے تو اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔ البتہ گھر دکھانے کی غلطی کر گئی تھیں۔ اس کا مطلب ہے ہر عقلمند شخص تھوڑا بیوقوف ضرور ہوتا ہے۔ اب بتائیے پہلے آپ کی عقلمندی کو سلام کروں یا؟''

''بے وقوفی کو!'' میں دھیرے سے بولی تو انہوں نے دلکش ہنسی کے ساتھ میرا چہرا اونچا کیا اور جانے کیا ہوا کہ فوراً ہی وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئے میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور ابھی کچھ سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ سناٹے کے عالم میں بولے۔

''آپ؟ اور وہ کون تھی؟''

منتظرِ کرم

عجیب لڑکی تھی وہ سونیا شہزاد علی۔ انتہائی بدتمیز، بدلحاظ اور ڈھیٹ، چھوٹے بڑے...... کا ادب نہ لحاظ اور کسی کا کہنا ماننا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ہمیشہ اپنی من مانی کرتی، کوئی کسی بات کو منع کرتا تو وہی کرنا جیسے اس پر فرض ہو جاتا...... اور خاص طور سے چڑا کر کرتی کہ منع کرنے والا یقیناً اپنی سبکی محسوس کرتا ہوگا، اور اب تو یہ عالم تھا کہ سب نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور وہ اَب بھی خوش نہیں تھی۔

کوئی روکتا نہیں کوئی ٹوکتا نہیں آخر کیوں؟ وہ سوچتی اور پھر باقاعدہ پلاننگ کے تحت سب کو تنگ کرنے کے منصوبے بنانے لگتی۔ پتا نہیں وہ کیا چاہتی تھی۔ سب کے نزدیک تو وہ بدتمیز تھی۔ لیکن اسے لگتا جیسے اس کے اندر کوئی بے چین روح سما گئی ہو، جو اسے کبھی آرام سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ کبھی تائی اماں کی غیر موجودگی میں ان کے کمرے کا حشر نشر کرتی اور کبھی اس کا رُخ چھوٹی چچی کے پورشن کی طرف ہوتا البتہ ابو کے کمرے میں وہ خود سے کبھی نہیں گئی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ ان سے خائف تھی یا ان کا کہنا مانتی تھی۔ وہ تو ابو جی کی دوسری چہیتی بیوی سے بھی نہیں ڈرتی تھی، پھر بھی پتا نہیں کیوں اس اتنے بڑے گھر اور اتنے سارے لوگوں میں وہ صرف ابو جی اور ان کی چہیتی بیوی کو نظر انداز کرتی تھی۔ شاید وہ خفا تھی یا پھر اپنے نظر انداز کیے جانے کا بدلہ لے رہی تھی۔ آخر ابو جی بھی تو اسے نظر انداز کرکے اپنی نئی دنیا میں مگن ہو گئے تھے۔ اس وقت جب وہ چھوٹی تھی۔ شعور نہیں رکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ سب اس کی طرف متوجہ ہوں خاص طور سے ابو جی، اور کسی

نے بھی اسے قابلِ توجہ نہیں سمجھا تھا اور پھر توجہ حاصل کرنے کے لیے ہی اس نے عجیب و غریب حرکتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔

جب وہ چھوٹی تھی تو اس وقت توجہ حاصل کرنے کے لیے چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیتی۔ کسی بھی معمولی سی بات پر یا پھر خود سے گر کر اپنے آپ کو چوٹ لگا لیتی۔ اور سب ہی اس کی طرف لپکتے تھے۔ ایسے میں وہ بہت خوشی محسوس کرتی، جب سب اپنے اپنے بچوں کو چھوڑ کر اس کی دلجوئی کر رہے ہوتے، لیکن ایسا بہت دیر تک نہیں ہوتا تھا جب وہ چپ ہو جاتی تو آہستہ آہستہ سب اس کے پاس سے ہٹ جاتے تھے، اور پھر جب وہ بڑی ہوگئی، تو ایک بار اس کے گلا پھاڑ کر رونے پر اس کے تمام کزنز نے اس کا مذاق اُڑایا تھا۔ تب اسے اپنی اس عادت کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنا پڑا۔ لیکن وہ توجہ حاصل کرنے کی خواہش کو خیر باد نہیں کہہ سکی تھی۔ جبھی تو نئے طریقوں پر عمل کرنے لگی تھی۔

شروع میں سب اس کی اس تبدیلی پر حیران ہوئے تھے کہ یہ اچانک اسے کیا ہو گیا ہے وہ تو کبھی کسی کی بات ٹالتی نہیں تھی اور نہ کبھی کسی کو پلٹ کر جواب دیا۔ پھر اب وہ ایسا کیوں کرنے لگی ہے، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا پہلے پہل اس کی بدتمیزیوں پر سب نے اسے آرام سے سمجھانے کی کوشش کی، اس کے بعد ڈانٹنے لگے۔ اور آخر میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اب وہ تھی اور اس کی من مانیاں۔

''اس پر کسی جن کا سایہ ہوگیا ہے۔'' یہ فوزیہ اور فرزانہ کا خیال تھا۔

''دماغ کا کوئی اسکرو ڈھیلا ہوگیا ہے۔'' تیمور یقین سے کہتا اور آصف اس کی ہاں میں ہاں ملاتا۔

''بالکل ایک دو شاک لگ جائیں، ٹھیک ہو جائے گی۔''

''مجھے تو نفسیاتی کیس لگتی ہے۔'' ثمینہ سنجیدگی سے کہتی، اور وہ کیونکہ نفسیات میں ایم اے کر رہی تھی، اس لیے سب اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے ہنستے کہ اسے اب ہر کوئی نفسیاتی کیس لگا کرے گا۔

اور وہ سونیا شہزاد علی بے خبر نہیں تھی۔ جانتی تھی کہ سب اس کے بارے میں کیسی باتیں کرنے لگے ہیں۔ پھر بھی اس نے پروا نہیں کی۔

اس کا بی اے کا رزلٹ نکلا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اچھے نمبروں سے پاس ہوئی۔
سب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ یونیورسٹی جوائن کرے، اور اس کی اپنی بھی خواہش تھی انگلش
میں ماسٹر کرنے کی بلکہ اس نے بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ لیکن اب جو سب نے یہ
مشورہ دیا تو وہ محض سب کی بات رد کرنے کی غرض سے کہنے لگی۔

''نہیں بھئی، مجھے یونیورسٹی جوائن نہیں کرنی۔''

''کیوں؟'' فوزیہ نے حیرت سے پوچھا۔ شاید اس لیے کہ وہ دو ایک بار ان
کے سامنے انگلش میں ماسٹر کرنے کی خواہش کا اظہار کر چکی تھی۔

''بس'' وہ اکتا کر بولی۔ 'آگے پڑھنے کی نہ تو خواہش ہے اور نہ پڑھائی میں
دل لگتا ہے۔''

''پھر کیا کرو گی گھر بیٹھ کر؟'' فرزانہ کے پوچھنے پر اس سے پہلے ہی تیمور بول پڑا۔

''گھر داری سیکھے گی، جس کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔''

''جی نہیں۔'' وہ تڑک کر بولی۔ ''مجھے کوئی شوق نہیں ہے چولہا ہانڈی کرنے کا۔''

''اس میں شوق کو قطعی دخل نہیں ہے۔ یہ تو کرنا پڑے گا خواہ ایم اے کر لو یا پی
ایچ ڈی۔'' آصف نے چھیڑا تو برا سامنہ کر بنا کر بولی۔

''ہونہہ! تمہارے کہنے سے؟''

''میرے کہنے سے نہ سہی۔ کسی کے کہنے سے تو کرو گی ہی۔''

''افوہ بھئی، تم کیا بحث لے کر بیٹھ گئے۔'' ثمینہ نے ٹوکا پھر اس سے کہنے لگی۔

''ہاں سونیا! تم بتاؤ، تمہارے کیا ارادے ہیں؟''

''میں جاب کروں گی۔'' وہ اطمینان سے بولی جبکہ باقی سب ہائیں کی آواز
کے ساتھ اس کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے اس نے کوئی بہت ہی انہونی بات کہہ دی ہو
اور انہونی تو اس نے کہی تھی کیونکہ اس گھر میں لڑکیوں کو اس بات کی اجازت نہیں تھی۔

''کیا بات ہے! تم سب اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو؟'' وہ دل ہی دل میں
سب کے پوری جان سے متوجہ ہونے پر محظوظ ہو کر بولی۔

''ابھی تم نے کیا کہا ہے؟ ذرا پھر سے کہنا'' آصف کو شاید اپنی سماعتوں پر شبہ ہوا

تھا۔

''کوئی مشکل زبان تو استعمال نہیں کی میں نے بہت آسان سی زبان میں کہا ہے
کہ میں جاب کروں گی۔'' وہ اسی اطمینان سے لفظوں کو ذرا چبا چبا کر بولی۔

''یہ خیال دل سے نکال دو۔'' فوزیہ نے فوراً مفت مشورہ دیا۔

''کیوں؟''

''اس لیے کہ اجازت نہیں ملے گی۔''

''کون منع کرے گا؟''

''سب ہی اور میرا خیال ہے تمہارے ابو جی تو لڑکیوں کی جاب کے سخت خلاف
ہیں۔'' ثمینہ نے جیسے اس کی معلومات میں اضافہ کیا اور وہ خاموش ہو کر ناخنوں سے پالش
کھرچنے لگی تھی اس وقت سب نے یہی سمجھا کہ وہ اپنے اس ارادے سے باز آ چکی ہے۔
لیکن اسی رات وہ ایک طویل مدت کے بعد خود سے ابو جی کے کمرے میں گئی اور بغیر تمہید
باندھے کہنے لگی۔

''ابو جی! میرا بی اے کا رزلٹ آ گیا ہے، اور اب میرا ارادہ جاب کرنے کا
ہے۔''

''تمہیں جاب کی کیا ضرورت ہے؟'' ابو جی کا لہجہ سپاٹ تھا اور نظریں بھی ہر قسم
کے تاثر سے عاری اس کے چہرے پر جمی تھیں۔

''بات ضرورت کی نہیں، میرے شوق کی ہے۔''

''کیا فضول شوق ہے، میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''اجازت تو آپ کو دینی پڑے گی ابو جی! اس لیے کہ میں اپنے شوق سے
دستبردار نہیں ہو سکتی۔''

''سونیا!'' ابو جی نے سخت لہجہ اختیار کیا ہی تھا کہ برابر بیٹھی ان کی چہیتی بیوی
نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر روک دیا۔

''آرام سے شہزاد علی!'' پھر اس سے کہنے لگیں۔

''سونیا! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔'' وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

"جاؤ۔ اپنے کمرے میں، میں تمہارے ابو سے بات کروں گی۔" انہوں نے دوبارہ زور دے کر کہا تو وہ اَڑ گئی۔

"سوری! مجھے آپ کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ابو جی سے بات کر سکتی ہوں۔"

اس کی یہ بات اور لہجہ ایک سوتیلی ماں کے لیے یقیناً ناقابل برداشت تھا۔ لیکن مقابل ایک جہاندیدہ عورت تھی، جو اس کی امی کی زندگی ہی میں ان کی جگہ لیے بیٹھی تھی۔ لیکن اس مقام اور مرتبے سے محروم تھی جو ایک عورت کو ماں بن کر حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی بات پر اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

"تم یقیناً خود مجھ سے بات کر سکتی ہو، لیکن اس موضوع پر میں کوئی بات نہیں سنوں گا۔" ابو جی اپنی چہیتی بیوی کی سبکی محسوس کر کے کہنے لگے۔

"اور مجھے...... اس کے علاوہ اور کسی موضوع پر بات نہیں کرنی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"میری پڑھائی ختم ہو چکی ہے، اور میں بیکار گھر میں بیٹھنا نہیں چاہتی۔"

"بی اے کے بعد...... پڑھائی ختم نہیں ہو جاتی تم مزید پڑھ سکتی ہو۔"

"میں آگے پڑھنا نہیں چاہتی۔"

"پھر تم کیا چاہتی ہو؟" ابو جی کی آواز اونچی ہو گئی۔

"جاب کرنا چاہتی ہوں۔" وہ ذرا بھی خائف نہیں ہوئی۔

"دیکھو سونیا! اگر تمہیں اپنے جیب خرچ میں کمی محسوس ہوتی ہے تو میں مزید بڑھا دیتا ہوں۔"

"مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔" وہ فوراً بولی "بس آپ مجھے جاب کرنے کی اجازت دیں۔"

"مان جاؤ شہزاد علی! دے دو اسے اجازت۔" ان کی چہیتی بیوی سلمیٰ نے ایک ادا سے کہا اور شہزاد علی مان گئے۔

اسے خوش ہونا چاہیے تھا کہ جس بات کو سب انہونی سمجھ رہے تھے، وہ اس نے

کر دکھائی تھی۔ لیکن وہ خوش نہیں تھی۔ دل پر بوجھ لیے اپنے کمرے میں آ گئی کہ ابو جی نے سلمیٰ بیگم کو اس پر فوقیت دی تھی۔

"دے دو اسے اجازت۔"

اس نے دانت پیس کر سلمیٰ بیگم کی نقل اُتاری تو اچانک احساس ہوا جیسے سلمیٰ بیگم نے ابو جی سے اس کے کاسے میں خیرات ڈالنے کو کہا ہو۔ اس کے اندر آگ سی بھڑک اُٹھی۔ دل چاہا ابھی اسی وقت سب کچھ چھوڑ کر چلی جائے، اس عورت کے پاس جو اس کی ماں تھی۔ اسے جنم دینے کی سزاوار اور اس سے پوچھے کہ وہ جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ کیوں نہ لیتی گئی۔ اس در پر کیوں چھوڑ دیا۔ جہاں نہ کوئی اس کی سنتا ہے، اور نہ کوئی متوجہ ہوتا ہے، لیکن وہ نہیں جا سکتی تھی، کیونکہ ابو جی کی طرح وہ عورت بھی اپنی نئی دنیا میں مگن ہو چکی تھی اور پھر یہاں اب نہیں تو کبھی نہ کبھی اس کی اہمیت تسلیم کی جا سکتی تھی۔ کیونکہ سلمیٰ بیگم سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی جبکہ امی کے گھر میں وہ کبھی بھی جگہ نہیں بنا سکتی تھی۔ کہ ان کے موجودہ شوہر کی پہلی اولاد کے علاوہ امی سے بھی ان کی تین اولادیں تھیں۔ اس لیے وہ امی سے کبھی کبھی ملنے تو چلی جاتی تھی لیکن وہاں رہنے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

صبح ناشتے کی ٹیبل پر سلمیٰ بیگم خاص طور سے اپنی اہمیت جتاتے ہوئے سب کے سامنے اس سے کہنے لگیں۔

"سونیا! میں نے تمہارے ابو سے بات کر لی ہے۔ وہ خود تمہیں کوئی اچھی جاب دلا دیں گے۔"

"لیکن میں نے تو جاب کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

"کیوں رات تو تم بضد تھیں؟"

"رات گئی بات گئی۔" وہ گرم چائے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اُتار کر کھڑی ہو گئی، اور کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے سنا سلمیٰ بیگم کہہ رہی تھیں۔

"عجیب پاگل لڑکی ہے۔ رات تو اپنی بات پر اَڑی ہوئی تھی اور اب۔"

اپنے کمرے میں آ کر وہ نئے سرے سے اپنے بارے میں سوچنے لگی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ ماسٹر کرنے کا خیال محض کزنز کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا اور جاب کا ارادہ سلمیٰ بیگم کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑا۔ اگر اسی طرح وہ سب کی باتیں رَد کرتی گئی تو کچھ بھی نہیں کر سکے گی اور فارغ گھر بیٹھنا اسے کسی طرح بھی منظور نہیں تھا۔ اس نے سوچا وہ اب کسی کو کچھ نہیں بتائے گی، خود ہی اپنے لیے کوئی راہ منتخب کر کے بہت خاموشی سے اس پر چل پڑے گی۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر فوزیہ، فرزانہ اور ثمینہ اس کے کمرے میں چلی آئیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ تینوں ضرور آئیں گی، اور اس سے اتنا اچھا موقع گنوانے کے بارے میں باز پرس کریں گی، اس لیے اپنے آپ کو ان کے سوالوں کے لیے تیار کر چکی تھی۔

''ایمان سے سونیا! تم انتہائی احمق لڑکی ہو۔'' فوزیہ بیڈ پر اس کے برابر بیٹھتے ہو شروع ہو گئیں۔

''جب تمہیں جاب کی اجازت مل ہی گئی ہے تو اب تم منع کیوں کر رہی ہو؟'' وہ خاموش رہی۔

''تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو ایمان سے اجازت ملنے پر اس وقت خوشی سے چھلانگیں لگا رہی ہوتی۔''

''اور کیا!'' فرزانہ بھی فوزیہ کی تائید کرنے لگی۔ ''کتنا اچھا لگتا صبح آفس جاتے ٹھاٹ سے کرسی پر بیٹھتے، نہ ہانڈی روٹی کی فکر نہ جھاڑو پوچھے کی اور پھر نئے نئے لوگوں سے ملنا بھی ہوتا۔'' اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''آخر تم اس سنہری موقع سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتیں؟'' ثمینہ اس کی خاموشی سے قدرے چڑ کر پوچھنے لگی۔

''بس میرا ارادہ بدل گیا ہے۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

''تو اب کیا ارادہ ہے؟''

''ابھی کچھ سوچا نہیں۔'' اس نے لاپروائی کا مظاہرہ کیا۔

''سنو، کہیں تم گھر بیٹھ کر کسی اچھے پروپوزل کا انتظار تو نہیں کرنا چاہتیں؟'' وہ

ہنس پڑی۔

''پروپوزل کا انتظار کیا صرف گھر بیٹھ کر ہی کیا جا سکتا ہے؟''

''تم واقعی بہت عجیب لڑکی ہو۔ سمجھ میں نہ آنے والی اکثر اپنی کسی نہ کسی بات سے ہم سب کو چونکا دیتی ہو۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تمہارے توسط سے یہاں کوئی تبدیلی آنے والی ہے لیکن تم...'' فوزیہ برا سا منہ بنا کر خاموش ہو گئی تو فرزانہ کہنے لگی۔

''اور متوقع تبدیلی تمہاری حماقت کی نذر ہو جاتی ہے۔''

''کس قسم کی تبدیلی چاہتی ہو تم لوگ؟'' وہ ان کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''کوئی سی بھی۔ بس تبدیلی ہونی چاہیے۔ بچپن سے ایک ہی طرح کی روٹین ہے اب تو اکتاہٹ ہونے لگی ہے۔''

''بھئی اگر تم لوگ کوئی تبدیلی چاہتی ہو تو اس سلسلے میں خود کوشش کرو۔ مجھ پر تکیہ کیوں کر رہی ہو، میرے موڈ کا تو تمہیں پتا ہی ہے ہر پل بدلتا رہتا ہے۔''

''آخر ٹھہراؤ کیوں نہیں ہے تمہارے مزاج میں؟''

''پتا نہیں۔''

وہ کندھے جھٹک کر بولی۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا کہ وہ تینوں نہ صرف اس کی طرف متوجہ تھیں بلکہ مسلسل اس کی ذات کو موضوع بنائے ہوئے تھیں، یوں جیسے وہ کوئی بہت بڑی ہستی ہو اور وہ تینوں اس کا انٹرویو کر رہی ہوں۔ ان کے لہجے میں اشتیاق تھا اور یہ امید بھی کہ وہ کوئی انقلاب لے آئے گی، اس گھر، اس شہر اور پھر اس پورے ملک میں۔

''ایسا کرو سونیا!'' ثمینہ چمکتی آنکھوں کے ساتھ اسے کسی بات پر اکسانا چاہتی تھی کہ اسی وقت تائی اماں بڑی عجلت میں کمرے میں داخل ہوئیں۔

''تم سب یہاں ہو؟''

''کیا ہوا امی!'' فوزیہ ان کی پھولی سانسوں سے پریشان ہو کر پوچھنے لگی۔

''ابھی نوشیرواں کا فون آیا ہے، وہ شام کی فلائیٹ سے آ رہا ہے۔''

''کیا؟'' سب ایک ساتھ چیخیں۔ ''سچ مچ نوشیرواں آ رہے ہیں۔''

"ہاں، اور اب تم سب اُٹھو پہلے اس کا کمرہ ٹھیک کرو پھر۔"

تائی اماں کی مزید ہدایات سنے بغیر وہ تینوں ایک ہی جست میں بیڈ سے اتر اور تقریباً بھاگتی ہوئی اس کے کمرے سے نکلتی چلی گئیں اس نے ناگواری سے ان سب جاتے ہوئے دیکھا پھر تائی اماں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"تم بھی چلو۔" تائی اماں کے کہنے پر انجان بن کر بولی۔

"کہاں؟"

"اتنا کام ہے سب کا ہاتھ بٹا دو۔"

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔"

کسی بھی کام سے انکار کرنا اس کی عادت بن گئی تھی۔ اس لیے سر درد کا بہانہ کر کے لیٹ گئی۔ ویسے بھی اسے اس وقت تائی اماں کا آنا اور نوشیرواں کی آمد کی اطلاع سخت بری لگی تھی۔ کتنے مزے سے وہ سب کے درمیان لیڈر بنی بیٹھی تھی۔ اپنی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا کہ سب اس کی طرف متوجہ ہیں۔ اور مسلسل اس کی ذات پر گفتگو کر رہی ہیں۔ اور تائی اماں نے آ کر سارا مزا خراب کر دیا باقی کسر ان کے فرزند ارجمند پوری کریں گے۔

"نوشیرواں!" اس نے تلخی سے سوچا۔ "اب یقیناً وہ بہت دنوں تک سب کے درمیان راجہ اندر بنے رہیں گے اور میری کوئی بھی بات، کام، خواہ انقلاب لانے والا ہی کیوں نہ ہو، کسی کی نظر میں نہیں آئے گا۔"

"کیا میں پسِ منظر میں چلی جاؤں گی ہمیشہ کی طرح۔"

وہ تکیے میں منہ چھپا کر سوچنے لگی۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے، میں جب بھی کسی بات سے سب کو چونکاتی ہوں سب کی توجہ کھینچتی ہوں تو کوئی اور کیوں درمیان میں آ جاتا ہے؟"

نوشیرواں کو بھی اسی وقت آنا تھا۔" وہ تکیے پر مکا مار کر بڑبڑائی۔

نوشیرواں، تایا ابا کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔

چار سال پہلے وہ ایف آر سی ایس کرنے امریکہ گئے تھے۔ اس وقت وہ میٹرک

میں پڑھتی تھی۔ اور انہی دنوں اس نے سب کی توجہ حاصل کرنے کے لیے عجیب وغریب حرکتیں کرنی شروع کی تھیں۔ اسے یاد آیا نوشیرواں نے جاتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

"تم بہت اچھی لڑکی ہو سونیا! تمہیں کسی کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔"

"میں کہاں کسی کو تنگ کرتی ہوں؟"

وہ ایک دم معصوم بن گئی تھی۔ اور نوشیرواں نے ہنستے ہوئے اس کے سر کو ہلکے سے تھپتھپا دیا تھا۔ اس وقت اس کا دل چاہا تھا، وہ نوشیرواں کی بات مان لے اور کسی کو بھی تنگ نہ کیا کرے۔ ان کے جانے کے بعد کچھ دنوں تک اس نے واقعی کوئی حرکت نہیں کی تھی، جس سے دوسرے بیزار ہوتے یا عاجز آتے۔ لیکن پھر بہت جلد وہ نوشیرواں سے کیا وعدہ بھول گئی تھی۔ اور اب پورے چار سال بعد نوشیرواں آ رہے تھے اور ان گزرتے ماہ و سال نے اس کی عادتوں کو پختہ کر دیا تھا وہ کسی طرح بھی دوسروں کو چڑانے سے باز نہیں رہ سکتی تھی۔

دوپہر تک وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی۔ دوپہر کے کھانے پر پتا نہیں جان بوجھ کر اسے نہیں بلایا گیا یا سب نوشیرواں کے آنے کی خوشی میں اسے بھول گئے تھے۔ وہ اگر صبح ڈھنگ سے ناشتا کیے ہوتی تو اس وقت کبھی بھی خود سے نہ نکلتی، لیکن بھوک کی وجہ سے اسے کمرے سے نکلنا پڑا۔

ڈائننگ روم میں چلی آئی تو معلوم ہوا سب کھانا کھا چکے ہیں۔ وہ حیران ہوتی ہوئی خود ہی کھانا نکالنے کی غرض سے کچن میں آئی تو تینوں لڑکیاں یہیں موجود تھیں۔ اور تائی اماں ان کے سر پر کھڑی ہدایات جاری کر رہی تھیں اس کے آنے کا کسی نے نوٹس ہی نہیں لیا۔ سب اپنے اپنے کام میں یوں مصروف رہیں جیسے ذرا سی بے توجہی سے سارا کام خراب ہو جائے گا۔

"امی! دیکھیے کباب اتنا بڑا ٹھیک ہے؟"

"تائی اماں! اس میں چینی کتنی ڈالوں۔"

"تائی اماں بریانی کا مصالحہ دیکھ لیجیے۔"

اور تائی اماں سب کے کام دیکھنے کے بعد جاتے ہوئے بولیں۔

''بس لڑکیو! نمک کا خیال رکھنا۔ نوشیرواں تیز نمک بالکل پسند نہیں کرتا ذرا سا بھی تیز ہو جائے تو کھانا چھوڑ دیتا ہے۔''

اس نے تائی اماں کے جانے کا انتظار کیا پھر آگے آتی ہوئی بولی۔

''لاؤ، میں چکھ کر دیکھوں، نمک تیز تو نہیں ہے۔'' اس نے قیمے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فوزیہ نے ڈونگا پیچھے کھینچ لیا۔

''خبردار ہاتھ مت لگانا۔''

''کیوں؟''

''میں چکھ چکی ہوں، نمک بالکل ٹھیک ہے اور اب سب سے پہلے بھائی جان چکھیں گے۔''

''اچھا'' وہ کھسیا کر ہنسی اور اپنے لیے کھانا گرم کرنے لگی۔

پھر کھانا نکال کر وہیں بیٹھ کر کھانے لگی۔ اس دوران وہ تینوں مسلسل نوشیرواں کی باتیں کرتی رہیں...... دو ایک بار اس نے انہیں متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن کسی نے توجہ نہیں دی، تب کھانا ختم کرتے ہی وہ دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ کچھ دیر تک جھنجلاتی رہی پھر سو گئی۔

شام میں سو کر اٹھی تو غیر معمولی خاموشی کا احساس ہوا۔ اسے کچھ اچنبھا ہوا کہ اس وقت تو خاصی ہلچل ہونی چاہیے تھی۔ فوراً منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی۔ ملازم سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ سب لوگ نوشیراوں کو لینے ایئر پورٹ گئے ہیں۔ اسے حیرت کے ساتھ ساتھ دُکھ بھی ہوا کہ اسے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ بے حد آزردہ سی ہو کر دوبارہ اپنے کمرے میں جانے لگی تھی کہ ابو جی کو آتے دیکھ کر وہیں رُک گئی۔ وہ شاید ابھی آفس سے آ رہے تھے، اس کے قریب آتے ہی پوچھنے لگے۔

''سب لوگ کہاں ہیں؟''

''ایئر پورٹ گئے ہیں۔''

''خیریت؟''

''جی۔ وہ نوشیرواں آ رہے ہیں انہیں لینے گئے ہیں۔''

''اچھا!'' ابو جی نے خوشگوار حیرت کا اظہار کیا پھر اس سے پوچھنے لگے۔ ''تم نہیں گئیں؟''

''جی مجھے کسی نے کہا ہی نہیں۔'' شاید زندگی میں پہلی بار وہ شکوہ کر رہی تھی۔

''کیا مطلب؟''

''میں سو رہی تھی کسی نے مجھے اٹھایا نہیں ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا۔'' اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔

''کم آن بیٹا! کسی کو یاد نہیں رہا ہو گا۔''

''یاد نہیں رہا ہوگا۔ کیا میں ایسی فالتو شے ہوں کہ جو سامنے رکھی رہے تو بھولے بھٹکے نظر پڑ جائے اور جو نظروں سے اوجھل ہو جائے تو کبھی خیال ہی نہ آئے۔''

دل کا درد پوری طرح آنکھوں میں سمٹ آیا تھا اور آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں ناکام ہو کر اس نے چہرہ ہاتھوں میں چُھپا لیا۔

''روتے نہیں بیٹا! چلو میں تمہیں لے چلتا ہوں۔'' ابو جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''میں نہیں جاؤں گی۔'' عادت سے مجبور تھی۔ فوراً انکار کر دیا۔

''اچھا چلو، ہم یہیں بیٹھ کر ان کا انتظار کرتے ہیں۔ اب خوش۔''

اس نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

''میں جب تک لباس تبدیل کر لوں۔ تم چائے بنا لاؤ۔''

ابو جی اپنے کمرے میں چلے گئے، تو وہ کچن کی طرف آ گئی، اسے ابو جی کے رویے اور مہربان لہجے پر حیرت ہو رہی تھی، لیکن اس کی حیرت زیادہ دیر تک نہیں رہی کیونکہ وہ جان گئی تھی کہ اس وقت ان کی چہیتی بیوی موجود نہیں ہیں۔ اس لیے وہ مہربان ہو رہے ہیں۔ اسے دکھ ہوا کہ وہ شخص جو اس کا باپ ہے ایک عورت کے ہاتھوں کس قدر بے بس ہے کہ اپنی اکلوتی اولاد سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔

بے دلی سے چائے بناتے ہوئے اس نے یونہی اِدھر اُدھر دیکھا اور بریانی کے مسالے پر نظر پڑتے ہی اسے دوپہر میں اپنا نظر انداز کیا جانا یاد آیا اور نظر انداز تو وہ اب

بھی کی گئی تھی۔

''گولڈن چانس!'' اس نے سوچا اور جلدی سے چائے چھوڑ کر نمک کا ڈبہ اُٹھا لائی پھر اس نے کسی چیز کو نہیں چھوڑا۔

''نمک تیز ہو جائے تو نوشیرواں کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔''

تائی اماں کی نقل اتارتے ہوئے، اس نے ہر شے میں بے حساب نمک ملایا۔ وہ بھی اتنی مہارت سے کہ کسی کو شبہ نہ ہو، پھر جلدی سے ہاتھ دھو کر صاف کیے اور چائے لے کر کچن سے نکل آئی۔ ابو جی برآمدے ہی میں بیٹھے مل گوے۔ وہ بھی ان کے پاس بیٹھ گئی اور ابھی انہوں نے چائے ختم کی ہی تھی کہ سب لوگ آ گئے۔ گھر میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ نوشیرواں ابو جی سے مل کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تو قدرے حیرت سے کہنے لگے۔

''ارے تم سونیا! میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم بھی یہاں ہو گی۔''

''قابلِ معافی'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی پھر بھی انہوں نے سن لیا فوراً کہنے لگی۔

''کیا مطلب؟''

''چار سال خاصا طویل عرصہ ہے نوشیرواں! اس عرصے میں اگر آپ مجھے بھول گئے تو کوئی کمال نہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ یہاں رہتے ہوئے لوگ مجھے بھول جاتے ہیں۔''

''اچھا!'' وہ ہلکے سے مسکرائے، پھر اس کی طرف جھک کر سرگوشی میں بولے۔

''حالانکہ تم بھولنے والی شے تو نہیں ہو۔'' اس کی دھڑکنوں نے اچانک رنگ بدل لیے۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھا اور پھر ان کے قریب سے نکل کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ سب شاید وہیں برآمدے میں بیٹھ گئے تھے کہ باتوں کی آواز اندر تک آ رہی تھی پھر جب کھانے کا شور اُٹھا اور سب ڈائننگ روم کی طرف جانے لگے تو اسے یاد آیا وہ کھانے کے ساتھ کیا کر چکی ہے۔ لحہ بھر کو افسوس ہوا لیکن پھر اس خیال نے گرفت مضبوط کر لی کہ نوشیرواں کی وجہ سے وہ بری طرح نظر انداز کی گئی ہے۔ اور پھر وہ کمرے میں بیٹھی نہیں رہی آخر اسے دیکھنا بھی تو تھا کہ کھانا کھاتے ہوئے سب کی شکلیں کیسی بنتی ہیں۔ بہت اطمینان سے سب کے ساتھ جا بیٹھی۔

''بھائی جان! یہ کباب میں نے بنائے ہیں۔'' فوزیہ نے فخریہ کبابوں کی پلیٹ

نوشیرواں کی طرف بڑھائی۔

''بریانی میں نے پکائی ہے۔'' ثمینہ نے ڈش آگے بڑھائی۔

''یہ کوفتے دیکھیں۔'' فرزانہ نے ڈونگا اُٹھایا اور نوشیرواں نے مسکرا کر پلیٹ میں تھوڑی سی بریانی نکالی۔ فوزیہ کی پلیٹ سے کباب نکال کر رکھا اور فرزانہ کے ہاتھ سے ڈونگا لے لیا۔ وہ بظاہر بہت انجان بنی بیٹھی تھی نظریں بھی جھکی تھیں لیکن اس کا روم روم ان کی طرف متوجہ تھا۔

''اوں ہوں۔'' نوشیرواں کی آواز پر وہ ایک دم سر اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ برا سا منہ بنائے بیٹھے تھے اور ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔

''بھئی، نمک بہت تیز ہے، جلا کر رکھ دی ہے ہر چیز۔''

اس کے ساتھ ہی کرسی دھکیل کر کھڑی ہو گئی اور اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا وہ تیز قدموں سے ڈائننگ روم سے نکل آئی اب اسے بالکل پروا نہیں تھی، اس کے پیچھے سب کیا باتیں کرتے ہیں یا کھانے کا مسئلہ کیسے حل کیا جاتا ہے۔ وہ اپنا بدلہ لے کر مطمئن ہو گئی تھی۔

رات میں جب وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی، اس وقت فوزیہ اسے بلانے آ گئی۔

''کہاں؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''ہال کمرے میں چلو، ہم سب بھائی جان سے اپنے تحفے وصول کریں گے۔''

''کیا میرے لیے بھی کوئی تحفہ لائے ہوں گے؟''

''ظاہر ہے جب ہم سب کے لیے ہیں تو تمہارے لیے کیوں نہیں لائے ہوں گے۔''

''چھوڑو، میں تو انہیں یاد نہیں تھی۔''

''بھئی انہوں نے خود مجھے بھیجا ہے کہ تمہیں بلا لاؤں۔''

''نوشیرواں نے؟'' اسے شاید یقین نہیں آیا۔

''ہاں اور اب پلیز جلدی چلو، وہاں سب بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔''

فوزیہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی تو وہ کچھ سوچتی ہوئی اس کے ساتھ چل پڑی۔ ہال کمرے میں سب کزنز جمع تھے، اسے دیکھتے ہی تیمور کہنے لگا۔

''بھئی، جلدی آؤ تم دونوں، شاید تمہیں دیکھ کر نوشیرواں کو سوٹ کیس کے لاک

کا نمبر یاد آ جائے؟''

''کیا مطلب؟'' وہ فرزانہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ اس کے پاس نیچے قالین پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''بھئی، یہ سوٹ کیس دیکھ رہی ہو، اس میں ہم سب کے گفٹس ہیں، بقول نوشیرواں کے اور اس کے لاک کا نمبر موصوف بھول گئے ہیں۔''

''میں بالکل نہیں بھولا۔'' نوشیرواں، تیمور کی بات پر محظوظ ہو کر بولے۔

''لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ''

''میں یونہی مذاق کر رہا تھا۔'' انہوں نے ٹوکا۔ ''اصل میں ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اب یہ دونوں آ گئی ہیں تو کھول دیتا ہوں، لیکن' وہ باری باری آصف اور تیمور کی طرف دیکھنے لگے۔

''لیکن کیا؟''

''جھپٹنا نہیں ہے، میں خود سب کے تحائف دوں گا۔''

''اگر آپ اسی طرح ہمارے صبر کا امتحان لیتے رہے تو ہم تحفہ کی حسرت لیے فوت ہو جائیں گے'' آصف نے آہ بھر کر کہا تو وہ ہنستے ہوئے لاک کھولنے لگے، پھر انہوں نے خود سب کو تحفے دیے اور اس کی باری آئی تو کہنے لگے۔

''ارے سونیا! تمہیں تو غالباً میں بھول گیا تھا۔'' وہ کچھ نہیں بولی۔ بہت خاموشی سے ان کی طرف دیکھے گئی۔

''چلو ایسا کرتے ہیں۔ میں کل یہیں سے تمہیں کوئی تحفہ لے دوں گا۔''

''شکریہ نوشیرواں، مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں اور پھر گفٹ تو انہیں دیا جاتا ہے، جن کا خیال ہو، جو عزیز ہوں، اور میں تو آپ کی یادداشت میں کہیں بھی نہیں تھی۔ ایک فالتو شے جو سامنے رکھی رہے تو بھولے بھٹکے نظر پڑ جاتی ہے، اور جو نظروں سے اُوجھل ہو جائے تو کبھی خیال بھی نہیں آیا۔'' اس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''سونیا!'' انہوں نے پکارا لیکن وہ ان سنی کرتی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔

پھر جس طرح وہ ابو جی اور ان کی چہیتی بیوی کو نظر انداز کرتی تھی۔ اسی طرح

نوشیرواں کو بھی کرنے لگی۔ شاید یہ زندگی میں دوسرا خاموش احتجاج تھا۔ کچھ خفگی بھرا۔ کبھی خود سے ان کے پاس گئی نہیں کبھی مخاطب نہیں کیا۔ وہ بات کرتے تو مختصری ہوں ہاں سے جواب دے کر ان کے پاس سے فوراً ہٹ جاتی۔

نوشیرواں اس کی خفگی محسوس کر رہے تھے جانتے بھی تھے کہ وہ کیوں خفا ہے اور چاہتے تھے، تلافی کی کوئی صورت ہو لیکن وہ موقع ہی نہیں دے رہی تھی اول تو انہیں دیکھتے ہی راستہ بدل لیتی اور جو وہ سامنے آ جاتے تو یوں پوز کرتی جیسے بہت عجلت میں ہو۔

پہلے پہل تو وہ بس یونہی اس کی خفگی دور کرنے کی غرض سے اس کے پاس آتے، اس کا راستہ روکتے، لیکن اب انہیں لگتا جیسے وہ اس کے معاملے میں بے اختیار ہو گئے ہیں وہ جتنا گریز کرتی وہ اتنا اس کی طرف لپکتے اور اسے دیکھے بنا جو دن گزرتا اسے وہ اپنی زندگی میں شمار ہی نہیں کرتے تھے۔

ان دنوں وہ اپنا کلینک سیٹ کرنے میں مصروف تھے اس لیے گھر میں بہت کم نظر آتے، صبح ناشتے کے وقت وہ بھی بہت عجلت میں اور رات کے کھانے میں کسی کسی دن ورنہ اکثر بہت دیر سے آتے تھے اور وہ جو بی اے کے بعد بیکار گھر میں بیٹھنا نہیں چاہتی تھی اب تک بیکار تھی شاید اپنے لیے کوئی راہ متعین نہیں کر سکی تھی اور کسی دوسرے کا مشورہ اس کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ اپنی اس طویل فراغت سے وہ خاصی بور ہو چکی تھی اور چاہتی تھی۔ اپنے لیے کوئی مصروفیت ڈھونڈے لیکن پتا نہیں اسے کیا ہو گیا تھا کہ نہ کچھ سوچنے پر طبیعت مائل ہوتی، اور نہ کچھ کرنے پر، اور حیران کن بات تو یہ تھی خود اس کے اپنے لیے بھی کہ وہ جو توجہ حاصل کرنے کے لیے عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگتی تھی تو اب ایسا نہیں تھا۔ بلکہ اس کے برعکس کوئی متوجہ ہوتا بھی تو وہ گھبرا جاتی، اندر ہی اندر ڈرنے لگتی کہ کہیں کوئی اسے موضوع تو نہیں بنا رہا۔ پتا نہیں وہ موضوع بننے سے کیوں ڈرنے لگی اس کی اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیوں اتنی الگ تھلگ سی رہنے لگی ہے، اپنے کمرے میں بند، بس تنہائی اور خاموشی اس کی رفیق ہوتی۔

نوشیرواں کلینک سیٹ کر کے پریکٹس کرنے لگے تو تائی اماں کو ان کی شادی کی فکر ہوئی اور اس سلسلے میں باہر لڑکیاں ڈھونڈنے سے پہلے انہوں نے گھر کی لڑکیوں کے

بارے میں نوشیرواں سے پوچھنا مناسب سمجھا اور اس وقت وہ حیران رہ گئیں، جب انہوں نے بلا جھجک سیدھے صاف لفظوں میں سونیا کا نام لے دیا۔

''تم نے اچھی طرح سوچ لیا ہے بیٹا؟'' تائی اماں حیرتوں میں ڈوبی ہوئی پوچھنے لگیں۔

''جی امی! لیکن آپ پریشان کیوں ہوگئیں کیا وہ آپ کو اچھی نہیں لگتی؟''

''اچھی کیوں نہیں لگے گی، اسی گھر کی بچی ہے جیسے اور لڑکیاں ہیں، ویسے وہ بھی لیکن۔''

''لیکن کیا؟'' وہ فوراً پوچھنے لگے۔

''وہ اپنی مرضی کی مالک ہے، ہماری تو کوئی بات سنتی ہی نہیں، ہر بات میں ناں، ہر بات میں ناں، پتا نہیں کیا چاہتی ہے۔''

''اب وہ ناں نہیں کہے گی۔'' انکے پریقین لہجے پر تائی اماں انہیں دیکھتی رہ گئی تھیں اور شام میں وہ سب کی موجودگی میں اس سے کہنے لگے۔

''سونیا! تمہارا گفٹ مجھ پر ادھار تھا چلو اب دلادوں۔''

''میں نے آپ سے کہا تھا مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' وہ پتا نہیں کیوں صاف انکار نہ کرسکی۔

''میں جانتا ہوں پھر بھی چلو'' اور اس سے پہلے کہ وہ مزید پس و پیش کرتی وہ اسے کلائی سے پکڑ کر سب کے درمیان سے نکال لے گئے۔

''لیکن۔۔۔'' وہ نروس ہوگئی۔

''ناں نہیں کرو گی۔'' انہوں نے انگلی اٹھا کر کہا۔ تو باقی سب بھی ان کی طرف داری کرنے لگے۔

''چلی جاؤ سونیا! اتنا اصرار کر رہے ہیں نوشیرواں۔'' وہ کب کسی کی بات مانتی تھی، جہاں سب کسی ایک بات پر متفق ہوئے، وہ مخالفت کرنے لگتی۔

اب بھی شاید ایسا ہی کرنے جا رہی تھی کہ اپنے کمرے سے نکل کر، سلمیٰ بیگم اس کی طرف آتے ہوئے بولیں۔

''سونیا! ہمارے ساتھ چلو'' اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو کہنے لگیں۔

''میں اور تمہارے ابو، بیگم ایاز کے ہاں مدعو ہیں، اور بیگم ایاز نے خاص طور پر تمہیں بھی ساتھ لانے کو کہا تھا۔'' بات کے اختتام پر سلمیٰ بیگم کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ نادان نہیں تھی۔ ایسی باتوں اور مسکراہٹوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی اور اس وقت سلمیٰ بیگم کی جگہ اس کی اپنی امی ہوتیں تو شاید وہ نوشیرواں کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑا کر ان کے ساتھ جانے پر آمادہ ہو جاتی۔ لیکن ایسا ہوتا تب ناں اور ایسا نہیں تھا جب ہی وہ کہہ رہی تھی۔

''سوری میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔'' انداز ایسا تھا جیسے کہہ رہی ہو ''نہ اب نہ آئندہ کبھی۔''

''کیوں؟'' سلمیٰ بیگم کو اس کا انکار ناگوار گزرا۔

''مجھے نوشیرواں کے ساتھ جانا ہے۔'' ان ہی کی طرح معنی خیز مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولی پھر نوشیرواں کی طرف دیکھنے لگی اور انہوں نے محض سلمیٰ بیگم کے خیال سے ایک خوبصورت مسکراہٹ کو ہونٹوں تک آنے سے روکا۔ لیکن اپنے ہاتھ کو نہیں روک سکے تھے، جو اس کی کلائی سے سرک کر اس کے ہاتھ پر ٹھہرا تو دلی جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ ان کی تائید کر رہی تھی۔

ایسا بھی ایک دن کمال ہو

عجیب گھٹا گھٹا سا ماحول تھا اس گھر کا۔ شاید بڑے ابا کے رعب دبدبے نے ایک ایک مخصوص رنگ دے دیا تھا۔ خاص طور سے لڑکیوں پر تو کڑی نظر رکھتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ لڑکوں کو بے لگام چھوڑ دیا تھا۔ ان کے لیے بھی کچھ حدود مقرر تھیں اور وقتاً فوقتاً ایک ایک کو بلا کر اپنا اطمینان کرتے کہ کسی نے ان کی لگائی ہوئی حد بندی توڑنے یا پار کرنے کی کوشش تو نہیں کی۔ اگر جو کبھی کسی سے ایسی کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو بڑے ابا سزا دینے میں دیر نہیں کرتے تھے لڑکے احتجاج کرتے اور آواز ضرور اُٹھاتے، لیکن اپنے کمروں میں بند ہو کر۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اپنی آواز کو کمرے سے باہر لے آئے۔

بڑے ابا کے سامنے بولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور لڑکیاں تو اپنے کمروں میں بیٹھ کر بھی آواز نہیں نکالتی تھیں۔ ان کا خیال تھا دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں، کہیں جو بڑے ابا نے سن لیا کہ ہم آزادئ نسواں پر بات کر رہے ہیں تو وہ اس چار دیواری کے اندر بھی ہمارا سانس لینا دشوار کر دیں گے۔ یہ ان سب کا متفقہ خیال تھا۔

لڑکوں کو تو پھر بھی رات آٹھ بجے تک کچھ آزادی میسر تھی وہ دوستوں سے ملنے بھی جا سکتے تھے اور تفریح کے لیے بھی لیکن آٹھ بجے سب کی گھر میں موجودگی ضروری تھی۔

رات کا کھانا بڑے ابا اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ کھاتے تھے۔ اس طرح شاید وہ سب کی موجودگی کا یقین کرنا چاہتے، اگر جو کبھی کسی کی کرسی خالی ہوتی تو بقیہ سب لاکھ پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے لیکن بڑے ابا اس وقت تک کھانے کو ہاتھ نہ لگاتے، جب تک

حقیقت نہ اُگلوا لیتے اور جس کی کرسی خالی ہوتی اس کی جو بعد میں شامت آتی، وہ الگ بات ہے۔

بہر حال اس مخصوص ماحول سے سب لوگ سمجھوتہ کر چکے تھے، اس لیے بہت حد تک مطمئن تھے۔ لڑکیوں کا کہنا تھا ہماری اپنی ایک الگ دنیا ہے۔ بے تحاشا حسین اور بہت زیادہ خوبصورت جس میں دُکھ پریشانی اور فکروں کا دور دور تک گزر نہیں پھر بھلا ہم مطمئن کیوں نہ ہوں گے اور لڑکے کبھی جو موقع ملتا تو انہیں چھیڑنے سے باز نہ آتے۔ لاکھ تم اپنی دنیا کو حسین کہو لیکن کہلاؤ گی کنوئیں کی مینڈک۔ گھر اور کالج کے علاوہ تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔

''ہمیں کچھ اور کہنے کی تمنا ہی نہیں۔'' سراسر مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا، ورنہ ہر ایک کے دل میں بہت کچھ دیکھنے کی تمنا تھی لیکن چونکہ اپنی بات رکھنا مقصود ہوتا تھا، اس لیے مجال ہے جو اپنی خواہشات کو زبان کا راستہ دکھا جائیں جبکہ مخصوص گوشوں میں بیٹھ کر وہ سب بڑی، فراخدلی سے ایک دوسرے پر اپنا آپ عیاں کرتی تھیں۔ بس یہ خیال رہتا کہ بات بڑوں تک نہ پہنچے اور نہ ہی ان لڑکوں سے اپنا ریکارڈ لگوانا منظور تھا جو پہلے ہی انہیں کنوئیں کی مینڈک کا خطاب دے چکے تھے حالانکہ وہ خود سارے کے سارے رات آٹھ بجے بڑی عجلت میں گھر میں داخل ہوتے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑتی ہوئی کبھی کلائی پر بندھی گھڑی کو دیکھتے اور پھر ایک دوسرے سے تصدیق کرتے ہر ایک کو یہ خدشہ ہوتا کہیں اس کی گھڑی غلط تو نہیں، پھر چور نظروں سے گھر کا جائزہ لیتے کہ کہیں کوئی غیر معمولی بات تو نہیں ہوئی۔ جب پورا اطمینان کر لیتے تب ایک شان کے ساتھ ان سب کے درمیان اپنے آپ کو یوں پوز کرتے جیسے تفریح کر کے آ رہے ہوں۔

''کیا مزہ ہے ساحل کی ٹھنڈی ٹھنڈی ریت پر چلنے کا۔'' عرفان پہل کرتا اور کن انکھیوں سے ان سب کا جائزہ لینے لگتا، لیکن وہ سب بھی کم نہیں تھیں۔ یوں انجان بنتیں جیسے انہیں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ جبکہ دلوں کا حال وہ خود بہتر جانتی تھیں یا ان کا خدا۔

''اور جب نارنجی گولا نیلے پانیوں میں اُترنے لگتا ہے تو جیسے پوری کائنات ساکت ہو جاتی ہے۔'' عثمان کا افسانوی انداز ان کے دلوں میں ہلچل مچاتا۔

''میں تو روزانہ صرف اسی منظر کو دیکھنے کے لیے ساحل پر جاتا ہوں۔'' جنید بھی ان سب کا ساتھ دیتا اور دانش کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سونیا بول پڑتی۔

''کسی دن کوئی بڑی سی لہر تم سب کو بہا کر لے جائے گی۔''

''اللہ نہ کرے۔'' صبا خوفزدہ ہو کر اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیتی۔

''کہنے دو۔'' دانش مذاق اُڑاتا۔ ''بے چاری اس کے علاوہ اور کہہ بھی کیا سکتی ہے۔ جل ککڑی کہیں کی خود جو جانا نصیب نہیں ہوتا۔''

''مجھے کچھ شوق بھی نہیں ہے۔'' سونیا چڑ کر کہتی اور وہ سب اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے چلے جاتے۔

''سارے کے سارے اوّل درجے کے کمینے ہیں۔'' ان کے جاتے ہی سب مختلف خطابات دینا شروع کر دیتیں اور آخر میں دبی دبی سرگوشیاں۔

''اللہ! ساحل کی ٹھنڈی ٹھنڈی، نرم نرم ریت پر چلنا کتنا اچھا لگتا ہوگا۔''

''اور نیلے پانیوں میں اترتا سورج۔''

''لہروں کا ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنا۔''

''اور معطر ہواؤں کی اٹھکیلیاں۔''

دھیمی دھیمی آوازوں میں سب اپنی اپنی خواہشوں کو زبان دیتیں اور ان سب کے درمیان بیٹھی۔ وہ یعنی صبا احمد چپ چاپ اپنی ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکا لیتی۔

پتا نہیں اس کے اندر ایسی خواہشیں مچلتی تھیں کہ نہیں لیکن اس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سوچ کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں ہوتیں اور بظاہر وہ سب کی سن رہی ہوتی لیکن وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کچھ نہیں سن رہی۔ اس کے کانوں میں تیز ہواؤں کا شور اتنے کچھ سننے نہیں دیتا تھا یوں لگتا پتنگ کی مانند ہوا کے دوش پر اوپر اور اوپر اڑی چلی جا رہی ہو۔

''صبا! تم کہاں کھوئی ہوئی ہو؟'' عانیہ اکثر اس کا سر زور سے ہلا دیتی اور وہ چونک چونک اُٹھتی۔

''کچھ نہیں، کہیں نہیں۔''

''بڑی بد ذوق ہو تم، ہم تصور ہی تصور میں اس ساحل سے اس ساحل تک ہو آئے ہیں اور تم......!''

''میں!'' وہ ایک ایک کو دیکھتی۔ ''تم لوگوں کے ساتھ تو تھی۔''

''پیچھے رہ گئی ہوگی۔'' سونیا کے شرارت سے کہنے پر سب بے ساختہ ہنستیں اور وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی۔

''تم سب تو یوں باتیں کر رہی ہو جیسے حقیقت میں جانے کہاں کہاں کی سیر کر کے آ رہی ہو؟''

''ارے! تصور حقیقت سے زیادہ حسین ہوتا ہے۔''

''ہوتا ہوگا، لیکن کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم تصورات کی دنیا میں رہنا چھوڑ دیں۔ حقیقت اتنی بری بھی نہیں، جس سے ہم نظریں چرانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

''حقیقت بری نہیں ہے لیکن بڑے ابا کی بے جا سختی اور لڑکوں کا خاص طور سے جتانا ہمیں برا لگتا ہے۔''

''بڑے ابا نے بھی تو حد کر دی۔ ایک طرف ہمیں تعلیم دلاتے ہیں، دوسری طرف اس کے استعمال سے بھی روکتے ہیں۔ اب ذرا بتاؤ کہ امتحانوں کے بعد ہم سب کیا کریں گے۔'' سونیا اسے مخاطب کر کے یوں بولی جیسے سارا قصور اسی کا ہو۔

''بھئی! کچھ بھی کر لیں گے۔'' وہ بظاہر اطمینان سے بولی ورنہ اندر ہی اندر وہ بھی یہ سوچ کر پریشان تھی کہ فراغت کے طویل دن کیسے کٹیں گے اور اب تو آگے صرف فراغت ہی فراغت تھی کیونکہ یہ امید بھی نہیں تھی کہ بڑے ابا ایم۔ اے کرنے کی اجازت دیں گے۔

''بڑے آرام سے کہہ رہی ہو کہ کچھ بھی کر لیں گے۔'' عانیہ جل کر بولی۔ ''ابھی پرسوں کی بات بھول گئیں، میں نے صرف فرنچ سیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا ناں۔ اس پر بڑے ابا نے فوراً حکم صادر کر دیا کہ آئندہ سے کالج بھی مت جانا۔''

''اس بے چاری کا بھی قصور نہیں ہے۔'' سونیا اس کا اُترا چہرہ دیکھ کر اس کی طرف داری کرنے لگی۔ پھر شاید سب ہی کو احساس ہو گیا تھا کہ ناحق اسے الزام دے رہے

ہیں، اس لیے سوری کہتی ہوئی ایک ایک کر کے سب اُٹھ کر چلی گئیں۔

اور اگلے کتنے پل اس کا ذہن بالکل خالی رہا۔ کسی سوچ، کسی خیال کو اس نے آواز نہیں دی۔ طویل سانس لیتے ہوئے بیڈ کی پٹی سے سر ٹکایا تو ذہن آپ ہی آپ بھٹک گیا۔

''میں بدذوق نہیں ہوں ڈیئر کزنز!'' وہ دل ہی دل میں ان سب کو مخاطب کر کے بولی۔ ''تمہاری طرح ان اونچی فصیلوں کے درمیان میرا بھی دم گھٹتا ہے۔ دل چاہتا ہے، ان اونچی دیواروں کے اس پار کی دنیا دیکھوں اور تم تو صرف ساحل تک کی بات کرتی ہو جبکہ میں تو ہوا کے دوش پر سفر کرتی ہوئی بہت اوپر چلی جاتی ہوں، جہاں سے اس کائنات کے سارے رنگ ایک ساتھ میری نظروں میں آسماتے ہیں اور پھر تم سب تو اپنی اپنی ماؤں کے سامنے بھی کچھ احتجاج کر لیتی ہو۔ مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟ مجھے تو وہ آغوش ہی میسر نہیں جس میں سر چھپاؤں تو آزردگیوں کے بادل آپ ہی آپ چھٹ جائیں۔ ایک ابو جی ہیں، پتا نہیں وہ کون سی مصروفیات ہیں جو ہر وقت ان کی منتظر رہتی ہیں چوبیس گھنٹوں میں بس گھڑی دو گھڑی کو ہی میرے پاس رکتے ہیں پھر فوراً انہیں کوئی کام یاد آ جاتا ہے۔''

''صبا!'' سونیا اسے پکارتی ہوئی آئی۔ اندھیرا دیکھ کر پہلے لائٹ جلائی، پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

''کیا بات ہے اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو؟''

''میں شاید سو گئی تھی۔'' اس نے جھوٹ بولا۔ ''تمہاری آواز پر اچانک میری آنکھ کھل گئی۔''

''چلو، بڑے ابا کھانے پر بلا رہے ہیں۔''

''ارے! کھانے کا وقت ہو گیا؟'' وہ فوراً بیڈ سے نیچے اتر آئی۔

باتھ روم میں جا کر جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مارے پھر سونیا کے ساتھ ہی کمرے سے نکل آئی۔

ڈرائنگ روم میں بڑے ابا کی موجودگی میں سب بڑے مہذب بنے بیٹھے تھے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے سونیا نے اس کے بازو میں چٹکی بھری اور سامنے بیٹھ

عثمان اور دانش کو دیکھ کر شرارت سے مسکرائی لیکن جوابی مسکراہٹ پھینکنے کی جرأت کسی نے نہیں کی بلکہ کن اکھیوں سے بڑے ابا کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

''کیا بات ہے صبا؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔'' اس کے بیٹھتے ہی بڑے ابا پوچھنے لگے۔

''جی بڑے ابا! بس ذرا سی نیند آ گئی تھی۔'' اس نے سر جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔

پھر بڑے ابا کھانے کے دوران لڑکوں سے ان کی دن بھر کی روداد سنتے رہے اور اٹھنے سے پہلے انہوں نے حسب معمول کچھ نصیحتیں بھی کی تھیں۔

☆......☆......☆

امتحانوں کا زمانہ آیا اور گزر بھی گیا اور وہ سب جس بات کو سوچ کر پریشان تھیں، وہی ان کی منتظر تھی یعنی فراغت۔ شروع کے چند دنوں میں سب نے پورے گھر کی ترتیب بدلنے میں اپنے آپ کو مصروف رکھا پھر کچن کی شامت آئی۔ مختلف ڈشز پر طبع آزمائی گئی لیکن آخر کہاں تک بہت جلد وہ اُکتا گئیں۔

''اللہ! پتا نہیں کیسی ہوتی ہیں وہ لڑکیاں جو امتحان ختم ہونے کا شدت سے انتظار کرتی ہیں۔'' عانیہ اس دن بہت بور ہو رہی تھی۔

''ہمارے علاوہ سب ہی۔'' سونیا بیڈ پر اوندھی گرتی ہوئی بولی۔

''ایمان سے میرا تو دل چاہ رہا ہے، خودکشی کر لوں۔'' ندا سستی دور کرنے کے لیے بازوؤں کو زور زور سے جھٹکتے ہوئے بولی۔

''فوراً کر ڈالو، اسی بہانے ہی کچھ ہنگامہ ہو جائے گا۔'' سونیا اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے خوشی سے بولی۔

''ایمان سے ندا! تمہارے اس اقدام سے ہم سب کا بھلا ہو جائے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''بھئی، ہم بڑے ابا سے کہیں گے کہ آپ کی سختی اور بے جا روک ٹوک نے بے چاری کو اس اقدام پر مجبور کیا تھا اور اگر اب بھی آپ نے اپنے اصولوں میں لچک پیدا نہ

کی تو ایک ایک کرکے ہم سب......!''

اپنی بات پر پہلے وہ خود ہنسی پھر کہنے لگی۔

''اب دیکھو ناں! کسی نہ کسی کو تو قربانی دینی ہی پڑتی ہے۔ تم ندا پلیز ہماری خاطر......!''

''میں واقعی تم سب کے لیے یہ قربانی دینے کو تیار ہوں۔'' ندا نے اسی کا انداز اپنایا۔ ''لیکن پہلے مجھے یہ یقین دلا دو کہ میرے بعد تم اپنی من پسند زندگی گزار سکو گی۔''

''ہاہا!'' سونیا کے ساتھ عانیہ نے بھی لمبی سانس کھینچی اور وہ جو حسبِ عادت خاموشی سے ایک ایک کو دیکھ رہی تھی، ہلکے سے مسکرائی۔

''لیجیے۔'' صبا احمد کے ہونٹوں نے بھی تکلف کیا۔ ندا کے اشارے پر سب اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''یار صبا! تم بہت بور ہو، ہم سب تو پھر بھی ہنس بول لیتی ہیں تم تو یہ بھی نہیں کرتیں۔''

''میں تم سب کی باتوں پر محظوظ ہوتی ہوں۔''

''صرف محظوظ ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ہماری باتوں میں حصہ لیا کرو کم از کم اپنے زندہ ہونے کا احساس تو ہو۔''

''اچھا بابا! کوشش کروں گی، اب پلیز تم لوگ میرا کمرہ خالی کرو، مجھے نیند آرہی ہے۔''

''سو، مرو۔'' سونیا نے اسے تکیہ کھینچ کے مارا اور سب سے پہلے کمرے سے نکل گئی۔ باقی سب نے بھی اس کی تقلید کی تو وہ تکیہ سیدھا رکھ کر لیٹ گئی۔ بس کچھ دیر کو ہی وہ بے معنی سوچوں میں الجھی تھی کہ نیند مہربان ہوگئی۔

صبح اُٹھ کر اس نے ابھی منہ ہاتھ دھویا ہی تھا کہ ابو جی اس کے کمرے میں آ گئے۔ یقیناً حیران کر دینے والی غیر معمولی بات تھی پھر بھی اس نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے انہیں سلام کیا اور پھر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''بیٹا! تمہارے امتحان ختم ہو گئے۔'' ابو جی بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''جی!'' وہ ان کے اشارے پر آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس آ بیٹھی۔

کچھ دیر تک ابو جی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے تھے، کہنے لگے۔

''تمہاری نانی اماں کے دو تین خط آ چکے ہیں اور کئی بار انہوں نے فون کیا ہے کہ میں کچھ دنوں کے لیے تمہیں ان کے پاس بھیج دوں۔''

''جی!'' وہ بس اسی قدر کہہ سکی۔

''میں تمہارے امتحان ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا اور ان سے بھی میں نے یہی کہا تھا کہ تم فارغ ہو جاؤ پھر......'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

''بیٹا! تمہاری امی کے ساتھ رشتے ختم نہیں ہو گئے، ان کا تم پر کچھ حق ہے۔''

''جی!''

''کیا تم جانے کے لیے تیار ہو؟'' وہ سر اٹھا کر ان کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''آپ کی اجازت ہو گی تب ناں۔''

''مجھے تمہارے جانے پر کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ اس کی آنکھوں مچلتا سوال ایک پل میں سمجھ گئے۔

''اور بڑے ابا؟'' وہ آہستہ آواز میں بولی۔

''میرے خیال میں انہیں بھی اعتراض نہیں ہوگا اور اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو میں انہیں قائل کر لوں گا۔''

''جی!'' اس نے پھر سر جھکا لیا۔

''تم تیاری کر رکھو، میں ابھی تمہارے بڑے ابا سے بات کرکے آج شام کی سیٹ لینے کی کوشش کروں گا۔''

''ابو جی! آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے؟'' ان کے خاموش ہونے پر وہ پوچھنے لگی۔

''بیٹا! آج کل کام کا پریشر بہت زیادہ ہے، میں بالکل بھی وقت نہیں نکال سکوں گا۔''

''پھر میں کس کے ساتھ جاؤں گی؟''

''اکیلے۔''

''اکیلی!'' اسے واقعی بے تحاشا حیرت ہوئی اکیلی تو وہ کبھی کالج بھی نہیں گئی تھی۔

"کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے، میں تمہارے ماموں جی کو فون کر دوں گا، وہ تمہارے پہنچنے سے پہلے ہی ایئر پورٹ پہنچ جائیں گے اور پھر ڈیڑھ دو گھنٹے کا تو کل سفر ہے۔" وہ اب بھی حیرت سے اُن کی طرف دیکھ رہی تھی۔ انداز میں غیر یقینی بھی تھی۔

"تم ڈر رہی ہو؟" ابو جی کے پوچھنے پر اس نے ایمانداری سے اثبات میں سر ہلایا۔

"بے وقوف! ڈرنے کی بھلا کیا بات ہے؟" پھر اُٹھتے ہوئے کہنے لگے۔

"اوکے! تم تیاری کر رکھنا، اگر آج کی سیٹ مل گئی تو تمہیں فون پر بتا دوں گا۔"

وہ خاموشی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کی زندگی میں اس انداز سے ہی سہی کوئی تبدیلی آ رہی ہے۔

"شاید ہواؤں کے دوش پر سفر کرنے کا تصور حقیقت بننے جا رہا ہے۔" اس نے سوچا اور اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنے لگی کہ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہی اور جب سونیا وغیرہ ایک تجسس کے ساتھ اس کے کمرے میں داخل ہوئیں اس وقت بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی۔

"صبا! کیا یہ سچ ہے؟" عانیہ کی آواز چیختی ہوئی سی تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ ویسے بھی اسے اپنے جذبات چھپانے میں کمال حاصل تھا، اگر جذبات کی رو میں بہتی تو اس سے کہیں زیادہ اونچی آواز میں کہتی۔

"ہاں، میں کچھ وقت کے لیے ان اونچی دیواروں سے نکل کر دور جا رہی ہوں۔" لیکن وہ بڑے ضبط سے خاموش بیٹھی تھی۔

"اپنی نانی اماں کے پاس جا رہی ہو؟" سونیا نے تصدیق چاہی۔

"ہاں"

"ہاں صبا! تم بڑی خوش قسمت ہو۔" نِدا کو واقعی اس پر رشک آ رہا تھا۔ "کاش ہمارا ننھیال بھی کہیں دور ہوتا۔"

"اللہ میاں کا بھی جواب نہیں۔ ایسی بد ذوق پر مہربان ہوئے ہیں۔ اس کی جگہ اگر میں ہوتی تو اس وقت خوشی سے چھلانگیں لگا رہی ہوتی۔" سونیا گرنے کے انداز میں

اس کے برابر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"سنو صبا! وہاں جا کر اپنے خول سے باہر نکل آنا۔ خوب گھومنا پھرنا۔ وہاں سے مری، اسلام آباد قریب ہے، ضرور جانا اور اگر ہو سکے تو لاہور تک ہو آنا۔"

"اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟" وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

"مجھے فائدہ ہو نہ ہو لیکن یہ جو ہمارے کزنز اتنا اِتراتے ہیں واپس آ کر ان پر رعب جمانا۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"ہائیں! ابھی تک ایسے بیٹھی ہو، تمہاری جگہ اگر میں ہوتی۔"

"پورا گھر پیک کر چکی ہوتی۔" اس نے سونیا کی بات اُچک لی۔

"اور کیا" سونیا نے اعتراف کیا۔

"لاؤ، ہم تمہاری مدد کر دیں۔" عانیہ نے خدمات پیش کیں۔

"یا اللہ! تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں نے کوئی لمبی چوڑی تیاری کرنی ہو۔"

"پھر بھی۔"

"خدا کے لیے صبا یہ نیلے پیلے کپڑے مت لے جانا بلکہ تم رہنے دو، میں خود تمہارا بیگ تیار کر دیتی ہوں۔" سونیا اُٹھ کر اُس کی الماری کھول کر کھڑی ہو گئی اور چپ چاپ ان تینوں کی کارروائی دیکھتی رہی۔

واقعی ان لڑکیوں کے لیے ایک نئی بات تھی۔ سارا دن ایک ہلچل مچی رہی۔

"ابو جی نے فون کر کے بتا دیا تھا کہ اس کی فلائٹ شام پانچ بجے ہے اور یہ کہ چار بجے وہ اسے لینے آ جائیں گے، دوپہر کے کھانے کے بعد وہ کچھ دیر آرام کرنے کی غرض سے لیٹی ہی تھی کہ دروازے پر دستک دینے کے بعد جنید اس کے کمرے میں آ گیا۔ اسے دیکھ کر فوراً اُٹھ بیٹھی۔

"تو تم جا رہی ہو؟" پتا نہیں کیا تھا اس کے لہجے میں۔ وہ سمجھ نہیں سکی، بس اتنا کہا۔

"ہمیشہ کے لیے تو نہیں جا رہی۔"

"کب تک واپس آؤ گی؟"

"پتا نہیں، جب ابو جی کہیں گے۔"

''صرف ان کے کہنے سے کسی اور کے کہنے سے نہیں۔'' وہ ایک دم سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی جانے کیا تھا اس کی نظروں میں کہ اس نے فوراً پلکیں جھکا لیں۔

''تم نے بتایا نہیں۔'' وہ پتا نہیں کیا پوچھ رہا تھا، اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔

''سنو! اگر میں کہوں، مت جاؤ تو کیا تم......؟'' سونیا وغیرہ کے آجانے سے اس کی بات ہونٹوں میں رہ گئی اور اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ کسی امتحان سے بچ گئی ہے ویسے اسے جنید کی باتوں اور اس کے انداز پر حیرت ہو رہی تھی، پہلے تو اس نے کبھی ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔
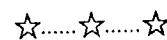
''ارے واہ! یہاں جنید بھی موجود ہیں۔'' سونیا نے بالکل عام سے لہجے میں کہا۔ اس کے باوجود اسے بڑا عجیب سا لگا۔

''تم کہیں سونے کی تیاری تو نہیں کر رہی تھیں۔'' ندا کے پوچھنے پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''نہیں، بس یونہی ذرا کمر سیدھی کرنے کو لیٹی تھی کہ جنید آ گیا۔'' وہ کن اکھیوں سے جنید کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ سر جھکائے کچھ اُلجھا اُلجھا سا نظر آ رہا تھا پھر جب تک اس کے جانے کا وقت نہیں ہوگیا سب اس کے پاس بیٹھے رہے تھے۔

جانے سے کچھ دیر پہلے وہ بڑے ابا کے پاس آ گئی۔ انہوں نے حسب عادت اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی۔ اپنا خیال رکھنے کو کہا اور بہت ساری نصیحتیں اس کے دامن میں بھر دی تھیں۔

☆......☆......☆

اس کی منزل اسلام آباد تھی۔ وہاں سے اسے ماموں جی کے ساتھ بائی روڈ جانا تھا۔

زندگی میں پہلی بار وہ سفر کر رہی تھی اور وہ بھی تنہا، اس لیے اندر ہی اندر بہت خوفزدہ تھی اور کیونکہ اسے اپنے جذبات چھپانے میں کمال حاصل تھا۔ اس لیے بظاہر بہت پرسکون نظر آ رہی تھی۔ البتہ اسلام آباد ایئر پورٹ پر اترتے ہی وہ کوشش کے باوجود اپنے

آپ کو پرسکون نہ رکھ سکی۔ دل جس انداز سے دھڑک رہا تھا، اس کا عکس چہرے پر بھی جھلملانے لگا تھا۔ چال الگ غیر متوازن ہو رہی تھی، بیگ پر اپنی گرفت مضبوط کیے وہ اتنے لوگوں میں شناسا چہرہ تلاش کرنے لگی۔ وہ صرف ماموں جی کو پہچانتی تھی کیونکہ گزشتہ سال ہی وہ اس سے ملنے آئے تھے۔ لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ سیڑھیاں بھی اتر آئی اب اس کی نظریں دور کھڑی گاڑیوں اور ان کے پاس کھڑے لوگوں میں بھٹکنے لگی تھیں۔

''اگر ماموں جی نہ آئے تب......؟''

اس خیال کے ساتھ ہی وہ بہت زیادہ پریشان ہوگئی۔ اور جلدی جلدی اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کسی چہرے پر ماموں جی کا گمان ہوتا تو وہ بغور دیکھنے لگتی کتنی، دیر گزر گئی۔

شام گہری ہو کر ڈھلنے لگی تھی۔ تاریکی کے بڑھتے سایوں نے اسے خوفزدہ بھی کر دیا۔ آنے والے مسافروں میں شاید اب وہ تنہا رہ گئی تھی جو ابھی تک یہیں کھڑی تھی۔

''اب کیا کروں؟'' اس نے سوچا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے اسے متوجہ کیا۔

''ایکسکیوز می!'' وہ فوراً پلٹ کر دیکھنے لگی اور مقابل وہ جو کوئی بھی تھا، اس کی شخصیت میں ایک انوکھا سحر تھا گھنے بالوں کی بے ترتیبی اس کی پیشانی کو ڈسٹرب کر رہی تھی۔ آنکھوں میں مقابل کو تسخیر کر لینے کی قوت اور قد میں اتنا اونچا کہ وہ پورا سر اٹھا کر اسے دیکھ رہی تھی۔

''آپ صبا ہیں؟'' اس کے پوچھنے پر اس نے فوراً جواب نہیں دیا بلکہ دل ہی دل میں قیاس کرنے لگی کہ وہ کون ہوسکتا ہے۔

''میں معظم ہوں، معظم آغا۔'' وہ شاید جان گیا تھا کہ وہ اس کی شناخت چاہتی ہے، اس لیے اپنا تعارف کروایا۔

''ماموں جی نہیں آئے؟'' وہ کوشش کے باوجود اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔

''انہیں اچانک زمینوں پر جانا پڑ گیا، اس لیے آپ کو لانے کی ذمہ داری وہ مجھے سونپ گئے۔''

وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ شاید سوچ رہی تھی کہ جانے سامنے کھڑا شخص معظم آغا

ہے بھی یا نہیں۔

''یہ رہا میرا شناختی کارڈ، آپ اپنا اطمینان کر لیں۔'' اس نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

''میرے خدا!'' اسے نظریں چرانے کے ساتھ اپنا رُخ بھی موڑنا پڑا۔ ''کمال شخص ہے، پل میں سوچوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔''

''آیئے میرے ساتھ۔'' وہ اس یقین کے ساتھ کہتا ہوا اس سے پہلے آگے بڑھا کہ وہ اس کے پیچھے ضرور آئے گی اور واقعی وہ کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے چل پڑی۔

گاڑی مختلف سڑکوں پر دوڑتی ہوئی بالآخر ایک طویل سڑک پر پوری اسپیڈ سے دوڑنے لگی وہ کیونکہ پہلی بار آئی تھی بلکہ گھر سے ہی پہلی بار نکلی تھی، اس لیے نہ راستوں کا علم تھا اور نہ منزل کا۔ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی کسی وقت سر اٹھا کر شیشے سے باہر دیکھنے کی کوشش کرتی بھی تو اندھیرے میں اپنی ہی گاڑی کی لائٹ دور تک نظر آتی کچھ دیر وہ اس روشنی کو اپنے آگے آگے بھاگتے ہوئے دیکھتی رہتی پھر سر جھکا لیتی۔

''آپ کے گھر میں سب ٹھیک ٹھاک ہیں؟'' وہ بات کرنے کی غرض سے پوچھنے لگا۔

''جی سب ٹھیک ہیں۔'' اسے بھی خاموشی گراں گزرنے لگی تھی، اس لیے صرف جی کہنے پر اکتفا نہیں کیا۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟''

''ابھی بی اے کا امتحان دے کر فارغ ہوئی ہوں۔''

اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی اور بقیہ تمام راستہ اسی طرح کٹا پھر جس وقت گاڑی ایک جھٹکے سے رُکی تب اس نے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔ سامنے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی بڑی سی حویلی جس کے گرد کھڑی اونچی اونچی دیواروں نے اس کی رگوں میں سرد لہر دوڑا دی تھی۔

''کیا یہ اونچی دیواریں ہی میرا مقدر ہیں۔'' اس نے سوچا اور آہنی گیٹ کو کھلتے ہوئے دیکھنے لگی۔ وہ آہستہ رفتار سے گاڑی اندر لے گیا اور ابھی گاڑی سے اتری ہی تھی کہ ایک معمر خاتون نے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

''نانی اماں!'' اس کے ہونٹوں کی جنبش کے ساتھ ہی آنکھوں میں نمی اتر آئی اور پلکیں جھپکنے کے باوجود کتنے قطرے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

''میری بچی، میری صبا!'' نانی اماں فرطِ محبت سے کبھی اس کا منہ چومتیں اور کبھی سینے سے لگا لیتیں۔

''بڑی اماں! یہ محبتوں کے خزانے اندر چل کر بھی تو لٹائے جا سکتے ہیں۔''

اس کے ٹوکنے کا نانی اماں پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا وہ اسی طرح اسے پیار کرتی رہیں۔

''اماں! مجھے بھی تو مل لینے دیں۔'' اس آواز پر وہ بھی متوجہ ہوئی تو نانی اماں اس سے کہنے لگیں۔

''یہ تمہاری مامی جی ہیں۔'' وہ سلام کرتی ہوئی ان کے سینے سے جا لگی۔

مامی جی کی آغوش میں بھی، اپنائیت بھرا احساس تھا اور وہ تو ممتا بھری آغوش کی کب سے متلاشی تھی کتنی دیر تک ان کے سینے سے لگی کھڑی رہی، پھر ان کی ہمراہی میں طویل راہداریوں سے گزر کر اندر تک آئی تھی۔

''آرام سے بیٹھو! تھک گئی ہو گی۔'' نانی اماں کے کہنے پر اس نے پیروں کو سینڈل کی قید سے آزاد کیا اور آرام سے مسہری کے اوپر چڑھ گئی۔

پہلے نانی اماں، بڑے ابا کے تمام گھر والوں کا حال احوال پوچھتی رہیں پھر باتوں کا رُخ آپ ہی آپ اس کی مرحومہ امی کی طرف مڑ گیا ان کے ذکر پر ماحول میں آپ ہی آپ اداسی اتر آئی تھی۔

''اماں! ابھی تو بچی تھکی ہوئی آئی ہے اور آپ نے اسے اداس کر دیا۔'' مامی جی نے ٹوکا اور موضوع بدلنے کی خاطر کہنے لگیں۔

''بیٹا! تم اُٹھ کر منہ ہاتھ دھو لو، کھانا تیار ہے۔''

''جی!'' وہ اُٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی واپس آئی تو مامی جی کے ساتھ نانی اماں بھی ڈائننگ روم میں جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ وہ ان دونوں کے ساتھ چل پڑی۔ آتے ہوئے اس نے غور نہیں کیا تھا لیکن اب وہ ایک ایک چیز کو غور سے دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔

کمرے سے نکل کر طویل گیلری تھی، جس کی حد ختم ہوتے ہی کشادہ برآمدہ تھا

دائیں ہاتھ کو مڑے تو چند قدم کے فاصلے پر ڈائننگ ہال، جس میں داخل ہوتے ہی یوں لگا جیسے وہ کسی شاہی دسترخوان پر چلی آئی ہو۔ اس کی نظریں بڑی سی میز پر دور تک چلی گئیں۔

''بیٹھو!'' مامی جی نے خود ہی اس کے لیے کرسی کھینچی۔

''ارے!'' وہ شرمندہ ہوئی اور خود بیٹھنے کے بجائے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔

''جیتی رہو۔'' مامی جی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور نانی اماں کو بٹھانے کے بعد بیٹھیں تو وہ بھی ان کے برابر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

''اور سب لوگ کہاں ہیں؟'' وہ نہیں جانتی تھی کہ یہاں کون کون رہتا ہے، بس یونہی پوچھ گئی۔

''اور کون ہے تمہارے ماموں جی زمینوں پر گئے ہیں اور معظم آغا ابھی آرہے ہیں۔''

''بس!'' وہ حیرت سے بولی۔ اصل میں اتنی بڑی ٹیبل پر مختلف کھانوں کی ڈشز دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ کافی لوگ ہوں گے۔

''بیٹا! تمہارے ماموں جی کے دو ہی تو بیٹے ہیں مظم آغا اور خرم آغا۔''

نانی اماں کے بتانے پر اسے اپنی کم علمی پر ندامت ہوئی جسے چھپانے کی خاطر پوچھنے لگی۔

''خرم آغا کہاں ہیں؟''

''وہ تعلیم کے سلسلے میں گزشتہ چار سالوں سے لندن میں ہے۔''

''عجیب بات ہے۔'' اسے اعتراف کرنا پڑا۔ ''میں اپنے ننھیال کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔''

''اس میں تمہارا قصور نہیں ہے بیٹا! اگر تمہارے ابو جی وقتاً فوقتاً یہاں لے آتے تب کچھ جانتیں ناں۔'' در پردہ نانی اماں نے شکوہ کر ہی ڈالا۔

''تمہاری امی کی وفات کے بعد تو انہوں نے کبھی اِدھر کا رُخ ہی نہیں کیا۔''

''اصل میں ابو جی اتنے مصروف رہتے ہیں کئی بار سوچا، لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت آڑے آتی رہی۔'' اس نے ابو جی کا دفاع کیا۔

''خود نہیں آسکتے، تمہیں تو بھیج دیتے۔''

''آ تو گئی ہوں۔'' وہ ہلکے سے مسکرائی۔

''میرے بہت بلانے پر آئی ہو ناں تمہیں خود تو خیال نہیں آیا۔''

''مجھے خیال آتا تھا نانی اماں بس پڑھائی کی وجہ سے نہ آسکی۔ اب وہ انہیں کیا بتاتی کہ بڑے ابا کے گھر میں کہیں جانے کا تصور ہی نہیں ہے خاص کر لڑکیوں کے لیے۔

''اب تو تمہاری پڑھائی ختم ہوگئی ناں۔''

''پڑھائی بھی کبھی ختم ہوتی ہے۔'' اس نے گول مول سا جواب دیا۔

اسی وقت معظم آغا کمرے میں داخل ہوئے اور بہت خاموشی سے ٹیبل کے آخری سرے پر جا بیٹھے۔ نانی اماں شاید انہی کے انتظار میں تھیں۔ ان کے بیٹھتے ہی کھانا شروع کر دیا۔ پھر کھانا بہت خاموشی سے کھایا گیا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہاں کھانے کے دوران بولنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

''عجیب بات ہے۔'' وہ سوچنے لگی۔ ''وہاں بڑے ابا کے ڈر سے سب خاموش رہتے ہیں اور یہاں احتراماً خاموش۔ کتنا دل چاہتا ہے بندہ اتنی بڑی ٹیبل پر کچھ ہلا گلا کرے۔ اپنی پلیٹ میں آئی گرم مسالے کی کوئی سی بھی قسم کسی مگن بیٹھے بندے کی طرف اچھال دے۔ بے خیالی میں اس نے بڑی الائچی چمچ میں رکھ دی اور کن اکھیوں سے دور بیٹھے معظم کی طرف دیکھا۔ اس کے اندر چھپی وہ لڑکی جو ہواؤں کے دوش پر سفر کرتی بہت اونچی چلی جاتی تھی اور جو زندگی میں رنگ بھرنے کو ہنگامہ تلاش کیا کرتی تھی۔ اچانک بیدار ہوگئی اور قریب تھا کہ وہ یہ حرکت کر گزرتی، نانی اماں نے ٹوک دیا۔

''کیا بات ہے تم کھانا نہیں کھا رہیں؟''

''جی!'' وہ چونکی اور فوراً اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

کھانے کے بعد نانی اماں اپنے کمرے میں چلی گئیں مامی جی نے بتایا کہ وہ نماز پڑھنے کے بعد سو جائیں گی۔ وہ کیا کرتی کچھ دیر مامی جی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد سونے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ وہی کمرہ تھا جہاں آتے ہی مامی جی اور نانی اسے لے کر آئی تھیں۔ گویا انہوں نے پہلے ہی سے یہ کمرہ اس کے لیے سیٹ

کر دیا تھا۔ کھانے کے فوراً بعد وہ کبھی نہیں سوئی تھی اور اب بھی اس کا سونے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ صرف مامی جی کے خیال سے اُٹھ آئی تھی۔ کیونکہ بظاہر تو وہ اس سے باتیں کر رہی تھیں لیکن جس طرح ان پر سستی سوار تھی اس سے وہ سمجھ گئی کہ وہ اسی وقت سونے کی عادی ہیں اور محض اپنی خاطر دوسرے کی روٹین خراب کرنا اسے پسند نہیں تھا۔

وہ کمرے میں بلا مقصد ہی ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتی رہی۔ اسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا کہ اتنی بڑی حویلی میں کوئی ہلچل نہیں اور ہلچل تو دُور کی بات یہاں تو کسی کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ سب ملازم بھی اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے گئے تھے۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا ساڑھے دس ہو رہے تھے۔

''گویا یہاں آ کر بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی نہ کوئی نیا پن۔'' اس نے سوچا اور بے دلی سے آ کر لیٹ گئی۔ پھر وہ بڑے ابا کے گھر اور اس حویلی کا موازنہ کرتے کرتے ہی سو گئی تھی۔

صبح ناشتے سے پہلے ہی ماموں جی بھی آ گئے۔ اس سے بڑی محبت اور شفقت سے ملے اور بہت دیر تک اپنے پاس بٹھا کر اس کا حال احوال پوچھتے رہے ناشتے کے بعد وہ نانی اماں کے پاس بیٹھ کر ان سے اپنی امی کی باتیں کرتی رہی۔ مامی جی کے میکے سے کچھ خواتین آئی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے ساتھ مصروف تھیں۔ اور جب نانی اماں اس کے پاس سے اُٹھ کر گئیں تو اس نے سوچا یہاں رہنا تو اور بھی مشکل ہے۔ وہاں کم از بات کرنے کے لیے کسی کو تلاش تو نہیں کرنا پڑتا ہر وقت ہی سونیا وغیرہ کے ساتھ کمپنی رہتی ہے۔

''یہاں آتے ہوئے کتنی خوش تھی میں۔'' ابھی اسے آئے ہوئے زیادہ وقت بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس انداز سے سوچ رہی تھی۔ ''میرا خیال تھا اس محدود زندگی سے نکلنے کا سنہری موقع ہاتھ آیا ہے۔ اور میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ جس خول میں بڑے ابا نے ہمیں زبردستی بند کر دیا ہے اسے میں یہاں آتے ہی توڑ دوں گی نہ اونچی آواز میں ہنسنے کی خواہش کو دباؤں گی اور نہ اپنے بھاگتے قدموں کو روکوں گی۔'' اس نے ہونٹوں تک آئی طویل سانس کو آزاد کیا۔

''گو کہ یہاں ہنسنے پر پابندی نہیں ہے لیکن میرے قہقہوں کی آواز ان دیواروں

سے ٹکرا کر بازگشت بن جائے گی اور ہنسنے کو بھی کوئی بہانا چاہیے۔ یہاں تو بہانا ہی نہیں ہے۔ اور نہ کوئی ساتھی۔''

اس کے ساتھ ہی معظم آغا کا خیال آیا اور وہ ان کے بارے میں سوچنے لگی۔

''پتا نہیں۔ سارا وقت کہاں رہتے ہیں بس کھانے پر ہی نظر آتے ہیں کم از کم انہیں تو سوچنا چاہیے کہ میں ان کے گھر مہمان آئی ہوں۔''

دوپہر میں اس نے چاہا کہ سو جائے لیکن کوشش کے باوجود نیند نہیں آئی۔ لیٹے لیٹے تھک گئی تو اُٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ گرمیوں کی دوپہر تھی۔ اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر دیکھا وسیع لان سے آگے اونچی دیواروں کے پاس لائن سے کھڑے درخت بالکل خاموش تھے نہ سرسراتی ہوا تھی اور نہ خشک پتوں کے ٹکرانے کا ہلکا سا شور۔ اس کا دل چاہا، اس خاموش فضا میں ایک بار زور سے تالی بجا دے اور پھر اس کی بازگشت سنے۔ اپنی اس بچگانہ خواہش، پر وہ خود ہی ہنسی اور پھر پلٹ کر اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ یونہی ٹہلتی ہوئی برآمدے کے آخری سرے تک چلی آئی۔ بائیں طرف ویسی ہی گیلری تھی جیسی اس کے کمرے کے آگے تھی اس نے کچھ دیر وہیں رُک کر کچھ سوچا پھر اس طرف مڑ گئی۔

پہلا دروازہ بند تھا اور اس سے اگلا دروازہ بھی گو کہ بند تھا لیکن اندر سے ہلکے ہلکے شور کی آواز آ رہی تھی۔

گویا کوئی موجود ہے۔ اس نے سوچا اور دستک دینے کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی پہلی نظر میں یوں لگا جیسے وہ کسی اسٹور میں داخل ہو گئی ہو۔ ایک طرف پتھروں کا انبار تھا۔ ساتھ ہی لوہے کے اوزار بھی رکھے ہوئے تھے۔ وہ پلٹنے کو تھی کہ ایک طرف سے ٹھک ٹھک کی آواز پر اُدھر متوجہ ہوئی۔ دری پر بیٹھے معظم آغا کو دیکھ کر چونکی وہ ایک بڑا سا پتھر ہاتھ میں لیے اسے تراشنے میں مصروف تھے۔ اپنے کام میں اتنے منہمک تھے کہ انہیں اس کے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی اور وہ ان کے ڈسٹرب ہونے کے خیال سے بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی ان کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے کوئی چیز اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا تھا کہ نظر اس کے پیروں پر پڑی فوراً سر اٹھا کر دیکھنے لگے۔

''وہ.... میں'' اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی یہاں آمد کا کیا جواز پیش کرے۔

"اگر آپ بیٹھنا چاہیں تو بیٹھ جائیں۔" انہوں نے اپنے سامنے دری پر اشارہ کیا۔

"میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کروں گی۔" وہ بیٹھتے ہوئے سادگی سے بولی تو انہوں نے ہاتھ میں پکڑا پتھر نیچے رکھ دیا اور یوں اس کی طرف دیکھنے لگے کہ وہ نروس ہوگئی۔

"آپ شاید بہت بور ہو رہی تھیں۔" اس نے جواب نہیں دیا۔

"یہاں آ کر آپ کو عجیب سا تو لگا ہوگا۔" وہ پتا نہیں کس وجہ سے ایسا کہہ رہے تھے۔ بہر حال حقیقت یہی تھی اس کے باوجود اسے کہنا پڑا۔

"نہیں تو عجیب کیوں لگے گا؟"

"ظاہر ہے، آپ روشنیوں، رنگوں اور ہنگاموں کے شہر کی پروردہ ہیں۔ وہاں کے مقابلے میں یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے اور پھر میرا خیال ہے، وہاں آپ بہت سارے لوگوں کے درمیان رہتی ہیں۔"

"ہاں لیکن۔" وہ بے خیالی میں جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ ایک دم خاموش ہوگئی۔

"لیکن کیا؟" وہ پوچھے بغیر رہ نہ سکے۔

"لیکن یہ کہ مجھے یہاں عجیب سا نہیں لگ رہا۔" وہ بات بنا گئی۔

"اچھا!" وہ یوں ہنسے جیسے انہیں اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ "یہ تو مان لیں صبا احمد کہ وہاں کے ہنگاموں سے گھبرا کر انسان کچھ وقت کے لیے تو اس ماحول کی تمنا کرتا ہے لیکن زیادہ دیر تک یہاں رُک نہیں سکتا۔"

"شاید" پھر وہ موضوع بدلنے کی خاطر ان کا رکھا ہوا پتھر اُٹھا کر کہنے لگی۔ "یہ آپ کیا کر رہے تھے؟"

"میں اسے تراش کر کسی شکل میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"ارے!" اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ "آپ مجسمے بھی بنا لیتے ہیں۔"

"صرف مجسمے ہی بنا سکتا ہوں جان ڈالنے پر قدرت نہیں رکھتا۔ آیئے آپ کو اپنی بنائی ہوئی چیزیں دکھاؤں۔"

وہ اُٹھتے ہوئے بولے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی کھڑی ہوگئی۔ اسی کمرے کی مشرقی دیوار میں ایک دروازہ نظر آ رہا تھا وہ اسے لے کر اسی طرف بڑھ گئے۔ ان کے

ساتھ جب وہ اس دروازے کے اندر داخل ہوئی تو کتنی دیر تک وہیں کھڑی حیرت سے چاروں طرف گردن گھما کر دیکھتی رہی۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسے چونکا دیا۔

"آیئے۔ قریب سے دیکھ لیں۔" وہ جیسے خواب میں چل رہی تھی ہر دو قدم پر پھر رُک جاتی۔ سنگ تراشی کے بہترین نمونے جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے اور نہ ہی وہ اس فن کے بارے میں زیادہ جانتی تھی۔

"معظم آغا! یہ سب آپ نے کیسے بنائے ہیں؟"

اس کا لہجہ بھی حیرتوں سے گندھا تھا۔ میز پر رکھی ایک مورتی کو اُٹھا کر وہ ہر زاویے سے اسے دیکھ رہی تھی۔

معظم آغا کی نظریں اس کے نرم ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں میں اُلجھنے لگیں اور پھر انگلیوں سے ہٹ کر چہرہ گرفت میں آیا اس کے تراشیدہ لب جانے کس احساس کے تحت کبھی نیم وا ہوتے اور پھر فوراً ہی ایک دوسرے میں مدغم۔ پلکوں کی جھالریں الگ دل کے تاروں کو چھیڑنے لگی تھیں۔

"بہت خوبصورت۔" وہ مورتی کی تعریف کر رہی تھی۔

"واقعی۔" ان کے دل نے اس کے بارے میں گواہی دی۔

"معظم آغا! آپ نے تو کمال کر دیا۔" اس نے پلکیں اُٹھا کر ایک دم ان کی طرف دیکھا تو وہ ذرا سا رُخ موڑ گئے۔

"اب تک میں بھی یہی سمجھتا رہا کہ میں کمال کر رہا ہوں لیکن اب مجھے یہاں کی ہر شے ادھوری لگتی ہے۔ نامکمل۔ کوئی شاہکار میرے ہاتھوں تخلیق نہیں ہوا۔"

"نہیں معظم آغا! یہ سب شاہکار ہی تو ہیں۔"

"شاہکار تو وہ ہے جسے میری آنکھوں نے دیکھا ہے۔"

وہ اس کی طرف دیکھنے کے بجائے ریک میں سجے مجسمے پر نظریں جماتے ہوئے بولے۔ اس لیے فوری طور پر وہ سمجھ نہیں سکی کہ وہ اس کے بارے میں کہہ رہے ہیں۔

"میرا خیال ہے، اس کائنات میں ایسا کوئی پتھر ہی نہیں جسے میں اس کی صورت میں ڈھال سکوں یا پھر میرے ہاتھ ہی اتنی طاقت نہیں رکھتے۔" پھر اس کی طرف دیکھتے

ہوئے کہنے لگے۔

''پتھروں سے میں ایسے ہونٹ تراش سکتا ہوں لیکن جو خوبصورتی ان کے متحرک ہونے میں ہے وہ ان جامد لبوں میں کہاں ہوگی بھلا؟''

''میرے خدا!'' اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور آنکھوں کی پاسبان گھنی پلکیں کبھی اٹھتیں اور کبھی جھکتی چلی جاتیں۔ وہ اس کے نروس ہونے پر خاصے محظوظ ہوئے اور چاہا کہ بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیں لیکن وہ شاید ان کا ارادہ بھانپ چکی تھی فوراً پلٹ کر کمرے سے نکل گئی۔

پھر اگلے دو دن وہ معظم آغا کا سامنا کرنے سے کتراتی رہی۔ اس کا خیال تھا سامنا ہونے پر وہ پھر ایسی کوئی بات کہہ دیں گے جس سے وہ زیادہ دیر ان کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس وقت جبکہ اس کی بوریت انتہا کو پہنچ چکی تھی اور وہ برآمدے میں کھڑی جھنجلاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اسے واپس چلے جانا چاہیے کہ معظم آغا اس کے پاس آکر کہنے لگے۔

''آپ ابھی تک سوئیں نہیں۔''

''میں اتنی جلدی نہیں سوتی۔'' اس کے لہجے میں خفگی تھی۔

''سوری، میں بھول گیا تھا آپ کے ہاں تو اس وقت ہنگامے جاگتے ہیں۔''

''آپ ہر بات میں یہاں اور وہاں کا فرق کیوں بتانے لگتے ہیں؟'' وہ ناگواری سے بولی۔

''سچ کہیں کیا آپ یہاں اور وہاں کا موازنہ نہیں کرتیں۔''

''کرتی ہوں لیکن ہر وقت نہیں۔''

''چلیے جانے دیں۔ اگر نیند نہیں آرہی تو میرے کمرے میں آجائیں۔''

انہوں نے بہت عام سے لہجے میں یہ بات کہی تھی وہ کچھ دیر رُک کر ان کے ساتھ چل پڑی۔ اسی اسٹور نما کمرے میں اسے سامنے بٹھا کر وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

''پتھروں کے درمیان رہ کر یہ شخص خود کسی دن پتھر ہو جائے گا۔'' اس نے سوچا اور ان کی انگلیوں میں دبے چھوٹے سے پتھر کو بغور دیکھنے لگی جس پر وہ پتا نہیں کیا لکھ رہے

تھے اور پھر بالکل انہی کی طرح اس کی نظریں بھی انگلیوں سے ہٹ کر ان کے چہرے پر بھٹکنے لگیں۔ بڑی بڑی آنکھیں پوری توجہ سے ایک ہی نقطے پر مرکوز تھیں اور آنکھوں سے ذرا اوپر کشادہ پیشانی جسے اب بھی گھنے بال ڈسٹرب کر رہے تھے۔ انگلیوں کی حرکت کے ساتھ ہی ہونٹ بھی اسی انداز سے زاویہ بدل رہے تھے۔ اس کے اندر کی لڑکی پھر اچانک بیدار ہونے لگی۔ دل چاہا ان کے گھنے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکے سے ان کا سر اونچا کر دے اور جو وہ خفا ہوں تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے کہ ماحول پر چھایا گہرا سکوت ایک چھناکے سے ٹوٹ جائے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے اندر کی لڑکی کو تھپک تھپک کر دوبارہ سُلا دیا۔

''آپ نے کبھی ان مجسموں کی نمائش کی؟'' وہ ذرا سا اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے کہ وہ پوچھنے لگی۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''یہ پتھر کی مورتیاں میرے جذبوں کی ترجمان ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی دیدہ ور ان کے ذریعے میرے ان جذبوں تک رسائی حاصل کرے۔ جنہیں میں اپنے آپ سے بھی پوشیدہ رکھتا ہوں۔''

''معظم آغا!'' وہ کتنی دیر تک ان کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔

''ہر وہ شخص جو کسی ایسے فن میں کمال رکھتا ہے، وہ اپنے جذبات واحساسات کو اسی ذریعے سے لوگوں تک پہنچاتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن۔''

''لیکن۔'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جو معاشرتی مسائل کا مشاہدہ کرنے کے بعد انہیں لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں اور کسی حد تک وہ خود بھی ان مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔''

''تو کیا آپ کے نزدیک معاشرتی مسائل کی کوئی اہمیت نہیں۔''

''اہمیت کیوں نہیں لیکن میرا خیال ہے میں ان کی بہتر عکاسی نہیں کرسکوں گا۔''

''کیوں؟''

"اس لیے کہ مجھے ان مسائل کا سامنا نہیں اور میں صرف دیکھنے کی حد پر یقین نہیں رکھتا۔ حقیقی معنوں میں کسی کے مسائل کا اندازہ انسان اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ خود انہی آزمائشوں سے گزر چکا ہو۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"آپ ہی بتائیے، ایک اطمینان بھرا دل کسی کو مصیبت میں دیکھ کر کیا محسوس کرے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہے گا کہ شکر ہے میں ٹھیک ہوں۔"

"نہیں معظم آغا!" وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بولی۔ "ایک مسائل میں گھرے شخص نے اگر دوسرے کے مسائل کو محسوس کیا تو کیا کمال کیا۔ کمال شخص تو وہ ہوگا جس کا اپنا پیٹ کبھی خالی نہیں رہا پھر بھی وہ خالی پیٹ کی آواز سن سکتا ہو۔ جو خود کبھی بے آسرا نہیں ہوا لیکن دوسرے کی بے سائبانی کا احساس ہو۔"

وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھے گئے، وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ نے اپنی ان مورتیوں میں صرف محبتوں کے رنگ بھرے ہیں میں پوچھتی ہوں کیا محبت ہی سب کچھ ہے؟"

"میں نے کہا ناں صبا! کہ میں دوسرے جذبوں کو بھی مانتا ہوں بلکہ ان کی حقیقت پر اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ محبت پر لیکن بات پھر وہی آجاتی ہے کہ انہیں تخلیق کرتے ہوئے کم از دل درد آشنا تو ہو۔"

"گویا آپ کے دل کو ابھی کوئی ہلکی سی ٹھیس بھی نہیں لگی؟" وہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے تو وہ ہلکے سے مسکرائی۔

"معظم آغا! آپ اپنے ان فن پاروں کے ذریعے محبتوں کا پیغام بھی تو دے سکتے ہیں۔"

"کیسے؟" وہ بے خیالی میں پوچھ گئے۔

"ہر خاص و عام کو۔ یقین کریں، زندگی کو زہر کا پیالہ سمجھ کر پینے والوں کے لیے پیغام امرت ہوگا۔"

"صبا!" انہوں نے اسے ٹوک دیا "ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ محبت ہی سب

کچھ نہیں ہے۔"

"میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ ایسا تو میں صرف آپ کے لیے کہہ رہی ہوں۔ کیونکہ آپ نے محبت کے علاوہ کسی اور جذبے کا مزا نہیں چکھا اور نہ ہی آپ کا دل درد آشنا ہے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"ایک بات بتائیں آغا! کیا آپ اپنی اس زندگی سے مطمئن ہیں؟ کوئی شور نہیں، کوئی ہنگامہ نہیں۔ ایک گہرا سکوت ہے۔ کیا دل میں یہ خواہش نہیں جاگتی کہ اچانک کوئی ایسی بات ہو جائے کہ دل یا تو ٹھہرتا سا لگے یا اس انداز سے دھڑکے کہ سنبھالنا مشکل ہو جائے۔"

"کیا ایسی کوئی بات ہوتی ہے؟"

ان کے پوچھنے پر اس نے طویل سانس لے کر سر اونچا کر لیا اور نظریں ان کے چہرے پر جما دیں اور یہی ایک پل تھا، جب اس کی جھیل آنکھوں کی گہرائیں میں دیکھتے ہوئے دل میں شور برپا ہو گیا۔ کہیں کچھ نہیں ہوا تھا نہ کوئی دیوار گری نہ کوئی شیشہ ٹوٹا پھر بھی آس پاس چھنن چھنن کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

☆......☆......☆

اسے یہاں آئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے تھے اس دوران ایک بار ابوجی کا فون آیا تھا وہ ان سے کہنا چاہتی تھی کہ وہ واپس آنا چاہتی ہے لیکن اس سے پہلے ہی نانی اماں نے کہہ دیا کہ وہ ابھی یہیں رہے گی۔ اب وہ نانی اماں سے کیا کہتی کہ یہاں اس کا بالکل دل نہیں لگ رہا۔ اس لیے وہ اسے روکنے کی بات نہ کریں۔ مجبوراً خاموش ہو رہی۔ اسے اپنی کزنز بہت یاد آرہی تھیں۔ سونیا کی بات کہ خوب گھومنا پھرنا۔ مری اور اسلام آباد قریب ہیں، وہاں ضرور جانا۔

مری اور اسلام آباد۔ وہ دل ہی دل میں ہنسی اور ٹہلتی ہوئی لان کے آخری سرے تک چلی گئی۔ کچھ ایسے پودے بھی نظر آرہے تھے جن کے بارے میں وہ بالکل بھی

نہیں جانتی تھی۔ ان کی شاخوں پر خوشنما پھول بہت بھلے لگ رہے تھے۔ وہ ایک ایک پھول کو انگلیوں کی پوروں سے چھو کر دیکھنے لگی۔ اتنی محو تھی کہ کسی کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی وہ تو آنے والا اس کے بالکل قریب پہنچ کر زور سے چیخا۔

''واؤ۔''

وہ ایک دم سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ پتا نہیں کون تھا بلیو جینز پر بلیو شرٹ اور کاؤ بوائے قسم کا ہیٹ پہنے ہوئے تھا کندھے پر لٹکا بیگ بتا رہا تھا کہ کہیں دور سے آیا ہے۔

''آپ کون ہیں؟'' اس کے پوچھنے پر وہ دلکشی سے مسکرایا اور یہی سوال اس سے کر ڈالا۔

''میں میں ہوں۔'' گھبراہٹ میں وہ یہی کہہ سکی اور وہ زور سے ہنسا۔

''اور میں بھی میں ہوں۔''

''میرا مطلب ہے، میں صبا ہوں۔''

''آپ نہ بھی بتاتیں تو میں جان جاتا۔''

''کیسے؟'' وہ حیران ہوئی۔

''احساسات کو نرمی سے چھونے والی صبا ہی ہو سکتی ہے'' اس کے رُخ موڑنے پر کہنے لگا۔

''مشرقی لڑکیوں کی یہی ادا تو انہیں مغربی لڑکیوں سے ممتاز کرتی ہے۔''

''آپ؟'' وہ فوراً اس کی طرف پلٹی۔

''خرم آغا۔''

''ارے میں نے واقعی آپ کو نہیں پہچانا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، اب پہچان لیا ہے۔''

''جی۔''

''تو پھر اپنا تعارف بھی کروا دیجیے؟''

''میں صبا ہوں، آپ کی کزن، کراچی سے آئی ہوں۔''

''اچھا تو آپ پھوپھی جی کی بیٹی ہیں۔''

''جی۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

''شکریہ، اور یہ آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں اندر چلیے ناں۔''

''ہاں!'' اسے جیسے یاد آیا اور اس کے ساتھ چلتا ہوا اونچی آواز میں چلانے لگا۔

''امی، بڑی اماں! میں آ گیا ہوں۔''

خاموش فضاؤں کو توڑتی اس کی آونچی آواز بڑی بھلی لگ رہی تھی اس کے اندر کی لڑکی پھر مچلنے لگی۔ دل چاہا وہ اپنی آواز کو اس کی آواز کے ساتھ شامل کر لے۔ مامی اور نانی اماں اس کی آواز سن کر باہر نکل آئیں۔ اس نے کندھے پر لٹکا بیگ اتار کر وہیں پھینکا اور دونوں کو ایک ساتھ بازوؤں میں لے لیا۔ وہ کھڑی دلچسپی سے یہ منظر دیکھتی رہی۔ مامی جی بغیر اطلاع آنے کا شکوہ کر رہی تھیں۔

''بس اچانک آپ سے ملنے کو دل مچلنے لگا اور میں اسی وقت چل پڑا۔''

''اچھا کیا چلے آئے۔'' نانی اماں کہنے لگیں۔ ''اور اب دوبارہ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یہ تو بعد کی بات ہے۔ یہ بتایئے ابو جی اور معظم بھائی کہاں ہیں۔'' پھر اُٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ ''معظم بھائی یقیناً پتھروں سے سر پھوڑ رہے ہوں گے میں وہیں ان سے مل لیتا ہوں بلکہ انہیں لے کر آ رہا ہوں۔''

وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا چلا گیا کچھ دیر بعد وہ معظم آغا کے بازو میں اپنا بازو پھنسائے آ رہا تھا۔ وہ بے خیالی میں باری باری دونوں کو دیکھے گئی۔

اور پھر ایک وہی آیا تھا اور فضاؤں نے رنگ بدل لیے تھے وہ سکوت وہ خاموشی اور سناٹا سب کے آنے سے کہیں دور پرواز کر گئے تھے۔ وہ ایک ذرا سی بات کو بھی اس انداز سے کرتا کہ دور تک آواز سنائی دیتی تھی پوری حویلی ہر پل اس کی آوازوں گونجتی رہتی اور جب خود خاموش ہوتا تو فل آواز میں ڈیک بجاتا۔ گویا اسے بھی خاموشی پسند نہیں تھی اور ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے ہوئے نانی اماں کے بار بار ٹوکنے کے باوجود وہ چپ نہیں ہوتا تھا جانے کہاں کہاں کے قصے چھیڑتا جو ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تھے۔ دو دن میں

اس سے یوں بے تکلف ہو گیا تھا جیسے برسوں سے اس سے دوستی ہو۔

اور وہ تو برسوں سے خاموشیوں کے حصار سے نکلنے کو بے تاب تھی اور وہ خول جس میں بڑے ابا نے زبردستی اسے اور اس کی کزنز کو بند کر رکھا تھا جسے وہ خود نہیں توڑ سکتی تھی لیکن چاہتی ضرور تھی کہ کوئی توڑ ڈالے اور خرم آغا نے توڑ ڈالا۔ اس نے احتجاج نہیں کیا بلکہ اندر چھپی وہ لڑکی جسے وہ اکثر ہی تھپک تھپک کر سلا دیا کرتی تھی وہ بھی پوری طرح بیدا ہو گئی۔

''صبا، صبا!'' حسب عادت وہ اسے گیلری میں سے آوازیں دیتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ اس کے وہاں تک آنے سے پہلے ہی کمرے سے نکل آئی۔ اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میرے ساتھ چلو۔''

''کہاں؟''

''میں ایک کام سے اسلام آباد جا رہا ہوں۔ تم بھی چلو۔''

''سچ!'' وہ ایک دم کہہ گئی پھر سوچتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں کیسے جاؤں؟''

''جیسے میں جاؤں گا۔''

''نہیں۔ میرا مطلب ہے، پتا نہیں نانی اماں اجازت دیں گی یا نہیں۔''

''کیوں وہ منع کریں گی کیا؟''

''پتا نہیں۔''

''چلو، میں پوچھتا ہوں۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چل پڑا اور یونہی نانی اماں کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

''بڑی اماں! میں صبا کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔'' اس نے کہا تو نانی اماں اس کی طرف دیکھنے لگیں اور وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ وہ بول پڑا۔

''بڑی اماں! آپ نے تو اسے حویلی میں بند کر کے رکھ دیا ہے جبکہ یہ یہاں تفریح کی غرض سے آئی ہو گی۔''

''میں منع نہیں کر رہی بیٹا لیکن ذرا خیال سے جانا اور ہاں شام ڈھلنے سے پہلے

لوٹ آنا۔''

''اوکے!'' نانی اماں کی تسلی کی خاطر اس نے ان سے جلد لوٹ آنے کا وعدہ کیا پھر اسے لے کر باہر نکل آیا۔

''میں کپڑے نہ چینج کر لوں۔'' وہ اپنے کپڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''ہاں، لیکن ذرا جلدی۔''

''بس ابھی آئی۔'' وہ وہیں سے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ کچھ دیر بعد جب وہ واپس آئی تو وہ وہاں موجود نہیں تھا۔

''آغا!'' اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر اونچی آواز میں پکارا۔ ان چند دنوں میں وہ مکمل طور پر اندر کی لڑکی کی گرفت میں آ چکی تھی۔ نہ اونچی آواز میں بولنے سے اپنے آپ کو باز رکھتی اور نہ بھاگتے قدموں کو روکتی تھی۔

''آغا!'' دوبارہ پکارا اور اپنے پیچھے قدموں کی آواز سن کر پلٹی تو معظم آغا آ رہے تھے۔

''یہ خرم کہاں چلا گیا؟'' وہ انہی سے پوچھنے لگی۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔

''عجیب آدمی ہے مجھے جلدی کا کہہ کر خود کہاں چلا گیا۔''

''کہیں جا رہی ہو؟'' وہ پوچھنے لگے۔

''ہاں خرم کے ساتھ اسلام آباد۔'' اسی وقت وہ آ گیا۔

''ریڈی!'' پھر معظم آغا کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''بڑے بھائی! آپ بھی چلیں۔''

''میں کیا کروں گا جا کر؟'' وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

''چلے چلیں، ہو سکتا ہے راستے میں کوئی نایاب پتھر نظر آ جائے۔''

''پتھر سب ایک سے ہوتے ہیں۔'' انہوں نے کہا اور واپس پلٹ گئے تو وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جواب میں اس نے بھی مسکرانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی تھی۔

یہاں آتے ہوئے وہ اسی راستے سے معظم آغا کے ساتھ آئی تھی۔ وہ رات کا وقت تھا اور اب دن کے اُجالے میں وہ اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ باہر کا موسم اچھا تھا اور

اندر کا اس سے کہیں زیادہ اچھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی اور ساتھ اس کا باتیں کرنے کا دلنشین انداز۔ وہ حقیقت میں ہواؤں میں اُڑنے لگی تھی۔

''پتا ہے صبا!'' وہ کہنے لگا۔ ''اگر تم یہاں نہ ہوتیں تو میں فوراً واپسی کا سوچتا۔''

''کیوں؟'' وہ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''مجھے حویلی کا ماحول اٹریکٹ نہیں کرتا۔ ایک نامعلوم سی اُداسی چھائی رہتی ہے۔ کوئی ہلا گلا، کوئی ہنگامہ نہیں۔ وقت ایک جگہ ٹھہرا ہوا سا لگتا ہے۔ جبکہ مجھے تیز رفتاری پسند ہے۔ چار سال پہلے میں یہاں کے ماحول سے اُکتا کر ہی یہاں سے گیا تھا۔ اب بھی میں صرف یہ دیکھنے آیا ہوں کہ یہاں کوئی تبدیلی ہوئی ہے یا نہیں۔ لیکن سب کچھ وہی ہے۔ بڑی اماں اور امی کی وہی روٹین ہے۔ معظم آغا اسی طرح پتھروں میں گھرے رہتے ہیں اور ابو جی کی اپنی الگ دنیا۔ پتا نہیں یہ سب لوگ اتنے مطمئن کیسے رہتے ہیں۔''

قدرے توقف کے بعد اس سے پوچھنے لگا۔

''تم نے یہاں اتنے دن کیسے گزارے؟''

''بڑی مشکل سے۔ اور اب تو میں بھی واپسی کا سوچ رہی تھی کہ تم آ گئے اور پتا ہے، جب سے میں آئی ہوں۔ آج پہلی بار تمہارے ساتھ نکل رہی ہوں۔''

''مائی گاڈ!'' اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ کراچی میں تو تمہاری اچھی خاصی سوشل لائف ہو گی۔''

''ہاں کافی حد تک۔'' اس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''میں نے کئی بار ابو جی سے کہا کہ وہ اس دیہات سے نکل کر کراچی سیٹل ہونے کا سوچیں لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔ ابھی آتے ہوئے میں ایک دن کراچی رُکا تھا اور وہ مجھے کسی طرح بھی یورپ کے ترقی یافتہ شہروں سے کم نہیں لگا۔ ویسی ہی افراتفری اور ویسے ہی بھاگتے دوڑتے لوگ جیسے ایک لمحے کی تاخیر ان کے لیے کسی بڑے نقصان کا سبب ہو گی اور یہاں دیکھو۔''

اس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کرتے ہوئے اطراف میں پھیلے کھیتوں کی طرف اشارہ کیا۔

کوئی سر پر بڑا سا گٹھڑا اٹھائے جا رہا تھا اور کسی کے کندھے پر کلہاڑا لٹک رہا تھا۔ اپنے آپ میں مگن آہستہ روی سے چلتے ہوئے کسی کو یہ احساس نہیں تھا کہ اگر وقت پر نہ پہنچے تو ان کے حصے کی مزدوری کوئی اور لے جائے گا۔''

''مجھے یہ رینگتی ہوئی زندگی اچھی نہیں لگتی۔ گو کہ میری پڑھائی ختم ہو گئی ہے لیکن میں نے ابو جی سے کہا ہے، ابھی ایک سال باقی ہے۔ اور اب جو میں اس بہانے جاؤں گا تو واپس نہیں آؤں گا۔''

وہ کیا کہتی، خاموش ہی رہی اور اس نے ایک دم کیسٹ کی آواز بہت اونچی کر دی۔

Over night over day تیز میوزک کے ساتھ تیز آواز۔ اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کر پلکیں موند لیں، کتنا راستہ یونہی کٹ گیا۔ بند پلکوں کے پیچھے وہ اپنے آپ کو بہت بلندی پر محسوس کر رہی تھی۔ ہواؤں کے دوش پر سفر کرتی اس مقام پر جا کھڑی ہوئی تھی جہاں سے اسے اس کائنات میں بکھرے سارے رنگ ایک ساتھ نظر آ رہے تھے۔ تصور میں ہی سہی انسان اپنی من پسند دنیا میں قدم رکھ دے تو اس کا عکس آپ ہی آپ چہرے پر جھلکنے لگتا ہے۔ وہ اونچے مقام پر کھڑی سارے رنگوں کو ایک ساتھ دیکھ رہی تھی اور اسے احساس تک نہیں تھا کہ وہ سارے رنگ اس کے چہرے پر اُتر کر اسے کس قدر حسین بنا رہے ہیں اور اسے تو اپنے ہونٹوں کی کلیوں کے چٹکنے کا احساس بھی نہیں تھا جبکہ وہ کتنی دیر سے اسے مرر میں دیکھ رہا تھا۔

پہلے مسکرایا پھر ڈسٹرب ہوا اور آخری لمحوں میں اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ کر گیا۔ گزشتہ چار برسوں سے جس ماحول میں نہ صرف رہ رہا تھا بلکہ بہت حد تک اسے اپنا بھی چکا تھا۔ اس کے پیشِ نظر وقت کا انتظار کرنے کے بجائے اسی وقت دل کی بات زبان پر لے آیا۔ گو کہ وہ اسے اس کے تصور سے چونکانا نہیں چاہتا تھا چاہتا تھا کہ وہ بہت دیر تک اسی طرح بیٹھی رہے اور وہ اسے دیکھتا رہے لیکن دل اپنی بات کہنے کو بے تاب تھا۔ اس لیے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ بند کر دیا اور اس کی محویت شاید اسی شور کی مرہونِ منت تھی۔ فوراً چونک کر سیدھی ہو بیٹھی اور اس کی طرف یوں دیکھنے لگی جیسے شکوہ کر رہی ہو، کیوں بند کر دیا۔

''سوری، میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔'' وہ اس کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"نہیں تو۔" اسے کہنا پڑا۔

"سنو، مجھ سے شادی کرو گی؟"

وہ بڑے آرام سے یہ بات کہہ گیا اور وہ لاکھ اپنے ماحول سے فرار حاصل کرے یا بڑے ابا کی لگائی حد بندی توڑ ڈالے۔ اس کی جڑیں بہر حال اسی ماحول میں دُور دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی بات پر دل زلزلوں کی زد میں آ گیا۔

"بتاؤ ناں!" وہ پوچھ رہا تھا اور اسے اپنی بات یاد آئی اس نے معظم آغا سے کہا تھا۔

"کیا دل میں یہ خواہش نہیں جاگتی کہ اچانک کوئی ایسی بات ہو جائے کہ دل یا تو ٹھہرتا سا لگے یا اس انداز سے دھڑکے کہ سنبھالنا مشکل ہو جائے۔"

اور یہ بات اچانک خود اس کے ساتھ ہو گئی۔ دل ٹھہرا نہیں لیکن اس انداز سے دھڑک رہا تھا کہ سنبھالے نہیں سنبھلا۔

"ایسا بھی ہوتا ہے۔" دھڑکنوں کے درمیان اس نے سوچا اور وہ تو اب سوچ رہی تھی جبکہ معظم آغا نے اس وقت سوچا تھا جب ان کے آس پاس چھنن چھنن کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

"صبا!" اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "کہاں کھو گئیں؟"

وہ چونک اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ میں سوچ رہی ہوں، مجھے کیا جواب دینا چاہیے۔"

"اچھا!" وہ ہنسا۔ "چلو اچھی طرح سوچ لو، پھر جواب دینا۔"

گاڑی اسلام آباد کی شفاف سڑکوں پر دوڑنے لگی تھی وہ ذہن سے ہر سوچ جھٹک کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ یہاں ہنگامہ نہیں تھا اور نہ ہی کراچی جیسی افراتفری پھر بھی پرسکون ماحول اچھا لگ رہا تھا۔ ایک عمارت کے سامنے اس نے گاڑی روک دی اور اس سے کہنے لگا۔

"تم یہیں بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔ اور سنو، یہاں میرا کام صرف پانچ منٹ کا ہے پھر ہم مری چلیں گے۔"

پھر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُتر کر چلا گیا۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور ابھی اس کے راستے پر نظریں جمی ہوئی تھیں کہ وہ بھی آ گیا۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ پوچھنے لگا۔

"تم گئے کب تھے؟" اس نے سوچا اور ایک لطیف سے احساس میں گھر کر نظریں دور آسمانوں پر بھٹکتی چھوڑ دیں۔

☆......☆......☆

زندگی کا یہ رُخ اس کے لیے واقعی بہت حسین تھا۔ نہ کوئی روک ٹوک نہ سرد نگاہوں کا سامنا تھا۔ پھر وہ قدموں کو کیوں کر روکتی؟ آنکھیں بند کر کے اس راہ پر چل پڑی جس کی کبھی وہ خود متلاشی تھی۔ اور اب اس نے واضح کر دی تھی۔ کبھی اس کے کمرے میں بیٹھ کر تیز میوزک کے دوران سرگوشیوں میں باتیں اور کبھی پرسکون لان میں اونچی آواز میں چلانا۔ اس کے لیے ایسی ہی باتوں میں کشش تھی۔

اس روز وہ لاہور جا رہا تھا۔ کیونکہ اسی دن واپسی متوقع نہیں تھی۔ اس لیے وہ ساتھ نہ جا سکی۔ گو کہ دل اس کے ساتھ جانے کو مچلا تھا لیکن شاید ذہن نے ابھی بڑے ابا کی لگائی ہو حد بندیاں پوری طرح نہیں توڑی تھیں۔ اس لیے نہ صرف سرزنش کی بلکہ جانے سے بھی باز رکھا۔ اس کے جانے تک بار بار یہی کہتی رہی۔

"جلدی آ جانا ورنہ میں بہت بور ہوں گی۔"

اور واقعی وہ بہت بور ہو گئی۔ اسے گئے ہوئے زیادہ دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ ادھر سے اُدھر چکرانے لگی۔ دوپہر تک اس پر اچھی خاصی جھنجلاہٹ سوار ہو چکی تھی۔

کھانے کے بعد وہ نانی اماں کے ساتھ انہی کے کمرے میں آ گئی اور ان سے باتیں کرتے کرتے سو بھی گئی تھی۔ سہ پہر میں اچانک ہی آنکھ کھل گئی تھی۔ نانی اماں کی

طرف دیکھا، وہ سو رہی تھیں۔ وہ اُٹھ کر کمرے سے نکل آئی دھوپ مشرقی دیوار کے اوپر چلی گئی تھی لیکن ہلکی ہلکی تپش کا احساس پھر بھی باقی تھا وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کیا تو کچھ ہلکی پھلکی ہو گئی۔ گیلے بالوں میں برش کر کے یونہی پشت پر پھیلا دیا اور کمرے سے نکل آئی۔

برآمدے میں ایک ملازمہ چائے کی ٹرے لیے جا رہی تھی وہ سمجھ گئی کہ یہ چائے معظم آغا کے لیے جا رہی ہو گی اس نے ملازمہ کو آواز دے کر ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے لی اور ایک اور کپ لانے کا کہہ کر خود معظم آغا کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

''ارے آپ نے کیوں تکلیف کی؟'' انہیں واقعی بڑا عجیب سا لگا اس کا چائے لانا۔

'مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔'' وہ ٹرے نیچے رکھ کر خود بھی بیٹھ گئی۔

اتنے میں ملازمہ دوسرا کپ لے آئی۔ اس نے دونوں میں چائے بنائی اور ایک کپ ان کی طرف بڑھا دیا۔

''شکریہ۔'' وہ کپ تھام کر بغور اس کی طرف دیکھنے لگے۔ کافی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ جب آئی تھی تو ایک سادہ سی لڑکی تھی۔ بغور دیکھنے پر نروس بھی ہو جاتی لیکن اب بڑے اعتماد سے بیٹھی تھی بلکہ ان کے اس طرح دیکھنے پر پوچھنے لگی۔

''کیا بات ہے معظم آغا؟ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟''

وہ ہلکے سے مسکرائے اور چائے رکھ کر سامنے رکھا پتھر اُٹھا کر دیکھنے لگے۔

''کوئی نئی چیز بھی بنائی ہے آپ نے؟''

''ایک نہیں کئی چیزیں لیکن سب ادھوری ہیں۔''

''کیوں؟''

''بس۔'' انہوں نے کپ اُٹھا کر بقیہ چائے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے اُتاری پھر کہنے لگے۔

''مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے جو چیز میں بنانا چاہ رہا ہوں، وہ بنا نہیں پا رہا۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

''خیر چھوڑیں۔ یہ بتائیں اب آپ کا دل لگ گیا یہاں؟''

''ہاں'' اس نے صاف گوئی سے اقرار کیا۔

''خرم کی وجہ سے؟'' وہ جواب دینے کے بجائے بغور ان کی طرف دیکھنے لگی۔

وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ اپنی بات کہہ کر پتھر کو مختلف زاویوں سے دیکھنے لگے تھے۔

''ایک بات بتائیں معظم آغا آپ دونوں بھائی اتنے مختلف کیوں ہیں۔''

''کتنے مختلف؟''

''زمین آسمان کا فرق ہے۔ آپ اتنے سنجیدہ، الگ تھلگ رہنے والے، ایک طرح سے میں آپ کو آدم بیزار ہی کہوں گی جبکہ وہ۔''

''وہ شروع ہی سے ایسا ہے۔'' وہ اس سے پہلے ہی بول پڑے۔

''کھلنڈرا اور لا ابالی سا۔ ہنگامہ اور شور شرابا پسند کرتا ہے۔ جبھی تو موقع ملتے ہی یہاں سے نکل گیا۔''

''یہی باتیں تو زندگی کا پتا دیتی ہیں۔'' وہ کہنے لگی۔ ''زندگی میں شور نہ ہو، افراتفری نہ ہو تو احساسات منجمد ہونے لگتے ہیں صرف آتی جاتی سانسوں کا نام تو زندگی نہیں ہے۔ معظم آغا!''

''آپ بھی افراتفری پسند کرتی ہیں؟'' انہیں شاید حیرت ہوئی تھی۔

''ہاں۔ اسی میں تو زندگی کا مزا ہے۔ یہ بھاگتا ہوا وقت اگر ہم اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنی رفتار تیز نہیں کریں گے تو یہ ہمیں بہت پیچھے چھوڑ جائے گا۔''

''کبھی کبھی تیز رفتاری بہت بڑے نقصان کا پیش خیمہ ہوتی ہے صبا!''

''میں آپ کی بات سے انکار نہیں کروں گی لیکن نقصان کے خوف سے پیچھے رہ جانا عقلمندی نہیں ہے۔ آپ ہی بتائیں اگر ہر شخص اس خوف میں مبتلا ہو کر بیٹھ جائے تو کیا کائنات ایک جگہ ٹھہر نہیں جائے گی۔''

''نہیں۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

''آپ کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کی کل کائنات یہ بے جان پتھر ہیں اور مجھے کہنے دیجیے معظم آغا! کہ ان پتھروں کے درمیان رہ کر آپ بھی انہی کا حصہ لگنے لگے ہیں۔''

''صبا!''

"میں غلط نہیں کہہ رہی۔" اس کے ساتھ ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اس حُجرے سے باہر نکل کر دیکھیں، دنیا بڑی وسیع اور بہت حسین ہے۔"

وہ خاموشی سے اسے جاتے دیکھتے رہے۔

☆......☆......☆

ابو جی کا فون آیا۔ انہوں نے اسے فوری واپسی کا حکم سنا دیا۔ حالانکہ اب تو وہ رہنا چاہتی تھی لیکن انہوں نے اس کی ایک نہیں سنی اور نانی اماں کی سفارش بھی سہولت سے رَد کر دی۔

"واقعی جارہی ہو؟" اسے تیاری کرتے دیکھ کر خرم آغا پوچھنے لگا۔

"کیا کر سکتی ہوں، ابو جی کا حکم ہے۔"

"تم کہہ دیتیں کچھ دن بعد۔"

"میں نے کہا تھا لیکن وہ نہیں مانے۔" وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑی۔

"اچھا!" وہ اس کے بیڈ پر نیم دراز ہو کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔ "اس دن تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا۔"

"کون سی بات؟" فوری طور پر اسے خیال نہیں آیا اور پھر وہ بیگ میں کپڑے رکھنے میں بھی مصروف تھی، اس لیے پوچھ لیا۔

"بھئی شادی والی بات۔" اس کا ہاتھ بیگ کے اندر رُک گیا اور وہ سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"مجھ سے شادی نہیں کرو گی؟"

"تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں کہوں کروں گی تو تم ابھی یہ کام کر گزرو گے۔"

"ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ تین بار ہاں کہنے میں بھلا کیا دیر لگتی ہے؟"

"یہ یورپ نہیں خرم آغا! یہاں ہاں کہنے سے پہلے بھی کچھ مراحل طے کرنے

پڑتے ہیں۔" وہ بیگ وہیں چھوڑ کر الماری کی طرف بڑھ گئی اور اپنے بقیہ کپڑے نکالنے لگی۔

"مثلاً" "پتا نہیں، وہ جانتا نہیں تھا یا جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔

"بھئی، پہلے اپنے بڑوں سے بات کرو پھر وہ میرے بڑوں سے بات کریں گے اور جب میرے بڑے ہامی بھر لیں گے تب ہاں کہنے کا مرحلہ آئے گا۔"

"بڑوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم تو راضی ہو ناں؟"

"میں راضی ہوں۔ اس کے باوجود بڑوں کی رضا مندی ضروری ہے۔" وہ اس وقت دل کے تابع نہیں تھی۔ اس لیے مناسب بات کہہ گئی۔

"چلو تو میں آج ہی اپنے بڑوں تک بات پہنچا دیتا ہوں۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ پھر جاتے جاتے کہنے لگا۔

"سنو، تم جا رہی ہو تو میں بھی اب زیادہ دن یہاں نہیں رکوں گا اور میں چاہتا ہوں اب جاتے ہوئے تمہیں بھی ساتھ لیتا جاؤں۔" ایک بار پھر دل اس انداز سے دھڑکنے لگا کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے ہوئے آج اس کے پاس اور کوئی موضوع نہیں تھا۔ وہ اس کی موجودگی کا خیال کیے بغیر مامی جی اور نانی اماں کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔

"میں نے صبا سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

وہ لاکھ آزادی کی دلدادہ سہی پھر بھی اس کا یوں بات کرنا بڑا عجیب سا لگا۔ دزدیدہ نظروں سے مامی جی اور پھر نانی اماں کو دیکھا۔ انہیں بھی شاید ایسی بے باکی کی توقع نہیں تھی۔

"میں نے صبا سے پوچھ لیا ہے، اسے بھی کوئی اعتراض نہیں۔" وہ ساری بات اس پر رکھ کر خود بری الذمہ ہو گیا۔

"میرے خدا!" یہ اچانک بات جو دل کے ٹھہرنے کا سبب بن رہی تھی۔

اور اسے ہی نہیں میز کے آخری سرے پر بیٹھے معظم آغا کو بھی اپنا دل ٹھہرتا لگ رہا تھا۔ کھانے سے ہاتھ روک کر انہوں نے بند مٹھی ہونٹوں پر جمالی اور پرسوچ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"ایکسکیوزمی۔" وہ اپنے چہرے پر بہت ساری نظروں کی تپش محسوس کر کے کرسی دھکیل کر کھڑی ہوگئی اور بہت احتیاط کے باوجود پلکیں ذرا سی اُٹھ ہی گئیں۔ معظم آغا جس طرح اسے دیکھ رہے تھے، اس سے وہ اور پزل ہوگئی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟ بیٹھو ناں۔" اس کے لیے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔

وہ شاکی نظروں سے دیکھتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے چلے آنے کے بعد وہاں کس نے کیا بات کی ہوگی لیکن اتنا اندازہ ضرور تھا کہ نانی اماں امامی نے اسے ٹوکا ہوگا اور شاید ناگواری کا اظہار بھی کیا ہو۔ بہر حال وہ اپنے آپ کو قصور وار نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس کے باوجود اپنی پوزیشن خراب لگ رہی تھی۔ اس لیے جب تک نانی اماں نے بلایا نہیں، وہ کمرے سے نہیں نکلی۔

"شام میں تو تم چلی ہی جاؤ گی۔ اس لیے یہ جو تھوڑا وقت ہے۔ ہمارے پاس بیٹھو۔" نانی اماں نے محبت سے اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس کا خیال تھا وہ اس سے باز پرس ضرور کریں گی لیکن انہوں نے اس مسئلے پر سرے سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ وہ خواہ مخواہ ڈرتی رہی تھی۔ پھر جانے سے کچھ دیر پہلے وہ اس کے پاس آئی۔ وہ خاصا جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ پوچھنے لگی۔

"اب معلوم ہوا ہے کہ ظالم سماج کسے کہتے ہیں۔" وہ ایک ہتھیلی پر مکا مارتا ہوا بولا۔

"کیا مطلب؟"

"تمہیں اسلام آباد تک چھوڑنے معظم بھائی جا رہے ہیں۔" وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"نانی اماں کا کہنا ہے کہ کیونکہ میں نے شادی کی بات کر دی ہے، اس لیے اب جب تک شادی نہیں ہو جاتی۔ میرا اور تمہارا ساتھ اُٹھنا بیٹھنا مناسب نہیں ہے۔"

"ٹھیک تو کہتی ہیں۔" وہ اس کی جھنجلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

"خاک ٹھیک کہتی ہیں۔ میرا خیال تھا میں راستے میں تمہارے ساتھ ڈھیر ساری باتیں کروں گا اور اپنی آئندہ زندگی کا خوبصورت خاکہ بھی میں تمہیں بتا دیتا۔"

"چلو کوئی بات نہیں پھر بتا دینا۔" وہ یوں بولی جیسے کسی بچے کو بہلا رہی ہو۔

"تم میرا مذاق اُڑا رہی ہو۔"

"ہرگز نہیں۔" وہ ہنستی ہوئی بولی۔ "چلو اب باہر نکلو، میں جا رہی ہوں۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

نانی اماں اس کے جانے سے بہت افسردہ ہو رہی تھیں کتنی بار اسے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اس کی اپنی پلکیں نم ہوگئی تھیں۔ ماحول میں اداسی اترنے لگی تو وہ کہنے لگا۔

"بس کریں بڑی اماں! ورنہ یہ سارا راستہ روتی ہوئی جائے گی۔"

وہ جلدی سے ماموں جی سے مل کر برآمدے کی سیڑھیاں اتر گئی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ اسے مخاطب کر کے کوئی ایسی بات نہ کہہ دے جو اسے سب کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ معظم آغا گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ اسے آتے دیکھ کر انہوں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ بیٹھ گئی تو دوسری طرف سے آ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

راستہ خاصا طویل تھا۔ آتے ہوئے بھی وہ ان کے ساتھ آئی تھی اور اب بھی اتفاق سے ان کا ساتھ تھا۔ اگر خرم کا خیال درمیان میں نہ ہوتا تو اس وقت بھی وہ ہر احساس سے عاری ہوتی لیکن اب اس کے ساتھ کیا سفر یاد آ رہا تھا۔ اونچی آواز میں بجتا کیسٹ پھر اس کی باتیں۔ پتا ہی نہیں چلا تھا اور اتنی جلدی راستہ کٹ گیا تھا۔ وہ ذرا سی گردن موڑ کر معظم آغا کی طرف دیکھنے لگی۔ آنکھیں ونڈ اسکرین پر جمی ہونے کے باوجود کسی سوچ کی گرفت میں تھیں۔ ہونٹوں نے جیسے ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے کی قسم کھا رکھی تھی۔ پھر وہی خاموشی، وہی سناٹا اور گہرا سکوت اور ہواؤں کے دوش پر سفر کرنے والی کے اندر کی وہ چنچل لڑکی آپ ہی آپ دوبارہ اسی خول میں بند ہونے لگی۔ جس وقت وہ ان سے جدا ہو رہی تھی تو وہی اول روز والی صبا تھی جسے اسی جگہ سے وہ لینے آئے تھے۔ نہیں لگا کوئی وقت کوئی دن درمیان میں آیا ہی نہ ہو وہ اس وقت سے اب تک یہیں کھڑے ہوں۔

"معظم آغا! آپ نے ابو جی کو فون کر دیا تھا ناں کہ میں آ رہی ہوں۔" وہ پھر

خوفزدہ تھی۔

''ہاں!'' سینے میں دبی سانس ہاں کی صورت ہونٹوں کی قید سے آزاد ہوئی۔

''آپ ڈر رہی ہیں؟'' اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ پوچھنے لگے تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''میرا خیال تھا، خرم نے آپ کو خاصا پر اعتماد بنا دیا ہے۔'' انہوں نے کہا تو وہ ایک دم قدم روک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''اسی طرح ڈرتی رہیں تو خرم کے ساتھ کیسے چل سکیں گی؟''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

''صرف اتنا کہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لیجیے گا اور یہ مت بھولیے گا صبا احمد کہ لڑکیاں مضبوط پناہ گاہوں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ ان سے نکل کر ان کی ہستی اور نسوانیت کا غرور پارا پارا ہو جاتا ہے۔''

اپنی بات کہہ کر وہ اسے وہیں چھوڑ کر واپس پلٹ گئے اور وہ کتنی دیر تک کھڑی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

''سچ بتاؤ صبا! کیسا رہا تمہارا ٹور؟'' وہ کافی دیر بڑے ابا کے پاس بیٹھ کر اب اپنے کمرے میں آئی تھی اور سونیا وغیرہ جو بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی تھیں ،اسے دیکھتے ہی پوچھنے لگیں۔

''صبر کرو، ذرا سانس تو لے لوں۔'' وہ سب کے درمیان گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

''سانس بعد میں لینا۔ پہلے بتاؤ۔ کہاں کہاں گھومیں؟''

''کہیں نہیں۔'' وہ مسکراہٹ دبا کر بولی اور ایک ایک کی شکل دیکھنے لگی۔

''یہ کم بخت شروع ہی سے ایسی بور اور بدذوق ہے۔'' ندا دانت پیستے ہوئے

بولی۔''اسے کسی نے آفر بھی کی ہو گی تو اس نے انکار کر دیا ہو گا۔''

''ہیں صبا!'' عافیہ نے تصدیق چاہی تو وہ اپنی اب تک کی زندگی میں شاید پہلی بار ان سب کے درمیان بیٹھ کر کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ان سب نے پہلے حیرت سے اسے دیکھا پھر معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

''بتاؤ ناں صبا؟'' سونیا نے اس کے بازو میں چٹکی کاٹی۔''پتا ہے۔ ہم سب کتنی شدت سے تمہاری واپسی کے منتظر تھے۔''

''میں جانتی ہوں۔'' وہ اپنا بازو سہلاتے ہوئے بولی۔

''اچھا بھئی، بتاتی ہوں۔'' اس نے تکیہ کھینچ کر گود میں رکھ لیا اور پھر اس تمام عرصے کی ایک ایک بات انہیں کہہ سنائی۔ آخر میں کہنے لگی۔

''پتا ہے سونیا! خرم کا خیال ہے کہ وہ شادی کر کے مجھے اپنے ساتھ ہی لندن لے جائے گا۔''

''واقعی! صبا ایمان سے تم بڑی لکی ہو۔'' ندا کو اس پر رشک آ رہا تھا۔

اسی وقت جنید وغیرہ دستک دے کر اس کے کمرے میں چلے آئے سب کو اس کے گرد جمع دیکھ کر وہ بہت ہنسے۔

''گویا صبا بی بی کا انٹرویو لیا جا رہا ہے۔'' عثمان نے مذاق اُڑایا۔

''تمہیں اس سے کیا؟'' عافیہ نے تنک کر کہا۔

''اللہ تم لوگوں پر رحم کرے مجھے بھی رحم آ رہا ہے۔'' باری باری سب نے دل کھول کر مذاق اُڑایا۔

''ایسا لگ رہا ہے جیسے امریکہ اور لندن سے گھوم کر آ رہی ہو۔ ذرا بتانا صبا لیڈی ڈیانا کے درشن بھی کیے یا نہیں؟''

''فکر مت کرو۔ عنقریب لیڈی ڈیانا کے درشن بھی کر لے گی۔'' سونیا آگے بھی بتانے جا رہی تھی کہ اس کے گھورنے پر چپ ہو گئی۔

''ہاں، نانی اماں کے گھر تک چلی گئی اب لیڈی ڈیانا تک جانا کون سا مشکل ہے۔''

جس انداز سے وہ سب ہنس رہے تھے، اس سے ندا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ

سب کی بتیسیاں توڑ ڈالے۔ کہاں تو وہ یہ سوچے بیٹھی تھیں کہ صبا کے آنے پر ان سب کا اترانا اور جتانا ختم ہو جائے گا لیکن یہاں تو اُلٹا وہ سب مذاق اُڑا رہے تھے۔

''میں ابھی جا کر بڑے ابا کو بتاتی ہوں کہ تم سب لوگ صبا کو تنگ کر رہے ہو۔''

''ہم...... یعنی کہ ہم تنگ کر رہے ہیں۔'' عرفان نے دانش کے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مارا۔

''پاگل ہو گئے ہیں یہ سب۔ چلو ہم چلتے ہیں۔'' ندا اُٹھ کر بیڈ سے نیچے کود گئی عانیہ اور سنیا نے بھی اس کی تقلید کی۔

''ارے۔ اس کا انٹرویو تو مکمل کرتی جاؤ۔'' عثمان نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن وہ اسے دھکا دیتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

پھر اگلے کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ وہ خرم آغا کی سنگت میں گزرے دنوں کے سحر سے کسی طرح بھی نہیں نکل پا رہی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل انہی گزرے دنوں میں بھٹکتا رہتا۔ کوئی بھی کام کر رہی ہوتی۔ کہیں بھی بیٹھی ہوتی اس کا تصور ساتھ ساتھ ہوتا اور اب تو اسے انتظار بھی تھا۔

اور یہ انتظار زیادہ طویل نہیں ہوا کیونکہ تیسرے ہفتے ہی ماموں جی آ گئے۔

بند کمرے میں بڑوں کا اجلاس شروع ہوا تو اسے ایک ہی فکر لاحق ہو گئی۔ اس نہج پر تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ بڑے ابا بھی کوئی اعتراض اُٹھا سکتے ہیں اور بڑے ابا کو خرم کے باہر رہنے پر اعتراض تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ کوئی معمولی آدمی کا بیٹا ہے نہیں جو روزگار کے لیے دیارِ غیر میں دھکے کھاتا پھرے۔ اس پر ماموں جی نے وہی کہا جو خرم نے ان سے کہا تھا کہ اس کی تعلیم کا ایک سال باقی ہے۔ اس کے بعد وہ مستقل یہیں آ جائے گا۔

بڑے ابا کا خیال تھا کہ پھر شادی بھی ایک سال بعد ہی کریں گے لیکن ماموں جی کا اصرار ابو جی بھی رضا مند تھے۔ اس لیے بڑے ابا کو بھی ہامی بھرنی پڑی۔ یوں اسی وقت ایک ہفتے بعد کی شادی کی تاریخ رکھ دی گئی۔

عانیہ جو کھڑکی سے لگی کھڑی تھی اور پل پل کی خبر اندر تک پہنچا رہی تھی۔ مبارک سلامت کی آوازیں سنتے ہی پھر اندر بھاگی۔

''اب کیا ہوا؟'' سونیا نے دبی دبی آواز میں پوچھا اور وہ تو ویسے ہی سانس روکے بیٹھی تھی۔

''مبارک ہو۔ بہت بہت مبارک ہو۔'' عافیہ پھولی پھولی سانسوں کے ساتھ کہتی دھم سے بیڈ پر گر گئی۔

''ہوا کیا؟'' ندا نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''نہ صرف بات پکی ہو گئی ہے بلکہ آئندہ جمعہ کو بارات بھی آ رہی ہے۔''

''سچ!'' ندا اور سونیا خوشی سے بھرپور آواز میں چیخیں اور اس نے کتنی دیر سے سینے میں دبی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد کرتے ہوئے ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکا لی۔

''ارے!'' عانیہ ایک دم اُٹھ بیٹھی۔

''کیا ہوا؟''

''جا کر عثمان کو اطلاع دو کہ صبا، لیڈی ڈیانا سے ملنے جا رہی ہے۔''

''ہاں، اس دن بہت مذاق اُڑا رہا تھا۔''

''چلو۔'' تینوں ایک ساتھ تیار ہو گئیں اور اس کے روکنے کے باوجود بڑی تیزی سے کمرے سے نکل گئیں اور اس کے پاس اب سوچنے کو کیا تھا۔ مست ہواؤں کی مدھم مدھم سرگوشیاں جو اس نے سنی تھیں اور جن کے سنگ اس نے بہت دور تک سفر کیا تھا۔

''سنو۔'' وہ اس وقت سے اسی طرح بیٹھی تھی کہ اس آواز پر چونکی اور سر اُٹھا کر دیکھنے لگی۔ سامنے جنید کھڑا تھا کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہوا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور اسے بھی بیٹھنے کے لیے کہا لیکن وہ نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ اچانک جو کچھ ہوا ہے کیا اس میں تمہاری رضا بھی شامل ہے۔؟''

وہ کچھ دیر تک سر جھکائے اپنا ناخن کھرچتی رہی پھر اسی طرح سر جھکائے ہوئے بولی۔

''گو کہ اس سلسلے میں مجھ سے کسی نے کوئی بات نہیں کی اس کے باوجود یہ سب میری خواہش کے مطابق ہو رہا ہے۔''

''تمہاری خواہش کے مطابق۔'' جنید کو شاید یقین نہیں آیا تھا۔

''کیوں اس میں اتنا متعجب ہونے کی کیا بات ہے؟''

''تعجب کی بات تو ہے صبا! کہ جس گھر میں تم پروان چڑھیں اس سے چار دن دور کیا رہیں کہ زندگی کے راستے ہی بدل ڈالے۔''

''راستہ بدلنا میری مجبوری تھی اس لیے کہ مسلسل ان راستوں پر چلتے چلتے میں اکتا گئی تھی مجھے کسی کی محبت اور خلوص پر شبہ نہیں ہے جنید لیکن بڑے ابا کو کبھی ہمارا خیال نہیں رہا۔ انہوں نے کبھی ہمیں اہمیت نہیں دی جیسے ہماری اپنی کوئی مرضی ہی نہ ہو۔''

''یہاں تم غلط بیانی سے کام لے رہی ہو ورنہ بڑے ابا نے ہمیشہ تم لڑکیوں کو ہم پر فوقیت دی۔''

''یہ سب ہمارا دل رکھنے کی باتیں تھیں۔ ورنہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ کس طرح ہمیں اس چار دیواری میں مقید رکھا۔''

''مجھے تمہاری سوچ پر افسوس ہو رہا ہے صبا! کم از کم میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔ یہ محبتوں بھرا سائبان اور تمہاری پاسبانی کرتی دیواریں جن میں تم اپنے آپ کو مقید تصور کرتی ہو۔ یقین کرو، دنیا میں کہیں تمہیں اس سے اچھی اور مضبوط پناہ گاہ نہیں ملے گی۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''تم زمانے کے چلن کو نہیں سمجھتیں لیکن بڑے ابا اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک لڑکی جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو اسے کن نظروں کا سامنا ہوتا ہے۔ اور انہی نظروں سے محفوظ رکھنے کی خاطر بڑے ابا نے ایک حد قائم کر دی۔ وہ تمہاری تعلیم و تربیت سے لاپروا نہیں ہوئے ہاں اب میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں ان سے کوتاہی ضرور ہوئی جو تم نے کبھی مثبت انداز سے نہیں سوچا۔''

''تم یہ سب مجھ سے کیوں کہہ رہے ہو اور اس ضمن میں تم صرف مجھے الزام نہیں دے سکتے یقین کرو، ہم سب اس چار دیواری کے اندر بہت مطمئن تھے۔ ہماری ایک الگ دنیا تھی جس سے ہٹ کر ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اور ہماری سوچوں کو بھٹکایا تم نے۔''

''میں نے۔'' بے آواز، ہونٹوں کی جنبش کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے سینے پر چلا گیا۔

''ہاں، تم سب نے۔ جنید حسن! یاد کرو اپنی باتیں۔ وہ ساحل کی گیلی اور نرم نرم

ریت۔ وہ نیلے پانیوں میں اترتا نارنجی گولا اور تم روزانہ صرف یہی منظر دیکھنے کے لیے ساحل پر جاتے ہوناں۔''

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

''ہم پتھر کی بے جان مورتیاں نہیں تھیں جنید حسن! کہ تمہاری ایسی باتوں سے ہماری آنکھوں میں خواب نہ سجتے۔ تم نے صرف ساحل کی باتیں کیں اور ہماری آنکھیں اس سے کہیں آگے دیکھنے لگیں۔ اور اب جبکہ میں اس ان دیکھی دنیا میں قدم رکھنے جا رہی ہوں تو تم مجھے کیا سمجھانے آئے ہو؟''

وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی اور اب جبکہ وہ اس الزام سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا تھا تو اس کے سامنے کیا اعتراف کرتا۔ خاموشی ہی بہتر تھی کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا پھر اسی طرح چپ چاپ اُٹھ کر چلا گیا۔

پھر ایک ہفتہ پلک جھپکتے میں گزر گیا۔ وہ صبا احمد سے صبا خرم بن کر پہلے اسی حویلی میں گئی اور وہاں کچھ دن رہنے کے بعد خرم آغا کے ساتھ لندن پرواز کر گئی۔

☆......☆......☆

اجنبی دیس، اجنبی جگہیں اور اجنبی فضائیں۔ سب کچھ اجنبی ہوتے ہوئے بھی اس کے لیے جیسے کچھ بھی اجنبی نہیں تھا۔ شاید خواب زندہ حقیقت بن جائیں تو اسی طرح لگتا ہے یا پھر سارا کمال خرم کی سنگت کا تھا۔

ابتدائی دنوں میں وہ ہر طرف سے لاپروا ہو کر صرف اس کا رہا۔ روزانہ اسے کہیں نہ کہیں گھمانے لے جاتا۔ ایک مہینہ گزرتے پتا بھی نہ چلا۔ وہ تو جب ماموں جی کا خط بمعہ اس کے تعلیمی اخراجات اور محدود جیب خرچ کے ساتھ آیا تب وقت گزرنے کا احساس ہوا۔ سنجیدگی سے سوچنے بیٹھا تو اتنے پیسوں میں کسی طرح بھی مہینے بھر کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا تھا۔ پہلے وہ ہاسٹل کے ایک کمرے میں ایک سویڈش لڑکے کے ساتھ رہتا تھا اب صبا کی وجہ سے اس نے الگ اپارٹمنٹ لے لیا تھا۔ ایک طرح سے اس

گھر کی ذمہ داری اسے نبھانی تھی۔

وہ ذمہ داری سے نہیں گھبرایا تھا۔ بس یہ خیال آیا کہ اسے آتے ہی یہ سب کر لینا چاہیے تھا۔ خوامخواہ اتنا وقت اِدھر اُدھر گھومنے میں برباد کیا۔ بہر حال ابھی بھی کچھ زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ اگلے دن سے ہی اس نے جاب کی تلاش شروع کر دی۔ اسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ بہت جلد اسے جاب مل گئی اور اس نے آفس جانا شروع کر دیا۔

صبا خوش بلکہ بہت خوش تھی۔ اس کے اندر کی لڑکی ایک بار پھر بیدار ہو کر اسے گرفت میں لے چکی تھی۔ اس کے نزدیک اصل زندگی یہی تھی۔ نہ کوئی روک ٹوک نہ سرد نگاہوں کا سامنا۔ جب چاہا بالکونی میں کھڑے ہو کر باہر کی دنیا کو قریب سے دیکھ لیا۔ دل میں کسک نہیں رہی تھی کہ چار دیواری سے باہر کیا ہو رہا ہے۔ جب خرم نے آفس جانا شروع نہیں کیا تھا اس وقت تو وہ اس کے ساتھ کہیں نہ کہیں نکل جاتی تھی۔ اب وہ جب بھی فارغ ہوتی بالکونی میں آ کھڑی ہوتی۔ باہر کا موسم عام طور پر ایک جیسا ہی رہتا تھا۔ وہ ریلنگ پر کہنیاں ٹکا کر بے فکرے اور آزادی سے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے جوڑوں کو دیکھتی یا شفاف سڑک پر پھسلتی گاڑیاں اسے اچھی لگتیں۔

اس وقت بھی وہ ریلنگ کے سہارے کھڑی بڑے انہماک سے نیچے دیکھ رہی تھی خرم کے آنے کا وقت ہو رہا تھا جب بھی سڑک کے دوسری طرف کوئی بس رکتی تو اس کی نظریں اترنے والے مسافروں میں مانوس چہرہ تلاش کرنے لگتیں۔

''ہیے!'' کسی نے شاید اسے ہی متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ نظروں کا زاویہ بدل کر دیکھنے لگی۔ کوئی نوجوان تھا اس کے متوجہ ہوتے ہی اس نے اپنے ہونٹوں کو دو انگلیوں سے چھوا اور پھر جس انداز سے اس کی طرف اشارہ کیا اس سے لمحہ بھر کو تو وہ سن ہو گئی پھر فوراً گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کہ کسی نے اس کی حرکت دیکھی تو نہیں۔ کوئی اگر دیکھ بھی رہا تھا تو یوں نظر انداز کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جبکہ اسے سخت ناگوار گزرا اور وہ خرم کا انتظار کیے بغیر اندر چلی آئی۔ دل ایک انجانے خوف میں گھر کر زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اور ابھی وہ اپنے آپ کو نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کال بیل بجنے لگی۔

خرم کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بھی دروازے تک جانے میں اسے کچھ دیر لگی۔ اور ایسا پہلی بار ہو رہا تھا۔ ورنہ تو وہ بھاگ کر دروازہ کھولتی تھی بلکہ زیادہ تر تو یوں ہوتا

کہ وہ بالکونی سے اسے آتے ہوئے دیکھ لیتی تھی اور پھر اس کے آنے سے پہلے ہی دروازے پر کھڑی ہو جاتی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' اس تاخیر کو اس نے محسوس کر لیا تھا جبھی پوچھنے لگا۔

''ہاں۔ وہ میں'' فوری طور پر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

''آج تم بالکونی میں بھی نظر نہیں آئیں؟''

''میں باتھ روم میں تھی۔''

''اچھا!'' وہ کچھ تھکا تھکا سا تھا اس لیے مزید کچھ کہے بغیر ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہوا صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

''چائے پیو گے؟'' وہ کافی حد تک نارمل ہو چکی تھی۔ روزانہ والے مخصوص لہجے میں پوچھنے لگی۔

''مجھے تو نہیں بنانی پڑے گی۔'' وہ سستی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''ارے نہیں، میں ابھی لے کر آتی ہوں۔'' وہ ہنستی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد چائے لے کر آئی تو وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

''تھک گئے ہو۔'' وہ اس کی پیشانی کو نرمی سے چھو کر بولی۔

''زیادہ نہیں۔'' وہ اٹھ بیٹھا اور اس کے ہاتھ سے مگ لے کر اسے بھی اپنے پاس بٹھا لیا۔

''کیا کرتی رہیں سارا دن؟''

''وہی روزمرہ کے کام جو منٹوں میں ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد کرنے کو کچھ نہیں ہوتا۔''

''کچھ کرنا چاہتی ہو؟''

''مثلاً کیا؟'' وہ اس پر نظریں جمائے بیٹھی رہی جو اپنی بات پر خود ہی سوچ رہا تھا۔

''تم کچھ کہہ رہے تھے؟'' کافی دیر بعد اسے ہی متوجہ کرنا پڑا۔

''ہاں!'' وہ چونکا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''جاب کرو گی؟''

''میں۔'' کتنی دیر تک اپنی طرف اشارہ کیے بیٹھی رہی یقین بھی نہیں آ رہا تھا۔

''اگر کرنا چاہو تو۔'' وہ پتا نہیں کیا سمجھا جو بات اس کی مرضی پر ڈال دی۔

"تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"ارے!" وہ ہنسا۔ "اعتراض ہوتا تو کہتا کیوں اور پھر میں تو تمہاری تنہائی اور بوریت کے خیال سے کہہ رہا ہوں۔" وہ خاموش ہو کر اس کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

"میرا آنا جانا کیسے ہوگا؟" اس کے سوال میں اس کی بات کا جواب بھی تھا۔

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے، میں تو راستوں سے بھی واقف نہیں ہوں۔"

"بے وقوف، جب آنے جانے لگو گی تو راستوں سے آشنائی بھی ہو جائے گی اور پھر یہاں سے زیادہ دُور نہیں ہے۔"

"کیا چیز؟"

"وہ اسٹور جہاں تمہیں جانا ہے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"میرے ایک دوست کا اسٹور ہے۔ کچھ دن پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اسے ایک سیلز گرل کی ضرورت ہے۔ اس وقت مجھے تمہارا خیال نہیں آیا تھا ورنہ میں اسی وقت بات کر لیتا۔"

اس کے خاموشی سے دیکھنے پر کہنے لگا۔

"رات کو فون کر کے اس سے معلوم کر لوں گا۔ اگر اسے اب بھی ضرورت ہوئی تو صبح میرے ساتھ چلنا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ فوراً راضی ہو گئی۔ پھر خالی مگ اُٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ "یہ بتاؤ اب کیا پروگرام ہے؟"

"پروگرام بنانا تمہارا کام اور عمل کرنا میرا کام۔"

"اچھا! ابھی آرہی ہوں۔" وہ کچن سے واپس آئی تو کہنے لگی۔

"چلو اگر تھکن اُتر گئی... تو باہر چلتے ہیں۔"

"چلو۔" وہ فوراً تیار ہو گیا اور اس کی یہی بات اسے پسند تھی کہ وہ کسی بھی بات کو آئندہ پر نہیں ٹالتا تھا۔

☆......☆......☆

زندگی کا یہ رُخ بھی اسے پسند آیا۔ صبح اس کے ساتھ نکلنا اور کبھی اس سے پہلے اور کبھی اس کے بعد گھر آنا۔ اگر وہ پہلے آجاتی تو آتے ہی رات کے کھانے کی تیاری میں لگ جاتی۔ دوسری صورت میں وہ اسے کچن میں ملتا۔ جیسا کہ وہ چاہتی تھی کہ فراغت کا کوئی لمحہ اس کی زندگی میں نہ آئے تو اب ایسا ہی تھا۔ رات میں جب وہ سونے کے لیے لیٹتی تو کبھی کبھی اسے اس گھر کا خیال آتا جس کی اونچی دیواروں میں وہ اپنے آپ کو مقید تصور کرتی تھی۔ بھلا وہ بھی کوئی زندگی تھی۔ وہ سوچتی اور پھر وہاں اور یہاں کا موازنہ کرتے کرتے ہی سو جاتی تھی۔

شروع شروع میں اس نے سونیا وغیرہ کے ساتھ خط و کتابت رکھی تھی اور اپنے ہر خط میں اس نے یہاں کی زندگی اور اپنے معمولات کے بارے میں بہت کچھ لکھا تھا اور اب تو اس کی کزنز کے خطوط آئے ہوئے کتنے دن گزر جاتے۔ وہ جواب لکھنے کا سوچتی ضرور تھی لیکن وقت نہیں ملتا تھا ایک چھٹی کا دن وہ بھی ہفتے بھر کے جمع شدہ کام نمٹانے میں گزر جاتا۔

انہی دنوں سونیا اور عثمان کی شادی کا کارڈ ملا۔ ساتھ میں سونیا کا خط بھی تھا جس میں اس نے تاکید کی تھی کہ وہ ضرور آئے۔

اس نے بار بار اس خط کو پڑھا۔ اس کے لاشعور میں شاید یہ بات تھی کہ سونیا کے ساتھ اچھا نہیں ہو رہا۔ اور یہی بات وہ خط میں تلاش کرنا چاہتی تھی۔ کہیں کوئی کسک یا نا تمام آرزوؤں کا گِلہ یا آزاد فضاؤں میں سانس لینے کی خواہش جو اب حسرت بننے جا رہی تھی اور کچھ نہیں تو اسے ہی خوش قسمتی کی سند دی ہو لیکن ایسی کوئی بات ڈھونڈے سے نہیں ملی۔ بڑے مطمئن انداز سے لکھا گیا تھا اور بڑی فراخدلی سے اسے آنے کی دعوت دی تھی۔

"بے چاری!" اس نے تاسف سے سوچا اور کارڈ کے ساتھ خط بھی ایک طرف ڈال دیا۔

اس کا جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے بہت سرسری انداز میں خرم سے ذکر

کیا اور اس نے بھی اسی انداز سے سُنا تھا۔

وقت کا پہیہ اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا لیکن اسے یوں محسوس ہوتا جیسے یہاں کا پہیہ کچھ زیادہ تیز رفتار ہے ایک سال ہو گیا تھا انہیں یہاں آئے ہوئے اور اس دوران وہ دونوں کافی حد تک سیٹ ہو چکے تھے۔ ان کا خیال تھا آئندہ دو تین سالوں میں وہ مکمل طور پر سیٹ ہو جائیں گے۔ اس کے لیے وہ دونوں ہی کافی جدوجہد کر رہے تھے۔

اس شام وہ گھر میں داخل ہوئی تو خرم پہلے سے موجود تھا اور کچن کے بجائے لاؤنج میں بیٹھا نظر آیا۔ وہ بیگ ٹیبل پر پھینک کر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''تم کب آئے؟''

''زیادہ دیر نہیں ہوئی۔''

''چائے پی لی تم نے؟'' وہ پیروں کو سینڈل کی قید سے آزاد کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''نہیں، ابھی کچن میں جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ابو جی کا خط آ گیا۔ وہ پڑھنے بیٹھ گیا۔''

''کیا لکھا ہے، ماموں جی نے؟''

''وہی جو پچھلے خط میں لکھا تھا کہ پڑھائی ختم ہو گئی ہو گی۔ واپس آ جاؤ۔ ساتھ میں دھمکی بھی ہے کہ خرچ بھیجنا بند کر دوں گا۔''

''اچھا!'' وہ ہنسی پھر کہنے لگی۔ ''تم انہیں صاف صاف کیوں نہیں لکھ دیتے کہ تم یہاں جاب کر رہے ہو اور تمہارا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''ہاں اب تو لکھنا ہی پڑے گا۔''

''اور کیا لکھا ہے انہوں نے؟'' وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑا کر خط تلاش کرنے لگی۔

''تنہائی کا رونا کہ تم دونوں آ جاؤ تو کچھ رونق ہو جائے گی۔''

''معظم آغا کی شادی کیوں نہیں کر دیتے؟''

''وہ پتھروں کی دنیا سے نکلیں گے تو شادی ہو گی ناں۔ مجھے تو لگتا ہے، وہ خود بھی پتھر ہو چکے ہیں۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ تائید کرتی ہوئی اُٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

پھر جب خرم نے ماموں جی کو اپنے حالات لکھ کر یہ بھی بتایا کہ مستقبل قریب میں ان کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور یہ کہ وہ کافی حد تک یہاں سیٹ بھی ہو چکے ہیں تو جواب میں ماموں جی نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور اسے ایک آخری موقع دیتے ہوئے لکھا کہ دو مہینے کے اندر تم آ جاؤ ورنہ وہ کبھی معاف نہیں کریں گے اس مقام پر وہ آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے والی لڑکی کی گرفت سے آزاد ہو گئی۔

''ماموں جی کو ناراض مت کرو۔ اگر وہ خوشی سے اجازت دیتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ واپس چلو۔''

بڑے ابا کی تعلیم اور تربیت اتنی کمزور نہیں تھی کہ وہ آسانی سے بھلا دیتی۔ بعض باتیں انہوں نے روح کی گہرائیوں تک اتار دی تھیں۔ ان میں ایک یہ بھی تھی کہ باپ کی ناراضگی سے خدا بھی ناراض ہوتا ہے۔

''کیا کریں گے واپس جا کر؟'' وہ کہنے لگا۔ ''وہاں مجھے کوئی چارم نظر نہیں آتا۔ اپنے ہی گھر میں کھڑے ہو کر بات کرو تو جواب میں اپنی آواز کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ باہر نکلو تو وہی صدیوں پرانے لوگ۔ کوئی ہیر گاتا ہے تو کوئی لیلیٰ مجنوں کے قصے چھیڑتا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور وہ ابھی تک ہیر رانجھا میں الجھے ہیں۔''

وہ یوں خفا ہو رہا تھا جیسے اس نے واپسی کا قصہ اپنی طرف سے چھیڑا ہو۔

''ٹھیک ہے، مت جاؤ لیکن ماموں جی کو قائل ضرور کرو۔''

وہ سہولت سے کہتی ہوئی اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ اپنے تئیں اس نے بات ختم کر دی تھی لیکن رات کو جب سونے کے لیے لیٹی تو کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آئی وہ خرم کی باتوں کو سوچتی رہی پھر اچانک وقت کا پہیہ الٹا چلنے لگا تھا۔

وہ اونچی دیواریں اور بڑے ابا کی لگائی ہوئی حد بندیاں جن پر کڑھنے کے باوجود زندگی میں طمانیت کا احساس باقی تھا فراغت کے وہ تمام لمحے ایک ایک کر کے یادوں میں آ سمائے۔ جب کرنے کو کچھ نہیں تھا لیکن ایک دوسرے کی سنگت میسر تھی۔ خوشیاں زندہ تھیں اور ایک دوسرے کا دکھ درد سننے اور بانٹنے کا احساس تھا۔ وہ مصنوعی خفگیاں

اور منا لینے کی جلدی۔ ٹھہرے ہوئے ماحول میں ہلکا ہلکا سا ارتعاش تھا جیسے مدھم سروں پر کوئی دھیرے دھیرے گنگنا رہا ہو۔ شاید ہیر یا سسی کی فریاد۔

اور نانی اماں کی بڑی سی حویلی کی طرف جاتے ہوئے وہ پیپل کا گھنا درخت جس کے سائے میں بیٹھے نوجوان اپنے بزرگوں کی باتیں ایک جوش اور عقیدت کے ساتھ دہراتے تھے اور حویلی کے اندر پتھروں کو تراشتا وہ شخص معظم آغا جس کی مورتیوں میں محبت کے رنگ جھلکتے ہیں۔ ایک بار پھر وہ موازنہ کر رہی تھی اور گرفت اسی جگہ کی مضبوط تھی جہاں اس کی جڑیں دور تک پھیلی تھیں۔

رات دیر سے سونے کی وجہ سے صبح خود سے اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ خرم نے ایک دو بار آواز دینے کے بعد جھنجوڑ کر اُٹھایا تھا۔ اس کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا اُٹھنے کو لیکن مجبوراً اُٹھ گئی روزانہ اس وقت خاصی افراتفری ہوتی تھی۔ دونوں اپنی تیاری کے ساتھ ساتھ ناشتا بھی بناتے اور بڑی عجلت میں کھا کر نکلتے تھے۔

''کیا بات ہے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' وہ اسے سست دیکھ کر پوچھنے لگا۔

''ہاں۔''

''پھر کیا آج کام پر جانے کا ارادہ نہیں ہے۔''

''جاؤں گی۔'' وہ بے دلی سے کہہ کر لباس تبدیل کرنے چلی گئی۔

واپس آئی تو وہ ناشتا کرنے میں مصروف تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ شامل ہوگئی اور جب دونوں گھر سے نکلنے لگے تو اس کا دل چاہا۔ وہ وہیں دروازے میں رُک کر اسے خدا حافظ کہے اور دور تک اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہے اور پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو جائے تو دروازہ بند کرتے ہی اس کی واپسی کا انتظار شروع کر دے۔

''چلو ناں۔'' وہ اسے رُکتے دیکھ کر کہنے لگا۔

''ہاں!'' وہ چونکی اور اس کے ساتھ باہر نکل آئی۔

کام کا آغاز اس نے معمول کے مطابق ہی کیا تھا۔ اسٹور میں داخل ہونے والی پہلی خاتون مسز رابرٹ جنہیں دیکھ کر وہ اپنے مخصوص انداز سے مسکرائی اور ان کے ہاتھ سے پرچی لے کر مطلوبہ چیزیں ریک میں سے نکال نکال کر کاؤنٹر پر رکھنے لگی۔ اس

دوران دو تین کسٹمر اسٹور میں آ گئے تھے۔ وہ مسز رابرٹ سے فارغ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہوئی تو ایک نے بے تکلفی سے کہا۔

''ہیلو سویٹی!''

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ روزانہ کتنی بار اسے ایسی صورتحال کا سامنا ہوتا تھا اور اس نے کبھی مائنڈ بھی نہیں کیا تھا۔ جواباً اسی خوشدلی سے ہیلو کہا کرتی تھی لیکن اس وقت جانے کیوں اس کے اعصاب تن گئے۔ ناگواری کی ایک لہر پورے بدن میں سرایت کرتی ہوئی آنکھوں میں آ ٹھہری۔

''What happend?'' (کیا ہوا؟) وہ اسی لہجے میں پوچھنے لگا۔

''Nothing'' (کچھ نہیں) اس نے بمشکل اپنے آپ کو تلخ ہونے سے روکا۔ ورنہ وہ اپنے اس پرانے خول میں اتر کر پوری طرح مشرقی لڑکی کو بیدار کر چکی تھی جو ایسے موقع پر مقابل کو ماں بہن یاد دلاتی ہے۔

پھر ابھی وہ ان تینوں سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ مائیکل آ گیا۔ وہ اپنے معمول سے کچھ لیٹ ہو گیا تھا۔ پہلے اس نے اپنے دیر سے آنے کی وجہ بتائی اور آخر میں جب اس نے اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔

''اور تم کیسی ہو سویٹ ہارٹ؟''

تو اس کی پیشانی نم ہوگئی اور جواب میں وہ اپنا روز مرہ کا جملہ دہرانے کی بجائے مسز رحمٰن کی طرف متوجہ ہوگئی۔ جو مائیکل کے پیچھے اسٹور میں داخل ہوئی تھیں۔

''کیسی ہیں آپ مسز رحمٰن؟'' اس نے اخلاقاً پوچھا تھا۔ جواب میں مسز رحمٰن اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھتے ہوئے باقاعدہ شروع ہوگئیں۔

''کیا بتاؤں، زندگی عذاب ہو کر رہ گئی ہے۔ پتا نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی جو ہم نے یہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔''

''ارے کیا ہوا؟'' ایک دوسرے کا درد بانٹنے کا احساس جاگا۔ تو ہمدردی سے پوچھنے لگی۔

''یہ پوچھو کیا نہیں ہوا۔ میں تو بالکل ہی تباہ ہوگئی ہوں۔ عجیب قانون ہے یہاں

کا۔ ماں باپ کو اپنی ہی اولاد پر اختیار نہیں۔ میری بیٹی ایک یہودی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ سمجھانے کی کوشش کی تو گھر چھوڑ کر چلی گئی۔''

''پھر!'' ان کے لمحے بھر کو رُکنے پر وہ فوراً پوچھنے لگی۔

''پھر کیا، پولیس میں رپورٹ کرانے گئے تو اُلٹا ہمیں الزام دے دیا۔ کہتے ہیں لڑکی بالغ ہے اور اپنی مرضی کی مالک۔ اس کے راستے میں آنے کی کوشش نہ کریں۔'' وہ کاؤنٹر پر کہنی ٹکا کر سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''اپنے دیس میں ایسی حرکت کرتی تو میں گلا نہ دبا دیتی اس کا۔ اور گلا تو میں اب بھی دبانا چاہتی ہوں اس کا لیکن۔'' ان کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں پانی اتر آیا۔

''پلیز مسز رحمٰن!'' وہ جلدی سے گلاس میں پانی لے آئی اور خود ہی ان کے لبوں سے لگا دیا۔

''شکریہ!'' پانی پینے کے بعد انہوں نے اپنی آنکھیں صاف کیں پھر کہنے لگیں۔

''ایسی اولاد سے تو ہم بے اولاد ہی بھلے تھے'' پھر اپنی بات کی خود ہی نفی کرنے لگیں۔

''قصور اس کا نہیں ہمارا ہے جو ہم نے اپنی زمین پر پرائی زمین کو ترجیح دی۔ اب کیا منہ لے کر ہم واپس جائیں گے اور کیا کہیں گے اپنے لوگوں سے۔''

''آپ کو کیا چاہیے تھا؟''

''مجھے کافی کے دو ڈبے دے دو۔'' وہ فوراً ایک طرف مڑ گئی۔

پھر اُس کے جانے کے بعد بھی وہ انہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ ذہن اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ اس لیے وہ مستعدی سے کام نہیں کر پا رہی تھی مائیکل شیشے کے کمرے میں بیٹھا کتنی دیر سے اسے نوٹ کر رہا تھا۔ گاہکوں سے اس کا رویہ ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ کتنے لوگوں کو اس نے بغیر کچھ لیے واپس جاتے دیکھا۔ اپنے نقصان کا سوچ کر فوراً اُٹھ کر اس کے پاس آیا۔

''میرا خیال ہے صبا! آج تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟''

''ہیں!'' وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''میں بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں لوگوں کے ساتھ تمہارا رویہ ٹھیک نہیں ہے۔

اس طرح تو میرا بہت نقصان ہو جائے گا۔'' اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''ایسا کرو تم گھر چلی جاؤ'' وہ کہنے لگا۔ ''تمہیں آرام کی ضرورت ہے کل اگر طبیعت ٹھیک ہو تو آنا ورنہ جتنے دن چاہو چھٹی کر سکتی ہو۔''

''تھینک یو۔'' وہ خود بھی یہی چاہ رہی تھی اس لیے فوراً جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

''جاتے ہوئے ڈاکٹر کو ضرور دکھا دینا۔ مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہیں۔''

''او کے''

''سی یو'' وہ کاؤنٹر سے نکل کر اس کے قریب سے گزرنے لگی تو اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا اور اسے یوں لگا جیسے اچانک کسی نے اس وجود میں انگارے بھر دیے ہوں وہ فوراً باہر نکل آئی۔

باہر کے سرد موسم نے بھی اس کے اندر کی آگ کو کم نہیں کیا بمشکل تمام گھر تک آئی اور وہیں لاؤنج میں بیٹھ کر اس نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا بہت دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔ اس کی ہتھیلیاں تر ہو چکی تھیں۔

''لیکن میں کیوں رو رہی ہوں؟'' وہ اپنے آپ سے پوچھنے لگی اور پھر ایک ہی بات نہیں اس کے بعد کتنی باتیں جن کا کہ اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا لیکن وہ بہت ساری باتیں جیسے معظم آغا نے کہا تھا۔

''لڑکیاں مضبوط پناہ گاہوں میں ہی اچھی لگتی ہیں ان سے نکل کر ان کی ہستی اور نسوانیت کا غرور پارا پارا ہو جاتا ہے۔''

اور جنید حسن کی باتیں۔

''تم زمانے کے چلن کو نہیں سمجھتیں لیکن بڑے ابا اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک لڑکی جب گھر سے نکلتی ہے تو اسے کن نظروں کا سامنا ہوتا ہے اور انہی نظروں سے محفوظ رکھنے کی خاطر بڑے ابا نے ایک حد قائم کر دی۔''

''بڑے ابا!'' وہ شدت سے رونے لگی۔ ''آپ نے جن نظروں سے محفوظ رکھنے کی خاطر ہمارے گرد اونچی دیواریں کھڑی کیں۔ میں انہی نظروں میں گھر گئی ہوں اور ستم یہ ہے کہ مجھے اب تک احساس ہی نہیں تھا میں سمجھتی تھی میں ایک ترقی یافتہ معاشرے میں

آزادی سے سانس لے رہی ہوں۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ اپنی ہستی اور نسوانیت کا غرور خود مٹی میں ملا رہی ہوں۔''

اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر اپنے آپ کو دیکھا۔ جینز پر وائٹ ہائی نیک جس میں اس کے بدن کے نشیب و فراز نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ خود زیادہ دیر اپنے آپ کو نہ دیکھ سکی۔

''میرے خدا!'' اس نے طویل سانس لے کر سوچا۔ ''اگر اس حلیے میں، میں بڑے ابا کے سامنے چلی جاؤں تو یقیناً ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔''

''اللہ نہ کرے۔'' اپنی سوچ پر اسے جُھر جھری آ گئی اور اپنے آپ کو ملامت کرتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ حقیقتاً اس وقت اسے اپنے آپ سے نفرت سی ہو رہی تھی۔

کمرے میں آ کر اس نے وارڈ روب کھولی اور ہینگر پر لٹکا شلوار سوٹ اتار لیا۔ جیسے ہی پلٹی، ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینے میں اپنے آپ پر نظر پڑی۔

''یہ میں ہوں۔''

حقیقت کی آنکھ کھلی تو اپنا آپ اجنبی لگا۔ جلدی سے لباس تبدیل کر کے واپس آئی تو پھر اپنے مقابل خود کھڑی ہو گئی اور ابھی وہ اپنا محاسبہ کرنا ہی چاہتی تھی کہ کال بیل کی آواز نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ خرم کے آنے کا وقت نہیں تھا اس لیے وہ قیاس کرتی ہوئی دروازے تک آئی۔

باہر پوسٹ مین تھا جس نے اسے دو لفافے ایک ساتھ دیے۔ اندر آ کر اس نے بے صبری سے دونوں لفافے ایک ساتھ کھول دیے ایک میں ندا اور دانش کی شادی کا کارڈ تھا۔ دوسرے میں خط کے ساتھ چند تصویریں تھیں۔ وہ تصویریں دیکھنے کے بجائے خط پڑھنے لگی۔ سونیا نے خط نہ لکھنے کا شکوہ کیا تھا کچھ خفگی بھی تھی اور پیار بھری ڈانٹ بھی۔ آخر میں لکھا تھا۔

''میں ماں ہونے کا اعزاز حاصل کر چکی ہوں جس سے تم ترقی یافتہ ملک میں رہ کر بھی ابھی تک محروم ہو۔''

گو کہ اس نے مذاق میں یہ بات لکھی تھی لیکن اس کے دل پر جا لگی۔ وہ سوچ

لگی میری شادی اس سے کہیں پہلے ہوئی ہے اور میں ابھی تک اس نعمت سے محروم ہوں۔ ایک دم ہی سونے پن کا احساس ہونے لگا خط رکھنے کے لیے میز پر ذرا سا جھکی تو نظر تصویروں پر پڑی۔ وہ فوراً اٹھا کر دیکھنے لگی گول مٹول سا بچہ کہیں سونیا کی گود میں تھا اور کہیں عثمان کی گود میں اور اسے دیکھتے ہوئے جو الوہی چمک ان دونوں کے چہرے پر تھی وہ دنیا کی ہر شے کو مات دے رہی تھی۔

''بہت مبارک ہو سونیا!'' تصویر میں اسے مخاطب کر کے اس نے خلوص سے کہا اور پھر اسی وقت اسے خط لکھنے بیٹھ گئی۔

شام میں جب خرم آیا اس وقت وہ ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہی تھی۔ وہ یہی سمجھا کہ وہ ابھی آئی ہو گی لیکن اس کے چہرے اور انداز میں تھکن نہیں تھی بلکہ بہت فریش نظر آ رہی تھی۔

''چائے لاؤں؟'' وہ ٹی وی پر سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

''میں بنا لیتا ہوں۔''

''ارے نہیں۔'' وہ فوراً اٹھ گئی اور کچھ دیر بعد ہی چائے لے آئی۔

''تم کس وقت آئی ہو؟'' وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

''میں آج دن میں ہی آ گئی تھی۔''

''خیریت؟''

''ہاں کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ مائیکل نے کہا گھر چلی جاؤ اور میں آ گئی۔''

''لیکن مجھے تو تم روزانہ سے بہت بہتر نظر آ رہی ہو۔''

''ظاہر ہے۔ دن میں آرام جو کر لیا۔'' وہ ہنستی ہوئی اچھی لگ رہی تھی۔

رات میں جب وہ فراغت سے اس کے پاس بیٹھی تو دن میں جو کچھ سوچ چکی تھی، وہ بڑی سہولت سے اس سے کہنے لگی۔

''میرا خیال ہے آغا! ہمیں ماموں جی کی بات مانتے ہوئے واپسی کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

''کیا؟'' وہ یوں اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ کوئی انہونی بات کہہ رہی ہو۔

"اسی میں ہماری بہتری ہے۔"

"بائی داوے ذرا اس بہتری پر روشنی تو ڈالو۔"

جس انداز سے اس نے کہا اس سے وہ سمجھ گئی کہ اس وقت وہ جو بھی بات کرے گی، وہ نہ صرف مذاق اڑائے گا بلکہ رد بھی کرتا جائے گا اور وہ اسے کبھی قائل نہیں کر سکے گی اس لیے بڑی خوبصورتی سے موضوع بدل گئی۔ اس وقت تو بات آئی گئی ہوگئی لیکن وہ کیونکہ واپسی کا تہیہ کر چکی تھی بلکہ اب تو عالم یہ تھا کہ وہ ایک پل یہاں نہیں رُکنا چاہتی تھی۔ اگر بس چلتا تو اُڑ کر واپس چلی جاتی۔ لیکن اسے قائل کرنا اور واپسی کے لیے رضا مند کرنا بھی ضروری تھا۔ اس لیے وقتاً فوقتاً اس موضوع کو چھیڑنے لگی۔ شروع شروع میں اس نے مذاق میں ٹالا اور جب اس نے دیکھا کہ وہ واقعی سنجیدہ ہے تو وہ خود بھی سنجیدہ ہوگیا۔

"صبا! اگر تم سب سے ملنے کے لیے جانا چاہتی ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا بلکہ اگر کہو گی تو تمہارے ساتھ بھی چلوں گا لیکن جہاں تک مستقل وہاں رہنے کی بات ہے تو یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے اور یہ بات وہیں پر ہی میں نے تمہیں بتا دی تھیں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"جہاں تک میں سمجھا تھا تم بھی اس رینگتی ہوئی زندگی کو پسند نہیں کرتی تھیں پھر اب اچانک تمہیں وہاں جانے کی کیا سوجھی؟"

"میں سمجھتی ہوں آغا! یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ مجھے واپسی کا خیال جلدی آ گیا ورنہ ہمارا انجام بھی مسز رحمٰن کی طرح ہوتا۔"

"سب کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا صبا! اور پھر یہ تو تربیت پر منحصر ہے ہوسکتا ہے مسز رحمٰن کی تربیت شروع ہی سے غلط رہی ہو۔"

"میں نہیں مانتی۔ کیونکہ کوئی ماں اپنی اولاد کے لیے غلط انداز سے نہیں سوچتی یہاں میں سارا الزام اس معاشرے اور ماحول کو دوں گی۔"

"ٹھیک ہے لیکن تمہاری کون سی اولاد ہے جس کے لیے تم ابھی سے پریشان ہو رہی ہو۔"

"ہے نہیں تو ہو جائے گی اور اولاد سے پہلے میں سمجھتی ہوں مجھے اپنی اصلاح کی

بھی ضرورت ہے میری شخصیت پر اگر اس ماحول کا تھوڑا سا رنگ بھی ہے تو میں اسے اتار پھینکنا چاہتی ہوں۔"

"صبا!" وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔ "مجھے تو تم اسی رنگ میں اچھی لگتی ہو۔"

"اچھا!" وہ ہنسی۔ "لیکن اگر یاد کرو آغا! تو اوّل روز میری کسی مشرقی ادا پر تم نے مجھے مغربی لڑکیوں سے ممتاز کیا تھا۔"

"ہوسکتا ہے۔ میں نے ایسا کچھ کہا ہو لیکن۔" وہ خاموش ہو کر جانے کیا سوچنے لگا تھا کافی دیر بعد ہاتھ اُٹھا کر فیصلہ کن انداز میں کہنے لگا۔

"خوامخواہ بحث کر کے بدمزگی پیدا کرنے کا کیا فائدہ؟ کیونکہ یہ تو طے ہے کہ مجھے واپس نہیں جانا۔ ہاں اگر تم جانا چاہو تو۔"

"آغا!" اس نے ٹوک دیا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب تو واضح ہے کہ میں یہاں رہنا چاہتا ہوں اور تم ایسا نہیں چاہتیں۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ یہاں سے ہمارے راستے الگ ہو جاتے ہیں۔"

"خرم آغا!" وہ دُکھ اور تاسف سے اسے دیکھنے لگی۔ "کتنی آسانی سے تم نے یہ بات کہہ دی۔"

"تو پھر تم اپنی ضد چھوڑ دو۔"

"یہ میری ضد نہیں لیکن اب تم نے اسے میری ضد بنا دیا ہے۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی پھر جاتے جاتے کہنے لگی۔

"سنو جتنی جلدی ہو سکے میری واپسی کا انتظام کردو۔" اس نے پہلے بھنویں اچکائیں پھر ہونٹ بھینچتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا تھا۔

دونوں کے درمیان ایک سرد جنگ کا آغاز ہوگیا تھا۔ اگلے تین چار دن تک وہ اس سے کھنچی کھنچی رہی۔ گو کہ وہ خود بھی مطمئن نہیں تھی۔ اوّل تو اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ایک ذرا سی بات پر راستہ الگ کرنے کی بات کی ہے اور اگر یقین کرتی تو پھر

سارا الزام اسی معاشرے پر آتا تھا اس نے سوچا۔

"اپنے ہاں ہزار ہا اختلافات کے باوجود ایسی بات کرنے سے پہلے بندہ ہزار بار سوچتا ہے اور اس نے تو بنا سوچے ہی فیصلہ سنا دیا تھا۔"

اسے حقیقتاً بہت دکھ ہوا تھا۔ گویا اس کے نزدیک دو ڈھائی سالہ ازدواجی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس وقت وہ کچن میں کھڑی یہی سب سوچ رہی تھی جب وہ اس کے پاس آکر کہنے لگا۔

"سنو، کیوں نہ ہم ایک درمیانی راستہ اختیار کرلیں۔" وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہاری کزن کی شادی ہے تم اس میں شرکت کے لیے چلی جاؤ۔ پھر وہاں سے حویلی چلی جانا۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو۔"

"میں چاہتا ہوں، ہم کچھ وقت کے لیے ایک دوسرے سے الگ ہو کر سوچیں۔ شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہی ہو ناں۔" وہ اس کی آنکھوں دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہوسکتا ہے جہاں جانے کے لیے تم اتنی بے تاب ہو رہی ہو وہاں سے بہت جلد اُکتا کر واپس میرے پاس آنے کا سوچو یا پھر مجھے تمہاری یا اس زمین کی کشش تمہارے پاس کھینچ لائے۔"

"سوچ لو خرم آغا! ایسا نہ ہو ایک عمر گزر جائے اور ہم ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہیں۔" اس کی بات پر وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"چلو تو کوئی ایک وقت مقرر کرلو۔ میرا مطلب ہے، کوئی ماہ کوئی سال جو ہمارے انتظار کی حد ہو۔ اگر ہم اس حد کے اندر ایک دوسرے تک نہ پہنچے تو پھر ایک دوسرے کے پابند بھی نہیں رہیں گے۔"

وہ چپ چاپ اس کی طرف دیکھے گئی جب اندر سے جذبوں نے شور مچانا شروع کیا۔

"ہمارا یقین کرو، ہمارا یقین کرو۔" تب طویل سانس لیتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد وہ اسے خدا حافظ کہہ رہا تھا اور وہ جاتے جاتے بولی تھی۔

"سنو! آج کی تاریخ یاد رکھنا، آئندہ سال اسی ماہ کی اسی تاریخ کو ہماری حد ختم ہو جائے گی۔"

☆......☆......☆

وہ بغیر اطلاع دیے آئی تھی اور شاید اس کی آمد غیر متوقع بھی تھی، جبھی تو سب خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ پہلے وہ بہت دیر تک بڑے ابا کے پاس بیٹھی اور ان کے سوالوں کے جواب بہت اعتماد سے دیے اس نے محسوس کیا کہ بڑے ابا اس کی طرف سے نہ صرف یہ کہ فکر مند تھے بلکہ انجانے اندیشوں میں بھی گھرے ہوئے تھے۔ اس نے بہت سہولت سے انہیں اپنی طرف سے مطمئن کیا اور جب وہ اپنے دوستوں جیسے کزنز کے درمیان آئی تو سب نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ اس صورتِ حال کے لیے پہلے سے تیار تھی کسی کی بات کا جواب نہیں دیا بس ہنستی رہی تھی۔

"واہ! یہ اچھا طریقہ ہے ہم تو بول بول کر تھک رہے ہیں اور یہ محترمہ ہنسے جا رہی ہیں۔" سونیا کی بات پر وہ اور زور سے ہنسی۔

"بھئی، اب رونے سے تو رہی خیر تم سب آرام سے بیٹھو تو میں مختصراً اپنے بارے میں بتائے دیتی ہوں۔"

سب خاموش ہو گئے تو اس نے مختصراً اپنے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے آخر میں یہ کہہ کر سب کو مطمئن کیا کہ وہ ٹھیک ٹھاک اور خوش و خرم ہے۔ اس نے دانستہ اپنے اور خرم کے اختلاف کو چھپایا تھا۔ اس کا خیال تھا ابھی یہ سب کہنا قبل از وقت ہوگا۔ ہوسکتا ہے حالات اس کے حق میں ہو جائیں۔ اس لیے اسے وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

پھر ندا اور دانش کی شادی تک، اس نے خود بھی اس بارے میں نہیں سوچا۔ اپنے ذہن سے ہر سوچ، ہر خیال جھٹک کر ہی وہ اس خوشی کو انجوائے کرسکی تھی۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہوا اس کے بعد بھی ہر بات معمول پر آنے میں کچھ وقت لگا تھا۔

شادی کے چوتھے دن بڑے ابا نے خود ندا اور دانش کو پاکستان ٹور پر بھیج دیا تھا۔ یہ بات اس کے لیے واقعی حیران کن تھی۔ اس نے سونیا سے پوچھا یہ کیا ماجرا ہے؟

"بھئی، بڑے ابا کی حد بندیاں شادی سے پہلے تک ہی ہوتی ہیں۔" سونیا بتانے لگی۔

"اور پتا ہے صبا جب سے میری شادی ہوئی ہے مجھے انہوں نے کسی بات پر نہیں ٹوکا۔ اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اگر عثمان ناحق مجھ پر رعب جمانے کی کوشش کریں تو انہیں بھی ڈانٹ دیتے ہیں۔"

"اچھا!" وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر کہنے لگی۔

"پتا ہے سونیا! جب مجھے تمہاری شادی کا کارڈ ملا تو اس وقت مجھے تم پر افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا تھا تمہاری آئندہ زندگی بھی ان دیواروں کے اندر گزر جائے گی۔"

"میں نے بھی یہی سوچا تھا۔" سونیا ہنسی۔ "لیکن تیسرے ہی دن بڑے ابا نے ہمیں ہنی مون کے لیے بھیج دیا اس کے بعد یہ کہتے ہوئے مجھ سے دستبردار ہو گئے کہ اب تم میری نہیں عثمان کی ذمہ داری ہو۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"ویسے اگر دیکھا جائے صبا تو بڑے ابا نے جو ماحول ہمیں دیا وہی بہتر ہے اب جب میں، عثمان کے ساتھ باہر نکلتی ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ خوامخواہ بڑے ابا سے نالاں رہے، ورنہ جس طرح انہوں نے ہمیں ہر غلط بات اور ہر غلط نظر سے بچایا، یہ انہی کا کمال ہے اور آج جب میں اپنی گزشتہ زندگی کو بے داغ اور گندگی سے پاک دیکھتی ہوں تو مجھے اپنے آپ پر فخر ہونے لگتا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" وہ بولی تو اُس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ "میں نے بھی باہر نکل کر جانا کہ جو عزت، وقار اور تحفظ ایک عورت کو گھر میں حاصل ہوتا ہے، وہ باہر نہیں۔ ہم صرف مغرب کی تقلید میں آزادیٔ نسواں کا نعرہ لگاتے ہیں ورنہ اگر مجھ سے پوچھو تو وہاں کی عورت بہت بے مایا ہے۔" قدرت توقف کے بعد کہنے لگی۔

"اگر ہم مغرب کو دیکھنے کے بجائے اپنے مذہب کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں تو اس میں بڑی وسعت ہے۔ ایک وقار کے ساتھ آزادی تو ہمیں ہمارے مذہب نے بھی دی ہے۔ ہمیں باہر نکلنے کو منع نہیں کیا گیا لیکن اس طرح کہ نسوانیت پر آنچ نہ

آئے، لیکن یہاں ہماری بدقسمتی ہے کہ اکثریت مغرب سے متاثر ہے۔" وہ طویل سانس لے کر خاموش ہوئی تو سونیا کہنے لگی۔

"بہر حال ہم خوش نصیب ہیں کہ بڑے ابا کے زیرِ سایہ پروان چڑھے۔"

"بالکل یہ انہی کی تربیت کا اثر ہے کہ میں اتنی جلدی سے ماحول سے اکتا گئی ہوں۔" پھر وہ بڑی رازداری سے کہنے لگی۔

"ایک بات بتاؤں سونیا! لیکن ابھی تم اسے کسی اور تک مت پہنچانا۔ عثمان تک بھی نہیں۔"

سونیا نے اس کا ہاتھ دبا کر گویا وعدہ کیا تو اس نے اپنے اور خرم آغا کے اختلاف کے بارے میں ایمانداری سے بتا دیا شاید اسے دل کی بات کہنے کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔ ساری بات سن کر سونیا نے اصرار کیا کہ اسے بڑے ابا کو بتا دینا چاہیے، لیکن وہ نہیں مانی۔ اس نے کہا وہ وقت کا انتظار کرے گی۔

پھر کچھ دن ہی گزرے تھے کہ ماموں جی اسے لینے آگئے۔ انہیں شاید خرم آغا نے اس کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ انہوں نے شکوہ کیا تو وہ کہنے لگی۔

"بس ماموں جی! اب میں آپ کے پاس آنے ہی والی تھی۔ اصل میں یہاں شادی کی وجہ سے اتنے دن رُکنا پڑا۔"

"ٹھیک ہے تو اب فوراً تیاری کرلو۔"

"جی!"

اسی شام وہ ماموں جی کے ساتھ چلی گئی نانی اماں اور مامی جی نے اس کی آمد پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔

اب وہ مہمان نہیں تھی، یہی اس کا گھر تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے اپنے لیے کمرہ منتخب کیا مامی جی نے کہا بھی کہ وہ خرم کا کمرہ استعمال کرسکتی ہے لیکن اس نے منع کر دیا حویلی کے معمولات اب بھی ویسے ہی تھے وہی خاموشی، وہی سناٹا، لیکن اسے برا نہیں لگا۔ اس نے سوچا اب نانی اماں اور مامی جی تو اس سناٹے کو توڑنے سے رہیں۔ ہاں اگر وہ اور خرم یہاں رہتے تو یقیناً اب تک اس میں تبدیلی آچکی ہوتی۔ خرم کے ساتھ ساتھ وہ

اپنے آپ کو بھی قصوروار ٹھہرانے لگی کہ والدین کتنے ارمانوں سے اولاد کی شادی کرتے ہیں تاکہ گھر میں ایک خوشگوار سی ہلچل پیدا ہو جائے اور وہ کتنی خود غرض تھی کہ خرم کو سمجھانے کے بجائے خود بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔

پھر اسے معظم آغا کا خیال آیا۔ کتنی دیر سے آئی ہوئی تھی وہ اور ان سے سامنا نہیں ہوا تھا۔

''پتا نہیں انہیں میرے آنے کی خبر ہے بھی کہ نہیں۔''

وہ سوچتی ہوئی ان کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ وہ کمرہ جہاں بیٹھ کر وہ پتھر تراشا کرتے تھے، اب بھی ویسا ہی تھا، لیکن ان پتھروں کے درمیان معظم آغا موجود نہیں تھے۔ وہ اسٹور نما کمرے سے آگے بڑے کمرے تک دیکھ آئی، لیکن وہ کہیں نہیں ملے۔ واپس اپنے کمرے میں آنے سے پہلے وہ مامی جی کے پاس رُک گئی۔

''معظم آغا اپنے کمرے میں نہیں ہیں کہاں گئے ہیں؟'' وہ ان سے پوچھنے لگی۔

''وہ تو پچھلے تین چار دن سے اسلام آباد میں ہے۔''

''خیریت؟''

''وہی اپنے مجسموں کی نمائش کے سلسلے میں۔''

''ارے۔'' اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''ہاں اس بہانے گھر سے نکلنے تو لگا ورنہ تو کہیں جاتا ہی نہیں تھا۔'' مامی جی بھی ان کی طرف سے کچھ مطمئن نظر آ رہی تھیں۔

''پہلی بار نمائش کر رہے ہیں یا اس سے پہلے بھی؟''

''ایک بار لاہور میں کر چکا ہے۔''

''کاش مجھے پتا ہوتا تو میں آتے ہوئے ان کے پاس سے ہو کر آتی۔ ماموں جی نے بھی نہیں بتایا۔'' اسے واقعی افسوس ہو رہا تھا۔

''چلو پھر کبھی اس کے ساتھ چلی جانا۔'' مامی جی نے مسکرا کر اس کا گال تھپکا پھر اس کے ساتھ خرم کی باتیں کرنے لگیں۔ وہ بار بار اس سے پوچھ رہی تھیں کہ وہ آیا کیوں نہیں یہ پھر یہ کہ وہ کب آئے گا؟

کئی بار اُس کے جی میں آیا کہ وہ انہیں بتا دے۔ وہ آنا ہی نہیں چاہتا، لیکن ہر بار اس نے اپنے آپ کو روکا۔ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ اسے خود اس کی یا اس زمین کی کشش ضرور کھینچ لائے گی۔ پھر وہ یہ بات کہہ کر مامی جی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

دو روز بعد معظم آغا آئے۔ اس وقت وہ اپنی نگرانی میں مالی سے لان ٹھیک کروا رہی تھی۔ انہوں نے گیٹ سے داخل ہوتے ہی اسے دیکھ لیا تھا، اس لیے سیدھے اس کے پاس چلے آئے۔

''صبا!'' وہ ان کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ انہوں نے قریب آ کر پکارا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی اور کہیں تبدیلی نہیں بھی تھی تو ان میں کافی تبدیلی نظر آ رہی تھی۔ وہ گھنے بال جو ہمیشہ کشادہ پیشانی کو ڈسٹرب کیا کرتے تھے۔ اس وقت سلیقے سے جمے تھے۔ آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیاں بھی نہیں تھیں بلکہ زندگی کو قریب سے دیکھنے کے رنگ واضح نظر آ رہے تھے۔ اس نے سلام کرنے کے ساتھ اپنی پیشانی کو بھی انگلیوں سے چھوا اور انہوں نے جواب دینے کے ساتھ اپنا بھاری اور مضبوط ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

''معظم بھائی!'' اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔

''ارے!'' انہوں نے پیار بھری سرزنش کے ساتھ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''یہ کیا حماقت ہے؟''

''اتنے دنوں بعد آپ کو دیکھ کر اچھا لگا۔''

''اچھا!'' وہ ہنسے۔ ''یہ بتاؤ کب آئیں؟''

''دو روز پہلے۔''

''خرم بھی آیا ہے؟'' وہ اس کے ساتھ اندر آتے ہوئے پوچھنے لگے۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''وہ ابھی نہیں آئے گا۔'' وہ گول مول سا جواب دے کر موضوع بدل گئی۔ ''یہ

"بتایئے آپ کی نمائش کیسی رہی؟"

"زبردست"

"مجھے یہاں آ کر معلوم ہوا اگر پہلے سے پتا ہوتا تو ضرور آتی۔"

"اور اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم آ رہی ہو تو میں تمہارا انتظار کرتا۔ خیر آئندہ سہی۔ اب تو تم یہیں رہو گی ناں۔" وہ برآمدے میں رکھی کرسیوں پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"پتا نہیں۔"

"کیا مطلب، کیا ارادہ ہے خرم کا؟"

"خرم یہاں نہیں آنا چاہتا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "اور میں وہاں نہیں جاؤں گی۔"

"صبا!" وہ شاید وضاحت چاہتے تھے لیکن وہ تیز قدموں سے اندر چلی آئی۔

☆......☆......☆

اسے یہاں آئے ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ اس دوران ایک بار بھی خرم نے فون نہیں کیا جبکہ اسے بڑی شدت سے انتظار تھا۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کے ارادے میں کچھ لچک پیدا ہوئی یا نہیں، لیکن وہ تو جیسے اس کے ساتھ ساتھ باقی سب کو بھی بھلائے بیٹھا تھا اور اس کی اسی بے نیازی نے اسے خاصا ڈسٹرب کر دیا تھا۔ شروع شروع میں جو وہ یہ سوچ کر مطمئن تھی کہ وہ ضرور آئے گا۔ اب اس کا اطمینان رخصت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سوچتی، اگر مقررہ حد گزرنے تک وہ نہ آیا تو وہ کیا کرے گی، اس کے لیے تو کہیں بھی جگہ نہ رہے گی، نہ یہاں اور نہ بڑے ابا کے گھر۔ اس کا خیال تھا کہ جب بڑے ابا کو اصل صورتِ حال معلوم ہو گی تو وہ اُسے ہی خرم کے پاس جانے کے لیے کہیں گے اور اب تو ضد کے ساتھ اَنا کا مسئلہ بھی آن پڑا تھا۔

"کیا بات ہے، تم کچھ پریشان رہنے لگی ہو؟" اس وقت بھی وہ انہی سوچوں میں گھری تھی، جب معظم آغا اس سے پوچھنے لگے۔

"نہیں۔ اصل میں مجھے اس فراغت نے بور کر دیا ہے یہاں کرنے کو کچھ نہیں ہے اور میں کچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"مثلاً!"

"مثلاً" وہ سوچ میں پڑ گئی پھر اچانک کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "معظم بھائی! کیوں نہ یہاں ایک اسکول بنا لیں؟"

"ہوں، آئیڈیا تو اچھا ہے، لیکن۔"

"لیکن کیا؟" وہ فوراً بول پڑی۔

"یہاں پڑھانے کوئی نہیں آئے گا۔"

"کیوں؟"

"یہاں سے لوگ شہروں کا رُخ تو کرتے ہیں لیکن شہروں سے لوگ یہاں آنا پسند نہیں کرتے۔"

"نہ آئے کوئی، میں خود پڑھا لوں گی۔" وہ ایک عزم سے بولی۔

"سوچ لو، بڑا مشکل کام ہے۔"

"میرا خیال ہے، میں مشکل پسند ہوں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولی۔

"کیسے؟"

"آپ کے بھائی خرم آغا کے ساتھ زندگی گزارنا آسان تو نہیں ہے۔"

"یہ کیوں نہیں کہتیں کہ اس نے تمہیں زندہ رہنے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے۔" وہ بھائی کی طرف داری کرنے لگے۔

"کسی حد تک کریڈٹ اسے جاتا ہے، ورنہ میں خود۔"

"ہاں تم کیا تھیں میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" انہوں نے مذاق اُڑایا۔

"کیا؟ کیا تھی میں؟"

"جانے دو بی بی! کچھ کہا تو رونے لگو گی۔" وہ ہنستے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"جا کہاں رہے ہیں، پہلے میرے منصوبے پر تو غور کریں۔"

"تمہارا منصوبہ اچھا ہے، اس لیے اس پر غور کرنے میں وقت برباد نہیں کرنا

چاہیے۔ بس تم اپنا سارا پروگرام ابو جی کو بتا دو، اگر انہوں نے پسند کیا تو فوراً کام شروع کروا دیں گے۔''

''واقعی!'' وہ کچھ دیر اُس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولے۔

''خرم نے تمہیں یقین کرنا نہیں سکھایا؟''

''اس نے مجھے یقین دیا نہیں تو سکھائے گا کہاں سے؟''

''صبا!'' وہ دوبارہ بیٹھ گئے۔ ''تم بتاتیں کیوں نہیں کہ معاملہ کیا ہے، کیا خرم سے تمہاری لڑائی ہوئی ہے؟''

''نہیں''

''پھر؟''

''کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ اُٹھنے لگی تو انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا۔

''میں جب اس موضوع پر بات کرتا ہوں تم اُٹھ کر چل دیتی ہو۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ مجھے نہیں تو امی، ابو جی یا بڑی اماں میں سے کسی سے کہو، ورنہ مجھے کہنا پڑے گا کہ تم ہم میں سے کسی کو بھی اپنا نہیں سمجھتیں۔''

''اپنا نہ سمجھتی تو یہاں کیوں آتی؟''

''یہاں نہیں آ ؤ گی تو کہاں جاؤ گی؟'' ظاہر ہے، اب یہی تمہارا گھر ہے اور گھر والے بھی تمہارے اپنے ہیں اگر خرم نے کوئی مسئلہ کھڑا کیا ہے تو ہمیں بتاؤ۔''

''آپ کیا کریں گے؟'' وہ ہار ماننے لگی تھی۔

''میں اسے کان سے پکڑ کر تمہارے سامنے لا کھڑا کروں گا پھر تم جو چاہے......''

ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہر طرف اس کے نام کی صدائیں گونجنے لگیں۔

''صبا......صبا......'' خاموشی کے بعد بازگشت۔

''صبا......صبا......''

''لو وہ خود ہی آ گیا۔'' معظم آغا پلٹ کر گیٹ کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ آوازوں میں کھوئی تھی چونکی اس وقت جب وہ سامنے آن کھڑا ہوا۔

''بالآخر صبا! تمہاری کشش مجھے کھینچ ہی لائی۔''

اس کے انداز میں حد درجہ بے تکلفی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ وہ دزدیدہ نظروں سے معظم آغا کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ متوجہ نہیں تھے، اس کے باوجود متوجہ لگ رہے تھے۔

''کمال ہے یار!'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''تم ساتھ تھیں تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا، لیکن تمہارے آنے کے بعد میں نے جانا کہ تم میری زندگی میں کس طرح رچ بس گئی ہو۔ یقین کرو ایک ایک پل گن کر گزارا ہے۔''

''آغا!'' وہ کہنا چاہتی تھی معظم بھائی کا خیال کرو، لیکن وہ وہیں پر اپنے ہر پل کا حساب دینے کھڑا ہو گیا۔

''عجیب آدمی ہو۔'' وہ اسے دھکا دے کر اندر کی طرف بھاگی اور اس کے ساتھ ساتھ معظم بھائی کے پکارنے پر بھی نہیں رُکی۔

اپنے کمرے میں آتے ہی وہ دروازے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ دل قابو میں نہیں رہا تھا۔

''کیا دل یہ نہیں چاہتا کہ اچانک کوئی ایسی بات ہو جائے کہ دل اس زور سے دھڑکے کہ سنبھالنا مشکل ہو جائے۔''

اپنی ہی بات یاد کر کے وہ ہنس پڑی۔ اب وہ آ گیا تھا تو ایسی باتوں کو زندگی میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

محبت کا حصار

"اُف اس لوفر سے سامنا ضرور ہونا ہوتا ہے۔" اس پر نظر پڑتے ہی میں نے جل کر سوچا اور میرے سارے موڈ کا ستیاناس ہو گیا۔ کم بخت کو اور کوئی کام ہی نہیں تھا پھر جیسے میرے، آنے جانے کے اوقات تو اسے ازبر ہو چکے تھے ابھی موجود تھا اور میری واپسی پر بھی ضرور وہیں کھڑا ہو گا۔ کوئی ڈھنگ کا بندہ ہوتا تو بات بھی تھی شکل ہی سے آوارہ لگتا تھا۔ مزید مجھے دیکھتے ہی جس قسم کے پوز مارتا تھا اس سے تو میری پوری جان جل جاتی تھی روزانہ کی طرح اس وقت بھی میں کالج میں داخل ہوئی تو بے حد تپی ہوئی تھی۔

"واحد لڑکی ہے جس کا یہ روشن، چمکیلی اور ٹھنڈی میٹھی صبح کچھ نہیں بگاڑتی۔"

مجھے دیکھ کر نائمہ نے تزئین سے کہا تو وہ اس کی تائید کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک کہتی ہو حالانکہ یہ اتنا سہانا سے ہوتا ہے کہ عام سے عام شکل بھی کھلی کھلی نظر آتی ہے۔" پھر مجھ سے پوچھنے لگی۔ "صبح صبح کس کا منہ دیکھ لیتی ہو؟"

"آئینہ دیکھ لیتی ہو گی بیچاری۔" نائمہ کہہ کر خود ہی ہنسی۔

"نہیں خیر اس کی شکل اتنی بری تو نہیں ہے بلکہ اچھی خاصی ہے۔" تزئین نے مذاق میں نائمہ کا ساتھ نہیں دیا پھر کہنے لگی۔ "لگتا ہے اس کے گھر میں۔"

"خدا کے لیے تم دونوں اپنی بکواس بند کرو۔" میں ان کی قیاس آرائیوں پر چیخ پڑی۔ "ایک تو پہلے ہی دماغ خراب ہوتا ہے اوپر سے تم لوگ۔"

"یہی تو ہم جاننا چاہتے ہیں کہ پہلے سے دماغ خراب کیوں ہوتا ہے؟"

"اس لوفر کی وجہ سے۔" میرے منہ سے بلا ارادہ ہی نکل گیا حالانکہ ابھی تک میں نے انہیں نہیں بتایا تھا اور بتانا بھی نہیں چاہتی تھی لیکن اب منہ سے نکل گیا تو وہ دونوں پیچھے پڑ گئیں۔

"کون ہے؟ کیا ہے؟ کب سے ہے یہ سلسلہ؟"

"لاحول ولا۔" میں جھنجھلا گئی۔ "کم بختو! تم تو ایسے مشتاق ہو رہی ہو جیسے میں نے خوبرو نوجوان کہا ہو۔"

"ارے آج کل لوفر ہی خوبرو ہوتے ہیں۔ شریف آدمی تو بیچارہ حالات کی چکی میں پس رہا ہوتا ہے۔"

تزئین نے فوراً فلسفہ جھاڑنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے ٹوک دیا۔

"بس رہنے دو۔"

"رہنے دیا۔ اب تم جلدی سے اس لوفر کے بارے میں بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں۔ آتے جاتے میرے راستے میں کھڑا رہتا ہے، کبھی مسکراتا ہے کبھی اشارے سے سلام کرتا ہے۔"

میں غصے میں بول رہی تھی لیکن ان دونوں کو ذرا احساس نہیں تھا۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"ہائے اس کی مسکراہٹ کیسے ہے؟" مجھے غصے کے باوجود ہنسی آ گئی۔

"لعنت ہو تم پر، اب کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"مت بتاؤ، ہم خود سمجھ گئے ہیں، یعنی مسکراتا ہے، اشارے سے سلام کرتا ہے پھر پیچھے پیچھے آئے گا پوچھے گا آپ کا نام کیا ہے؟ اس کے بعد۔"

"اس سے پہلے میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔" میں نے فائل اونچی کر کے تزئین کے سر پہ مارنی چاہی لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی۔

"مذاق ختم یار! یہ بتاؤ تم اب تک خاموش کیسے ہو؟ میرا مطلب ہے تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو پہلے دن وہیں روڈ پر اسے اتنے جوتے لگاتی کہ وہ ساری زندگی کے لیے مسکرانا بھول جاتا کیا تم میں اتنی ہمت نہیں ہے۔"

''ہمت ہو تو بھی کیا میں کہاں اسے کچھ کہہ سکتی ہوں۔''

میرے بے بسی سے کہنے پر تزئین ٹھٹھک کر بولی۔

''کیا مطلب؟''

''یار! وہ میری آپا کا دیور ہے اور آپا کے سسرال والے تو یوں بھی بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں ذرا ذرا سی بات پر انہیں گھر سے نکالنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اگر میں نے اس لوفر سے کچھ کہا تو پھر تو آپا بیچاری پر زندگی اور تنگ ہو جائے گی۔''

میں نے افسوس کے ساتھ انہیں اصل صورتِ حال بتائی پھر باری باری دونوں کو دیکھ کر بولی۔''اب بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں؟ سوائے تپنے جلنے، کڑھنے کے۔''

''تم نے اپنی آپا کو بتایا؟''

''ہاں لیکن آپا کیا کر سکتی ہیں؟ اور اس کے بارے میں تو آپا بتاتی ہیں کہ بہت ہی منہ پھٹ، بدتمیز اور بدلحاظ ہے۔ اپنے ماں باپ تک کو خاطر میں نہیں لاتا اور مجھ سے آپا نے ہی کہا ہے کہ میں بالکل خاموش رہوں۔ اس کی طرف توجہ ہی نہ دوں لیکن وہ اتنا ڈھیٹ ہے کہ کیا بتاؤں، میرے ناگواری سے دیکھنے پر بھی مسکراتا ہے۔''

میں سچ مچ روہانسی ہوگئی تو دونوں ٹوکنے لگیں۔

''پاگل ہو تم، بھلا اس میں رونے کی کیا بات ہے لعنت بھیجو۔ خود ہی تمہارے رویے سے مایوس ہو کر کہیں دفعان ہو جائے گا۔ ورنہ ہم سے کہو ہم اس کے مزاج ٹھکانے لگا دیں۔''

''نہیں پلیز، اگر اسے ذرا سا بھی شبہ ہو گیا تو آپا کو بہت تنگ کرے گا۔'' میں نے گھبرا کر انہیں منع کیا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے لیکن وہ میرے رویے سے مایوس نہیں ہوا۔ پتا نہیں اس کا مقصد کیا تھا؟ جانے اچانک اسے مجھ میں کوئی خاص بات نظر آئی تھی یا محض تنگ کرنا مقصود تھا اور کچھ بھی تھا۔ میں بہر حال بہت عاجز آئی ہوئی تھی صبح کالج کے لیے نکلتی تو وہ راستے میں موجود ہوتا۔ واپس آتی تب بھی اس پر نظر ضرور پڑتی یوں لگتا تھا جیسے وہ سارا وقت میرے ہی انتظار میں کھڑا رہا ہو۔ اور جس طرح کالج جاتے ہوئے میرا موڈ

خراب ہو جاتا تھا اسی طرح واپس گھر میں بھی بہت تپی ہوئی آتی تھی۔ اس روز اتفاق سے آپا موجود تھیں بس انہیں دیکھتے ہی میں شروع ہو گئی۔

''خدا کے لیے آپا! اپنے دیور کو باندھ کر رکھیں۔ کم بخت کو ذرا حیا نہیں ہے پتا نہیں کس مٹی کا بنا ہوا ہے ایسی سڑی گرمی بھی چین نہیں ہے اُسے۔''

آپا میرے لال بھبھوکا چہرے کو خاموشی سے دیکھتی رہیں پھر ان کے سر جھکانے پر میں احساس کر کے خاموش ہو گئی اور قدرے توقف سے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

''آئی ایم سوری آپا! اصل میں ابھی اسے دیکھ کر دماغ گھوم گیا۔''

''کچھ کہہ رہا تھا؟'' آپا نظریں چراتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''زبان سے تو خیر کچھ نہیں کہا۔'' میں بے سوچے سمجھے بول گئی۔

پھر احساس ہونے پر فوراً بات بدل گئی۔ ''آپ کب آئیں اور بچے کہاں ہیں؟''

''اندر ہیں۔''

''تو آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں آیئے اندر چلیں۔''

میں آپا کے ساتھ اندر آئی تو رونی اور فائزہ آ کر مجھ سے لپٹ گئے۔

''ہٹو پرے، دیکھتے نہیں ابھی باہر سے آئی ہے۔''

آپا نے بچوں کو ڈانٹا تو میں نے جلدی سے انہیں بازوؤں کے حلقے میں لے لیا۔

''توبہ ہے آپا! جلادوں کے ساتھ رہ کر آپ بھی جلاد بن گئی ہیں۔''

''ہاں صبح سے میں بھی دیکھ رہی ہوں خواہ مخواہ کا غصہ بچوں پر نکال رہی ہے۔ بھلا ان معصوموں کا کیا قصور؟''

اماں نے بھی آپا کو ٹوکا تو وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئیں۔

''کیا بات ہے آپا، پھر کوئی بات ہوئی ہے؟''

میں آپا کی خاموشی محسوس کر کے ان کے پاس آ بیٹھی اور جیسے ہی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا وہ رونے لگیں۔ ''آپا!'' میں پریشان ہو گئی اور اماں کو دیکھا تو وہ بھی...... آ کر ان سے پوچھنے لگیں۔

''کیا ہوا بانو؟ کچھ بتاؤ تو۔''

''اماں! وہ میرا دیور محمود۔'' آپا روتے ہوئے بولیں پھر ایک دم خاموش بھی ہو گئیں۔

''ہاں کیا ہوا محمود کو؟ کیا پھر تمہارے ساتھ بدزبانی کی؟'' اماں نے ٹوک کر پوچھا تو وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولیں۔

''بدزبانی کے علاوہ اماں اب وہ کہتا ہے کہ میری عالیہ سے شادی کرا دو۔''

''کیا؟'' میں بے ساختہ چیخنے کے ساتھ اچھل پڑی۔ جبکہ اماں سناٹے میں آ گئی تھیں اور قدرے توقف سے آپا پھر گویا ہوئی۔

''میں نے صاف منع کر دیا کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی بہن کا گلا گھونٹ سکتی ہوں لیکن تم جیسے بدتمیز سے شادی نہیں ہو سکتی۔ اس پر روز دھمکاتا ہے کہ تمہیں بھی اس گھر سے نکال باہر کروں گا۔''

''وہ کون ہوتا ہے آپ کو گھر سے نکالنے والا؟''

غصے میں مجھے اپنی آواز پر کنٹرول نہیں رہا تھا۔ اور اماں بھی میری تائید کرتے ہوئے بولیں۔

''ہاں، وہ کون ہوتا ہے، تم نے طارق سے نہیں کہا؟''

''آپ کو نہیں پتا اماں! اس گھر میں سب ہی اس سے دبتے ہیں۔ طارق تو بڑے بھائی ہیں ماں باپ بھی اس کے سامنے کچھ نہیں بولتے۔''

''لیکن ہم کاہے کو دبیں گے کوئی زبردستی ہے کیا؟''

اماں پہلے غصے سے بولیں۔ پھر آپا کو سمجھانے لگیں۔ ''تم اس معاملے میں پڑو ہی نہیں۔ اب اگر تم سے کہے تو صاف کہہ دینا تمہارا کوئی اختیار نہیں جا کر میرے ماں باپ سے بات کرو آگے ہماری مرضی ہم ہاں کہیں یا ناں۔''

''اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں آپا! آپ اپنی طرف سے کچھ نہ کہیں۔''

میں نے آپا کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تبھی رومی اور فائزہ بھوک بھوک چلانے لگے تو اماں کے کہنے پر میں کھانا نکالنے لیے اٹھ گئی۔

ظاہر ہے جب اس گھر میں آپا کی حیثیت زرخرید لونڈی جیسی تھی۔ ساس سسر کے علاوہ بیاہی ہوئی نندیں بھی ہر دوسرے دن آ کر آپا پر رعب جمانا اپنا حق سمجھتی تھیں اور

چھوٹی نند اور دیور کو بھی کوئی لحاظ نہیں تھا تو ایسے جہنم میں اماں ابا جانتے بوجھتے تو مجھے نہیں جھونک سکتے تھے اور گو کہ ابھی اس طرف سے باقاعدہ کوئی پیغام نہیں آیا تھا پھر بھی مجھے دھڑکا لگا رہتا تھا۔ حالانکہ میں یہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اماں صاف منع کر دیں گی بلکہ اماں کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ ان کے آنے سے پہلے ہی منع کروا دیں۔ پھر بھی جانے کیوں میرے اندر نامعلوم سا خوف گھر کر رہا تھا۔

آتے جاتے اب بھی وہ راستے میں کھڑا ملتا۔ میں اسے دیکھتے ہی نفرت سے منہ موڑ لیتی لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا بہرحال مجھے زیادہ فکر آپا کی تھی کہ ہمارے انکار کے بعد وہ آپا کو بہت تنگ کرے گا، اور اسے روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ پھر اپنے طور پر اماں نے تو آپا کو سمجھا دیا تھا کہ وہ اس معاملے میں نہ پڑیں لیکن ان کے سسرال والے کچھ زیادہ ہی چالاک تھے یوں تو انہیں کسی خاطر میں نہیں لاتے تھے لیکن اس کام کے لیے خاص طور سے انہیں نمائندہ بنا کر بھیج دیا جب آپا نے بتایا کہ ان کے ساس سسر نے خاص طور پر اس مقصد سے بھیجا ہے تو سچ مچ اماں چکرا کر رہ گئیں۔

''میں کیا کروں اماں؟''

آپا مکمل بے بسی کی تصویر بنی ہوئی تھیں مجھے ان پر بہت رحم آیا اور اماں کی تو عقل بالکل کام نہیں کر رہی تھی کبھی مجھے دیکھتیں کبھی آپا کو تب میری جو سمجھ میں آیا میں نے فوری خطرہ ٹالنے کی خاطر کہہ دیا۔

''آپا! آپ کہہ دیجیے گا کہ اماں نے سوچ کر جواب دینے کو کہا ہے۔''

اماں کچھ دیر تک مجھے دیکھتی رہیں پھر پُرسوچ انداز میں بولیں۔

''ہاں۔ ایسا ہی کہہ دینا بعد میں تمہارے ابا سے مشورہ کر کے میں خود منع کروا بھیجوں گی۔''

اس رات میں نے ابا اماں کی باتیں سنیں۔ دونوں بہت فکرمند تھے۔ ظاہر ہے۔ ہم دونوں بہنیں انہیں یکساں عزیز تھیں اور وہ کسی ایک کو دوسری پر قربان نہیں کر سکتے تھے۔ عجیب مشکل تھی نہ ہاں کر سکتے تھے نہ ناں اور کوئی تیسرا راستہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور ایسے ہی مایوسی کے عالم میں وہ سو گئے لیکن میں ایک فیصلہ کر کے ہی سوئی تھی۔

اگلے روز میں کالج جانے لگی تو اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا وہ گڑ بڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا، مجھے حیرت ہوئی کیونکہ اب تک تو اس کی طرم خانی کے قصے سنتی آ رہی تھی۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے لیکن یہاں کھڑے ہو کر نہیں۔''

میں نے پرسکون انداز میں کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا تو وہ غیر یقینی سے بولا۔

''آپ۔ آپ مجھ سے بات کریں گی؟'' ادھر ادھر بھٹکتی ہوئی میری نظریں اس پر ٹھہر گئیں تو وہ گڑ بڑا کر بولا۔

''میں بائیک لے کر آتا ہوں۔''

وہ تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا اور میں آہستہ قدموں سے اپنے راستے پر چلنے لگی کچھ دیر بعد اس نے میرے قریب بائیک روکی تو میں خاموشی سے اس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ گو کہ اندر سے میں خاصی خوف زدہ تھی لیکن اس پر بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا بلکہ میری کوشش تھی کہ میں اس پر حاوی رہوں اس لیے بات میں نے شروع کی وہ بھی بغیر کسی تمہید کے۔

''آپا تمہارا پرپوزل لے کر آئی تھیں اور اماں ابا کو تو کوئی اعتراض نہیں لیکن میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔''

وہ بہت شوق سے مجھے دیکھ رہا تھا میری آخری بات پر بجھ سا گیا اور دھیرے سے سر جھکا کر بس اسی قدر پوچھ سکا۔

''کیوں؟''

''ظاہر ہے میرا بھی وہی حشر ہو گا جو میری آپا کا ہوا ہے بلکہ تم لوگوں نے کیا ہے۔ کیا حیثیت ہے میری آپا کی تمہارے گھر میں یہ مجھ سے زیادہ تم جانتے ہو۔ خود تم نے کبھی انہیں بڑی بھاوج کا درجہ نہیں دیا۔ اور تمہاری ماں، بہنیں جب چاہتی ہیں انہیں نکال باہر کرتی ہیں۔ کم از کم میں تو یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔''

میں بمشکل اپنے لہجے پر قابو پا کر آرام سے بات کر رہی تھی ورنہ تو میں جتنی اس سے متنفر تھی، دل چاہ رہا تھا اس کے منہ پر طمانچہ مار کر کہوں تم نے مجھ سے شادی کا

سوچا کیسے۔

''آپ...... آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہو گا؟''

اس نے اس طرح سر جھکائے ہوئے کہا تو میں کتنی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ مجھے واقعی حیرت ہو رہی تھی یعنی اتنا بدتمیز اور بدلحاظ آدمی میرے سامنے نہ صرف سر جھکائے بیٹھا تھا بلکہ بولتے ہوئے بھی جھجک رہا تھا۔

''اس کی کیا گارنٹی ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہو گا۔'' میں نے کہا تو وہ فوراً بولا۔

''میرا یقین کریں۔''

''تمہارا یقین کر لوں؟'' میری طنزیہ ہنسی پر وہ ایک دم سر اٹھا کر مجھے دیکھنے لگا پھر کچھ رک کر بولا۔

''یہ صحیح ہے۔ میں بہت برا ہوں بدتمیز، بدلحاظ اور جانے کیا کچھ۔ ہو سکتا ہے آپ مجھے آوارہ، لوفر بھی سمجھتی ہوں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں اپنی بات سے کبھی نہیں پھرتا۔ جیسے چاہے آزما لیں۔''

میں خاموش رہی۔ بھلا مجھے کیا ضرورت تھی اسے آزمانے کی؟ معاً آپا کا خیال آیا تو میں بغور اسے دیکھنے لگی، کی رنگ سے میز کی سطح پر دائرہ بناتا ہوا بہت الجھن میں نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں میں ایسی سوچ کے رنگ تھے کہ اگر میں اسے نہ ملی تو...... اور میں نے تھوڑی سی دیر میں بہت کچھ سوچ ڈالا۔ پھر رات جو فیصلہ کر کے سوئی تھی اس کے بالکل برعکس میں نے اسے پکار کر کہا۔

''سنو محمود! مجھے تمہیں آزمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے میں تمہارا یقین کر سکتی ہوں!''

اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں اچانک روشنیاں جگمگانے لگیں، اور میں سر جھکا کر واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اماں نے سنا تو انہیں میری دماغی حالت پر شبہ ہونے لگا اور آپا نے تو رو کر برا حال کر لیا۔ کیونکہ وہ سمجھ گئی تھیں کہ میں ان کی خاطر محمود کے لیے ہامی بھرنے کو کہہ رہی ہوں۔ رو رو کر میری منتیں کرنے لگیں۔

“خدا کے لیے باز آجاؤ۔ مت اپنی زندگی خراب کرو۔”

“کوئی خرابہ نہیں ہوگی بلکہ آپ کی بھی سنور جائے گی۔” میں نے اطمینان سے کہا تو وہ جل کر بولیں۔

“کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا۔”

“کوئی خوش فہمی نہیں ہے مجھے۔ لیکن آپا اتنا تو ہوگا ناں کہ آپ کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے گا، ساس ایک وقت آپ کو بولے گی تو دوسرے وقت میں سن لوں گی۔”

میں نے ہنس کر کہا تو اماں سر جھٹک کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

پھر ظاہر ہے جب اماں اور آپا مجھے سمجھانے میں ناکام ہوگئیں تو انہیں ہامی بھرنی پڑی۔ یوں بہت جلد میں آپا کے دکھ بانٹنے ان کے گھر آ گئی۔ میرے ذہن میں واقعی بس یہ خیال تھا کہ آپا کے حصے کی کچھ زیادتیاں میں سہہ لوں گی لیکن میں یہ تو بھول ہی گئی تھی کہ میں جس کا ساتھ قبول کر رہی ہوں وہ اپنے گھر میں سب سے زور آور ہے اور مجھ سے محبت بھی کرتا ہے۔ اولین صبح میری آنکھ شور سے کھلی تھی میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ غور کیا تو ساس، نندیں ناشتے میں ذرا دیر ہو جانے پر آپا کو ڈانٹ رہی تھیں۔ میرا دل چاہا اسی وقت کمرے سے نکل کر آپا کے سامنے ڈھال بن جاؤں لیکن میں ایک رات کی دلہن بے بسی سے ہاتھ ملنے لگی۔ پھر محمود کو دیکھا۔ وہ غالباً اس شور کا عادی تھا۔ جب ہی اطمینان سے سو رہا تھا۔ میں نے آہستہ سے اس کا کندھا ہلایا تو وہ آنکھیں کھول کر دیکھنے لگا تب میں نے انجان بن کر پوچھا۔

“یہ شور کیسا ہے؟”

“شور۔” اس نے ایک لمحہ غور کیا پھر مجھ سے نظریں چرا کر اٹھتا ہوا بولا۔ “میں دیکھتا ہوں۔”

“سنیں، آپا کو یہاں بھیج دیجیے۔” وہ اثبات میں سر ہلا کر کمرے سے نکل گیا اور قدرے توقف سے اس کی آواز نے سب کو خاموش کرا دیا۔

“یہ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے تم لوگوں نے۔ ناشتا نہیں ملا تو جاؤ اپنے گھروں کو یہاں کس حساب سے اتنے اتنے دن ڈیرا جما کے بیٹھ جاتی ہو۔”

“ہائیں! ہائیں!” اس کی اماں نے ٹوکنا چاہا لیکن اس نے انہیں بھی خاموش کرا دیا۔

“بس اماں! بہت ہوگئی۔ اب یہاں ان کی اجارہ داری نہیں چلے گی، اور بھابھی کیا ان کی نوکر لگی ہوئی ہیں۔ چلیں بھابھی آپ اپنے کمرے میں جائیں جسے ناشتا کرنا ہو گا خود ہی بنائے گا۔”

میں نے کھڑکی سے ذرا سا پردہ ہٹا کر دیکھا آپا حیران پریشان اور کچھ سہمی ہوئی نظروں سے کبھی ساس نندوں کو دیکھ رہی تھیں اور کبھی اسے۔ اور میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پہلی بار آپا ڈری سہمی ہوئی اچھی لگ رہی تھیں۔

......۞......

تیری جستجو میں

''سنو حماد! میں شادی کرنا چاہتی ہوں فوراً۔''

اس نے اچانک کی بورڈ سے انگلیاں ہٹا کر حماد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو وہ یوں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو یہ بیٹھے بٹھائے کیا ہوا؟

''سنا تم نے کیا کہا میں نے؟ میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے دوبارہ اپنی بات دہرائی۔

''یہ اچانک شادی کا خیال آیا تمہیں بلکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تم تو اس چیز کے سخت خلاف تھیں۔'' حماد نے قدرے تعجب سے کہا۔

''جناب! ابھی اچانک خیال نہیں آیا مجھے! رات بہت دیر تک سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ مجھے فوراً شادی کر لینی چاہیے۔ اور یہ ٹھیک ہے کہ میں شادی کے خلاف تھی ابھی بھی ہوں۔ لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔'' وہ خاصی بیزاری سی شکل بنا کر بولی۔

''کیا مجبوری ہے؟'' وہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

''بس ہے کوئی مجبوری'' وہ کچھ لاپروائی سے کہہ کر پھر کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگی جس سے حماد سمجھ گیا کہ وہ مجبوری نہیں بتائے گی۔ تب سر جھٹک کر وہ بھی اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

''سنو!'' قدرے توقف سے اس نے پھر حماد کو متوجہ کیا تو اس بار وہ بیزاری سے بولا۔

''اب کیا ہے؟''

''وہ میں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہاری نظر میں کوئی اُلو کا پٹھا ہو تو بتانا۔''

''کیا؟'' وہ اچھل پڑا۔ ''کیا کہا تم نے الو کا پٹھا؟''

''ہاں!'' انتہائی سادگی سے جواب آیا۔

''ک......کیا۔ مطلب کیا ہے تمہارا؟'' حماد کی بوکھلاہٹ اور جھنجھلاہٹ قابل دید تھی۔

''کوئی مشکل زبان تو نہیں بولی میں نے۔'' وہ اندر ہی اندر محظوظ ہوئی بظاہر اسی سادگی سے بولی۔

''دیکھو! اگر تم مذاق کے موڈ میں ہو تو کسی اور کے ساتھ کر لو۔ میں اس وقت بہت ضروری فائل دیکھ رہا ہوں جسے ابھی سائن کے لیے باس کے پاس جانا ہے۔'' وہ تنبیہ کے ساتھ کہتا ہوا دوبارہ فائل پر جھک گیا تو وہ زور دے کر بولی۔

''میں ہرگز مذاق نہیں کر رہی۔ تم میری پوری بات تو سنو۔''

''شٹ اَپ۔'' حماد نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

''عجیب آدمی ہو۔ میرا خیال تھا، تم میری مدد کرو گے نہ سہی میں خود ہی۔'' وہ اپنے آپ بولے جا رہی تھی پھر سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گئی تھی۔

پانچ بجے جب آفس سے نکلنے لگی تو روزانہ کی طرح حماد کو ساتھ چلنے کو کہا نہ خدا حافظ۔ یہ غالباً اس سے ناراضگی کا اظہار تھا جو اکیلی ہی اسٹاپ پر آ کھڑی ہوئی کچھ دیر بعد حماد نے اس کے قریب لا کر بائیک روکی تب بھی وہ آرام سے منہ موڑے دور سے آتی بس کو دیکھتی رہی۔

''سنو! آج تم وہ بھول گئی ہو۔'' حماد نے کہا تو وہ بے اختیار اس کی طرف پلٹی۔

''کیا؟''

''خدا حافظ کہنا خدا حافظ!'' وہ بڑے مزے میں، ہاتھ ہلاتا بائیک بھگا لے گیا۔

''اُف'' وہ تلملا گئی تھی اور گھر آنے تک دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتی رہی تھی۔ مزید موڈ خراب کرنے کو آگے تائی جی موجود تھیں۔ اس عورت کو دیکھ کر تو سچ مچ اس کا خون کھولنے لگتا تھا۔

"آ گئیں انیلا، ہائے بچی بیچاری کیسی تھک جاتی ہے۔ سارا دن دفتر میں مغز ماری پھر بسوں کے دھکے۔" تائی جی کی چاپلوسی شروع ہوگئی۔

"جا بیٹی۔ منہ ہاتھ دھولے میں تیرے لیے۔"

"بس رہنے دیں تائی جی!" اس نے حتی الامکان اپنے لہجے پر قابو رکھ کر تائی جی کو اٹھنے سے روک دیا۔ پھر فوراً اماں کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"کیسی طبیعت ہے اماں آپ کی؟"

"اب تو بہت بہتر ہے۔" اماں نے کہا۔ ساتھ ہی آنکھوں سے اسے تائی جی سے بدتمیزی کرنے سے باز رہنے کا اشارہ کیا۔

"کھانا کھایا تھا آپ نے اور دوا۔" ان کا اشارہ سمجھ کر اس نے تائی جی کو یکسر نظرانداز کر دیا۔

"ہاں، اب میں بچی نہیں ہوں جو تم مجھ سے کھانے پینے کا پوچھو، جاؤ جا کر منہ ہاتھ دھوؤ۔" اماں نے اسے ٹوکا اور تائی جی اماں کو ٹوکنے لگی۔

"لو، ایک تو بچی تمہاری اتنی فکر کر رہی ہے اور تم اسے ڈانٹ رہی ہو۔"

"ہونہہ!" اس نے سر جھٹکا اور آنگن میں لگے واش بیسن پر منہ ہاتھ دھونے لگی۔ پھر وہیں سے کچن کا رُخ کیا کیونکہ جانتی تھی کہ تائی جی جلدی ٹلنے والی نہیں ہیں۔ رات تک بیٹھیں گی اور جو انہیں لینے آئے گا، وہ بھی کھانا یہیں کھائے گا۔ اس لیے چولہے پر چائے کا پانی رکھ کر وہ وہیں کھڑی ہو کر دال چننے لگی۔

دال چاول جلدی پک جاتے تھے۔ وہی پکا کر وہ فارغ ہوگئی ساتھ سلاد یا چٹنی کا کوئی تکلف بھی نہیں کیا گو کہ تائی جی روزانہ نہیں آتی تھیں لیکن ہفتے میں ایک چکر تو ان کا ضرور لگتا تھا، وہ ان کی آمد کا مقصد بھی جانتی تھی۔ وہ تو ایک بار ان کی باتیں سن کر...... ان کی نیت جان چکی تھی جب ہی ہوشیار ہوگئی تھی ورنہ اب تک تائی جی اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی ہوتیں۔

"یہ جو تائی جی ہر دوسرے دن آ جاتی ہیں۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔" صبح آفس کے لیے تیار ہوتے ہوئے وہ اماں کو سنا کر بولی۔

"پتا نہیں لوگ اپنے چہرے پر رنگ برنگے خول چڑھا کیسے لیتے ہیں؟ یہی تائی

جی پہلے میرے سلام کا جواب دینا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں اب واری صدقے جاتی ہیں۔ ہونہہ، زہر لگتی ہے مجھے ان کی بناوٹ۔"

اماں قصداً خاموش رہیں یوں بھی اس نے انہیں مخاطب نہیں کیا تھا اپنے آپ بولے جا رہی تھی۔

"ہائے بچی! بیچاری کیسی تھک جاتی ہے۔ اب میں بچی ہوگئی۔ چار سال پہلے مجھے پکی عمر کی عورت کہہ کر ریجیکٹ کر دیا تھا۔ کم از اپنی زبان پر تو قائم رہیں۔ کیوں اماں اب میں پہلے سے کم عمر نظر آتی ہوں کیا؟"

اس نے بالوں کو کلپ میں قید کرتے ہوئے اماں کو مخاطب کیا۔

"ہیں!" اماں نے یوں دیکھا جیسے اس کی کوئی بات سنی ہی نہ ہو۔ جس پر وہ تپ کر بولی۔

"میں جا رہی ہوں، خدا حافظ۔"

☆......☆......☆

باس کے آنے میں ابھی بہت دیر تھی۔ اس لیے وہ اطمینان سے اخبار لے کر بیٹھ گئی اور اس میں "ضرورتِ رشتہ" کے اشتہار دیکھنے لگی۔ حماد نے پہلے کن اکھیوں سے دیکھا پھر ٹیبل بجا کر ہلکی آواز میں گانے لگا۔

یوں روٹھ نہ گوری مجھ سے
دل ٹوٹ گیا تو تجھ سے
جوڑا نہ جائے گا!

"اگر تم مجھے سنا رہے ہو، تو بیکار ہے۔" وہ اخبار رکھ کر بولی۔ "کیونکہ مجھے تم سے روٹھنے کا کوئی شوق نہیں۔"

"واقعی تم ناراض نہیں ہو!" حماد نے خوش ہو کر اپنی چیئر اس کی طرف گھما دی۔

"نہیں۔ میں کیوں ناراض ہوں گی تم سے، تمہارا میرا ایسا تو کوئی ناتا نہیں ہے۔" اس کی صاف گوئی پر حماد کے چہرے پر کھلتی مسکراہٹ یکلخت معدوم ہوگئی۔ پھر فوراً سنبھل کر بات بدل گیا۔

''خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ، آتے ہی اخبار میں کیا تلاش کرنے لگیں؟''

''رشتہ، لیکن افسوس آج میرے مطلب کا کوئی نہیں ہے۔ ورنہ اسی وقت خط لکھ کر پوسٹ کروا دیتی۔'' اس نے خاصی مایوسی کا اظہار کیا تو وہ اسی تعجب سے بولا۔

''کیا واقعی تم سنجیدہ ہو؟''

''ہاں اور میری شرط وہی ہے، یعنی کوئی الو کا۔''

''بس۔'' حماد نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ ''باس آ رہے ہیں پھر بات کریں گے۔''

اس نے گردن موڑ کر گلاس ڈور سے باہر دیکھا پھر جلدی سے دراز میں سے ڈسک نکال کر سیٹ کرنے لگی۔ اور جب باس اس کی ٹیبل کے پاس سے گزر رہے تھے۔ وہ مصروف ہو چکی تھی۔

پھر آف ٹائم میں آفس سے نکل کر وہ حماد کے ساتھ قریبی ریسٹورنٹ میں چلی آئی کیونکہ وہ اس کا مسئلہ سنجیدگی سے سننے اور ہر ممکن مدد کا وعدہ کر چکا تھا۔

''چائے کے ساتھ کیا لوگی؟'' وہ بیٹھتے ہی پوچھنے لگا۔

''سینڈوچ!'' اس نے وقت ضائع ہونے کے خیال سے کوئی تکلف نہیں کیا اور جیسے ہی حماد ویٹر کو آرڈر دے کر اس کی طرف متوجہ ہوا وہ اس کے پوچھنے سے پہلے خود ہی کہنے لگی۔

''میرے گھر میں صرف میں اور اماں ہیں۔ چار سال پہلے میرے والد کی ڈیتھ ہوئی تھی تو اس وقت میں نے سوچا تھا کہ میں اماں کا سہارا بنوں گی۔ اور میرا خیال ہے میں بڑی حد تک اماں اور گھر کو سہارا دینے میں کامیاب ہوگئی۔ اس دوران اماں نے بہت چاہا کہ میری شادی کر دیں لیکن میں منع کرتی رہی۔ کیونکہ میں اماں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی اور اماں کو غالباً یہ فکر تھی بلکہ ابھی بھی ہے کہ ان کے بعد میرا کیا ہوگا؟ اس خدشے کا اظہار انہوں نے بارہا میرے سامنے کیا اور مجھے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن میں کچھ سننے کو تیار نہیں ہوتی تھی اور شاید ابھی بھی مجھے احساس نہ ہوتا اگر جو پرسوں رات اماں کی طبیعت خراب نہ ہوئی ہوتی۔

پتا نہیں کیا ہوا تھا حماد! پرسوں رات گرمی کی شدت سے اچانک میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا اماں فرش پر بیہوش پڑی تھیں اور اس وقت میں اتنی خوفزدہ ہوئی یوں لگا جیسے اماں سچ مچ مجھے چھوڑ گئی ہیں اور میں بالکل اکیلی رہ گئی ہوں بس اس کے بعد گو کہ اماں کچھ دیر میں ہوش میں بھی آ گئی تھیں لیکن میرے اندر سے یہ خوف نہیں گیا خوانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو۔''

وہ خاموش ہو کر میز کی سطح کھرچنے لگی، اپنے تئیں خود کو نارمل پوز کر رہی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ اندرونی خوف کے باعث قدرے زردی مائل ہو رہا تھا۔ حماد نے فوراً کچھ کہنے کے بجائے ٹرے اس کے سامنے کھسکا دی۔

''لو چائے بناؤ۔'' اس نے پہلے سینڈوچ کی پلیٹ اس کے سامنے رکھی پھر چائے بنانے لگی تو حماد کی نظریں اس کے چہرے سے ہوتے ہوئے ہاتھوں پر ٹھہر گئیں پھر قدرے ہلکے پھلکے انداز میں کہنے لگا۔

''لڑکیاں تو بڑے خوبصورت آئیڈیل بناتی ہیں اور تم خود اچھی خاصی خوبصورت اسمارٹ لڑکی ہو، پھر وہ تمہاری ''احمق'' والی شرط میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آئی مین تمہیں ہینڈسم ساتھی مل سکتا ہے۔''

''ہینڈسم بندہ میری شرط تو نہیں مانے گا ناں۔'' وہ بڑی حد تک سنبھل کر مسکرائی۔

''کیا مطلب، تمہاری اور کیا شرط ہے؟'' وہ قدرے اُلجھ گیا۔

''میرے ساتھ رہنے کی۔''

''یعنی گھر داماد؟''

''ہاں، کیونکہ میں اماں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی اور نہ ہی انہیں جہیز میں اپنے ساتھ لے جا سکتی ہوں۔ اس لیے میں نے تم سے پہلی بات یہی کی تھی کہ کوئی الو کا پٹھا۔''

''خدا کے لیے۔'' وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''الو کا پٹھا کے بجائے احمق کہہ لو۔''

''ایک ہی بات ہے مطلب بھی ایک ہے اور تم کیوں چڑ رہے ہو، میں تمہیں تو نہیں کہہ رہی۔'' وہ اس کے ہاتھ جوڑنے کا نوٹس لیے بغیر اطمینان سے بولی۔

"اچھا فضول بکواس نہیں کرو، اور مجھے سوچنے دو۔" وہ اسے ٹوک کر چائے پینے میں لگ گیا۔ پھر کپ خالی کرتے ہی ویٹر کو بلا کر بل پے کیا اور فوراً کھڑا ہو گیا۔

"چلو۔"

"کہاں؟" وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ لیکن حماد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑے آرام سے باہر نکل گیا۔

وہ اس کی اس حرکت پر تلملاتے ہوئے باہر آئی اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بول پڑا۔

"میں نے وعدے کے مطابق تمہارا مسئلہ سنجیدگی سے سنا ہے۔ لیکن اس کا جو حل تم نے سوچا ہے وہ انتہائی نامناسب ہے لہٰذا پہلے تم خود سنجیدگی سے تمام پہلوؤں پر غور کرو، اس کے بعد مجھ سے بات کرنا۔"

"تم سے اب میں ساری زندگی بات نہیں کروں گی۔" وہ تڑخ کر بولی اور تیز تیز قدموں سے اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔

گھر میں داخل ہوئی تو اماں پڑوسن خالہ سے اسی کی بات کر رہی تھیں کہ وہ اپنے گھر کی ہو جائے تو انہیں اطمینان ہو جائے گا۔

"پتا نہیں کیسا اطمینان ملے گا؟ ایک وقت کی روٹی پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔" وہ اپنے آپ بڑبڑاتے ہوئے اندر چلی گئی۔

"اللہ دیکھ رہا ہے، وہ سب جانتا ہے کہ مجھے اماں کی اور اماں کو میری کتنی ضرورت ہے۔ کچھ نہیں ہوگا اماں کو اور میں بھی کہیں نہیں جاؤں گی۔" رات میں وہ خود کو اطمینان دلا کر سوئی تھی۔

اور انسان یہ تو جانتا ہے کہ اللہ سب دیکھ رہا ہے۔ سب جانتا ہے لیکن اس کی مصلحتیں نہیں جانتا اور جانے اس کی کیا مصلحت تھی کہ صبح جب اماں نماز کے لیے اٹھیں تو وضو کرتے ہوئے غسل خانے میں پھسل گئیں۔ ان کی پہلی چیخ پر ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ فوراً بستر چھوڑ کر بھاگی آئی۔ اماں کو اٹھانا بھی مسئلہ تھا۔ اتنی صبح کسے مدد کے لیے پکارے؟

"کچھ ہمت کریں اماں!" وہ ان کی دونوں بغلوں میں بازو ڈال کر بولی۔ لیکن

اماں کی ہائے ہائے میں اس کی آواز دب گئی۔ پتا نہیں کولہے کی ہڈی میں چوٹ آئی تھی یا اس سے کچھ زیادہ ہی جو اماں تڑپ رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے وہ انہیں گھسیٹ کر آنگن میں رکھی چارپائی پر لٹا پائی۔ اتنے میں ہی وہ خود پسینہ پسینہ ہو گئی تھی اور اماں کا تو برا حال تھا۔

"کیا ضرورت تھی آپ کو اندھیرے میں اُٹھنے کی۔" گو کہ اب اجالا پھیل رہا تھا لیکن آگے اسے جو اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ "اب بتائیے میں کیا کروں کہاں چوٹ لگی ہے؟"

اماں اپنی ہائے ہائے میں اس کی کوئی بات نہیں سن رہی تھیں تب وہ جا کر پڑوسن خالہ کو بلا لائی اور ان کی مدد سے پہلے اماں کو چارپائی سمیت اٹھا کر اندر لے گئی۔ پھر خالہ کے کہنے پر انہیں تیل ہلدی گرم کر کے دیا۔ اور خود جلدی جلدی ناشتا بنانے لگی اندر خالہ پتا نہیں اماں کے ساتھ کیا سلوک کر رہی تھیں؟ وہ ان کی چیخیں سن کر دہلتی رہی۔ اور کتنی بار اس کی آنکھوں میں آنسو آئے۔ لیکن چھلکنے سے پہلے اس نے آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

ہلدی تیل کی مالش سے غالباً اماں کو کچھ آرام ملا تھا جب ہی ان کی چیخیں بند ہو گئیں۔ تب وہ ناشتا ٹرے میں رکھ کر اندر لے آئی خالہ کو زبردستی ناشتے پر بٹھایا اور اماں کو اپنے ہاتھ سے کھلانے لگی۔

آفس جانا تو اب ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ناشتے کے بعد وہ کچھ دیر اماں کے پاس بیٹھی انہیں تسلیاں دیتی رہی پھر دوسرے کاموں میں لگ گئی اس دوران اس کا ذہن مسلسل یہی سوچتا رہا کہ اگر اماں جلدی ٹھیک نہ ہوئی تو بڑی مشکل ہو جائے گی ہو سکتا ہے اسے نوکری سے ہاتھ دھونے پڑیں پھر گھر کی گاڑی کیسے چلے گی اور آخر میں وہ حماد کو کوسنے دینے لگی جو اس کا مسئلہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھا تھا۔

"بڑا آیا میرے حل کو نامناسب قرار دینے والا۔ اس کے علاوہ اور کوئی حل ہو ہی نہیں سکتا۔ اب میں اس سے ہرگز نہیں کہوں گی خود ہی کوشش کروں گی۔ بہت سے لوگ ہیں جن کے پاس رہنے کا ٹھکانا نہیں ہوتا۔ کوئی بھی خوشی سے راضی ہو جائے گا تو اسے رہنے کو ٹھکانا مل جائے گا اور ہمیں دال روٹی کا آسرا۔" شام تک وہ ایسی ہی سوچوں میں خود کو بہلاتی رہی۔ اس کے باوجود اس کے چہرے پر حد درجہ مایوسی اور دل گرفتگی کے آثار تھے۔

اگلے تین دن خالہ صبح شام آ کر اماں کی مالش کرتی رہیں۔ جس سے ان کے درد میں تو کمی واقع ہوئی لیکن وہ خود کو حرکت نہیں دے پا رہی تھیں جس سے تشویش میں مبتلا ہو کر وہ ڈاکٹر کو بلانے کا سوچ رہی تھی کہ اسی وقت حماد آ گیا۔

"اندر نہیں بلاؤ گی؟" وہ دروازے کے دونوں پٹ تھامے اس کی آمد پر حیران ہو رہی تھی کہ اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں آؤ۔" وہ دروازہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئی۔

"کیا ابھی تک ناراض ہو؟" وہ اندر آ کر بولا۔

"میں کیوں ناراض ہوں گی تم سے؟"

"سوری۔ میں بھول گیا تھا کہ ہمارا ایسا تو کوئی ناتا نہیں۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ آفس کیوں نہیں آ رہیں؟" وہ اس کی بات دہرا کر موضوع بدل گیا۔

"اماں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"باتھ روم میں گر گئی تھیں۔"

"اوہو! زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟"

"اسی روز سے چار پائی پر پڑی ہیں۔ حرکت بھی نہیں کر سکتیں۔" وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔

"کم از کم مجھے فون تو کر دیتیں۔"

"تم کیا کرتے؟"

"کچھ نہیں۔ میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟" وہ چڑ گیا۔ "سب کچھ تو وہ کرے گا۔ وہ۔ وہ جو احمق یہاں آ کر رہے گا۔ ہٹو سامنے سے۔" وہ اسے ایک طرف دھکیل کر اندر اماں کے پاس چلا گیا۔

"ہونہہ!" وہ سر جھٹک کر کچن میں چلی آئی۔ یہ بھی خیال نہیں کیا کہ وہ پہلی بار آیا ہے۔ اسے اماں سے متعارف کرا دے۔ پتا نہیں اماں کیا سمجھیں؟ خاصے جلے بھنے انداز میں چولہے پر چائے کا پانی رکھ رہی تھی کہ وہ کچن میں جھانک کر بولا۔

"سنو مسز احمق! ابھی چائے مت بناؤ۔ میں ڈاکٹر کو لینے جا رہا ہوں۔"

"تم۔" اس نے چولہے سے کیتلی اٹھا کر اس کا نشانہ لیا لیکن وہ جا چکا تھا۔

پھر دس منٹ میں ہی وہ ڈاکٹر کو لے آیا تھا۔ اور اماں کے چیک اپ کے بعد اسے چھوڑنے گیا تو جو دوائیں اس نے لکھ کر دی تھیں، وہ بھی لیتا آیا اور پھر اماں کے قریب کرسی کھینچ کر آرام سے بیٹھ کر اس سے بولا۔

"اب تم چائے لا سکتی ہو۔"

"اماں! یہ آفس میں میرے ساتھ کام کرتے ہیں۔" اسے اب خیال آیا۔

"میں بتا چکا ہوں۔" وہ فوراً بول پڑا۔ "اور سن لو۔ میں چائے پیے بغیر جانے والا نہیں ہوں۔"

"کیوں نہیں بیٹا! اور صرف چائے ہی کیوں کھانا بھی کھا کر جانا۔"

اماں نے کہا تو وہ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ خاصا چڑانے والا انداز تھا۔ وہ پیر پٹختے ہوئے کمرے سے نکل آئی۔

پھر پہلے چائے بنا کر اسے اندر پہنچائی اس کے بعد کھانا پکانے میں لگ گئی تو درمیان میں اخلاقاً بھی اندر جھانک کر نہیں دیکھا۔ پتا نہیں اماں اس کے ساتھ کیا باتیں کر رہی تھیں؟ اس کے اندر کوئی تجسس نہیں تھا۔ جبھی آرام سے اپنے کام میں مصروف رہی۔

"کم از کم باس کو اپنی چھٹی کی درخواست تو دے دو۔" اس نے جاتے وقت اسے احساس دلایا تو وہ مایوسی سے بولی۔

"میرا خیال ہے اب میں جاب نہیں کر سکوں گی۔ کیونکہ اماں جلدی ٹھیک ہوتی نظر نہیں آ رہیں اور لمبی چھٹی باس دیں گے نہیں۔"

"تم کہہ کر تو دیکھو اور اس دوران میں کوشش کرتا ہوں، کوئی اچھا لڑکا گھر دامادی کی شرط پر۔"

"نہیں حماد!" وہ ٹوک کر بولی۔ "مجھے شادی نہیں کرنی۔"

"کیوں؟"

"بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کب؟" وہ اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے یونہی نیچے جھک گیا تھا۔

"ابھی۔ اور اب میں اپنا فیصلہ نہیں بدلوں گی۔" وہ آزردگیوں میں گھری بہت اپنی اپنی لگ رہی تھی۔ حماد حسن اس کے چہرے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے باہر نکل گیا۔

اگلے روز تائی جی آئیں تو اماں کی حالت پر پہلے باقاعدہ آنسو بہائے پھر مایوسی کا اظہار کر کے ایک طرح سے دل شکنی پر اتر آئیں۔

"بڑھاپے کی چوٹ ہے، یہ اب ٹھیک ہونے والی نہیں۔ چلنے پھرنے سے تو اب اپنے آپ کو معذور ہی سمجھو۔ ہائے بیٹی پرایا دھن کب تک ساتھ دے گی؟"

"میں کوئی پرایا دھن نہیں ہوں۔" وہ بول پڑی۔ "مجھے اماں کے پاس رہنا ہے۔"

"سارا دن تو ابھی بھی ان کے پاس نہیں رہتی ہو گی تم۔ آخر نوکری کرتی ہو۔" تائی جی نے بظاہر ملائمت سے کہا تو وہ اندر ہی اندر سلگ کر بولی۔

"نوکری چھوڑ دی میں نے۔"

"ہائیں۔ نوکری چھوڑ دی۔ اب گزارا کیسے ہو گا؟ ارے مجھے تو پہلے ہی تم ماں بیٹی کی اتنی فکر رہتی ہے۔ کسی مرد کا سہارا نہیں۔ اوپر سے نوکری چھوڑ کر تو تم بالکل ہی بے آسرا ہو گئی ہو۔ چلو میرے ساتھ اب میں تم دونوں کو یہاں نہیں رہنے دوں گی۔"

"اللہ کا سہارا سب سے بڑا ہے تائی جی! آپ کو ہماری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ کہتے ہوئے ان کے پاس سے ہٹ گئی۔

شام میں حماد آیا تو وہ اسے اماں کے پاس چھوڑ کر آنگن میں آ بیٹھی۔ اس وقت کرنے کو کچھ نہیں تھا اور حماد کے لیے چائے بنانے کو اس کا دل نہیں چاہا یا شاید گرمی کی وجہ سے کچن میں جانا نہیں چاہ رہی تھی۔ اور کافی دیر اماں کے پاس بیٹھ کر جب وہ باہر آیا تو اسے آرام سے بیٹھے دیکھ کر تپ کر بولا۔

"بڑی بے مروت ہو چائے نہ سہی ایک گلاس پانی ہی پوچھ لیتیں۔"

"تمہیں اگر پیاس لگی تھی تو مانگ لیتے۔" وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوئی۔

"پیاس تو لگی ہے۔" وہ اس کے سامنے دوسری چار پائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"جب حلق میں کانٹے چبھنے لگیں تو بتانا۔"

"صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا۔" وہ چڑ کر بولا۔

"عقلمند آدمی ہو۔ جلدی سمجھ گئے۔"

اس کے اتنے آرام سے کہنے پر وہ اُچھل پڑا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"وہی جو تم سمجھے۔ یعنی تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے۔" وہ ایک دم بہت سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔ "اس گھر میں کوئی مرد نہیں ہے حماد اور میں نہیں چاہتی کہ تمہارے آنے سے محلے والوں کو ہم پر انگلیاں اٹھانے کا موقع ملے۔ میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکتی ہوں، لیکن رسوائی برداشت نہیں کر سکتی۔ اب یہ مت کہنا کہ لوگوں کو باتیں بنانے کی عادت ہوتی ہے۔ ہم بھی تو کسی کی زبان نہیں پکڑ سکتے۔"

وہ بہت خاموشی سے اسے دیکھنے لگا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئی تو وہ قدرے پر سوچ انداز میں کہنے لگا۔

"گویا تم اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ اس معاشرے میں عورت اکیلی نہیں رہ سکتی۔ پھر تم نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یا شاید وہ کوئی جواب سوچنے لگی تھی۔

"ابھی تمہاری اماں بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ تم سمجھنے کے باوجود حقائق سے نظریں چرا رہی ہو۔ بہت فکر مند ہیں وہ تمہارے لیے اور ہاں تمہارے کسی تایا زاد کا ذکر کر رہی تھیں۔ تم کیوں شادی نہیں کرنا چاہتیں اس سے؟"

وہ گھما پھرا کر جیسے ہی اصل موضوع پر آیا وہ چیخ کر بولی۔

"نام مت لینا اس کا میرے سامنے۔"

"کیوں کیا بہت احمق ہے؟"

"نہیں۔ حد سے زیادہ ہوشیار اور لالچی میں نے خود اپنے کانوں سے سنی تھیں تائی جی اور اس کی باتیں اور اماں کو بتا بھی چکی ہوں پھر بھی۔"

وہ تنفر سے بولتے ہوئے ایک دم خاموش ہو گئی تو قدرے توقف سے وہ پوچھنے لگا۔

"کیا لالچ ہے انہیں؟"

"اس گھر کا کہ مجھ سے شادی کر کے وہ اس گھر کے مالک ہو جائیں گے۔ یہی

کہہ رہی تھیں تائی جی اپنے صاحبزادے سے کہ اور تو کوئی وارث ہے نہیں اور اماں کتنے دن...... یہ سننے کے بعد بھی کیا میں اس سے شادی کرسکتی ہوں۔ ہرگز نہیں۔ ایسے بدنیت لوگوں سے میں کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔ پھر بھی چلی آتی ہیں بڑھنیا۔ ہونہہ۔''

''یہ تو بڑی پرابلم ہوگئی۔ یعنی اس وقت اگر میں تمہیں پروپوز کروں تو تم یہی سمجھوگی کہ میں۔''

وہ جیسے اپنے آپ سے بولتے ہوئے مایوسی سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ وہ چونک کر دیکھنے لگی تھی۔

''نہیں بھئی، میں نہ تو تمہاری زبان میں خود کو الو کا پٹھا کہلوا سکتا ہوں اور نہ ہی لالچی، بدنیت۔ میں خدا کے بعد اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرتا ہوں۔''

وہ اسے دیکھ کر بولا پھر فوراً کھڑا ہوگیا۔ ''اوکے چلتا ہوں۔''

''سنو۔'' اس نے ایک دم پکارلیا اور اس کے پلٹ کر دیکھنے پر پوچھنے لگی۔ ''کیا واقعی تم مجھے پروپوز کررہے ہو؟''

''کرسکتا ہوں، بشرطیکہ تم میری بات مان لو۔'' وہ دونوں بازو سینے پر باندھ کر بولا۔

''کیا بات؟'' وہ سوالیہ نشان بن گئی۔

''کہ شادی کے بعد تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا میرے گھر میں۔''

اس نے کہا تو وہ سر جھکا کر بولی۔

''میں اماں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔''

''میں نے انہیں چھوڑنے کی کوئی شرط نہیں رکھی۔ وہ بھی ہمارے ساتھ رہیں گی۔ اس گھر کو کرائے پر اٹھا دینا یا جیسا تم چاہو۔ یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ اگر تمہیں منظور ہو تو مجھے آفس فون کرکے بتا دینا۔''

وہ اپنی بات کہہ کر فوراً پلٹ کر جانے لگا کہ اس نے پھر پکارلیا۔

''سنو۔ چائے نہیں پیوگے؟''

حماد کے ہونٹوں پر دھیرے دھیرے مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ کل آزردگیوں میں گھری وہ اپنی اپنی لگی تھی تو اب جھکی پلکوں کے ساتھ دل میں اُترتی جارہی تھی۔

چاہت کے سب رنگ نرالے

میرا ذہن بالکل کام نہیں کررہا تھا بس خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ پتا نہیں اتنی خاموشی کیوں تھی۔ کہیں کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں نے دروازے کی سمت دیکھا تو چونک گئی اس کے ساتھ ہی میرا ذہن جیسے اچانک بیدار ہوگیا۔

''یہ میرا کمرہ تو نہیں ہے اور...... اور...... اُف میں کہاں آگئی ہوں؟'' میں ایک دم پریشان ہوکر پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

کہیں وہ منحوس عورت اپنے مقصد میں کامیاب تو نہیں ہوگئی لیکن میں تو وہاں سے بھاگ آئی تھی میں نے ذہن پر زور دیا تو یاد آیا۔ میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور شاید میں بے ہوش ہوگئی تھی اس کے بعد، ہاں اس کے بعد اب ہوش میں آئی تھی۔ میرا ہاتھ بے اختیار اپنے سر پر گیا۔ اور پھر میں نے اپنے جسم کے ایک ایک حصے کو چھو کر دیکھا۔ نہ کہیں بینڈیج تھی نہ کوئی تکلیف۔ میں نے شکر کیا اور اپنے ہوش میں آنے کی اطلاع دینے کے لیے یونہی کسی کو پکارنا چاہتی تھی کہ اچانک خیال آیا۔ پتا نہیں میں کہاں ہوں، کس کے گھر میں ہوں، کہیں غلط لوگوں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئی؟ اس خیال سے میرا دل بڑی زور زور سے دھڑکنے لگا اور بے حد خوفزدہ ہوکر میں کمرے کی آرائش کو دیکھتے ہوئے یہاں کے مکینوں کے بارے میں قیاس کرنے لگی تھی کہ کمرے سے باہر قدموں اور باتوں کی ملی جلی آواز سن کر جلدی سے آنکھیں بند کرکے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ یوں جیسے ابھی تک مجھے ہوش ہی نہیں آیا۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھلنے کے ساتھ کسی عورت کی آواز سنائی دی۔

"دیکھو، یہ لڑکی ہے۔"

"تو ماما! آپ اسے یہاں کیوں لے آئیں؟" مردانہ آواز میں خاصی بیزاری تھی۔

"پھر کہاں لے جاتی؟"

"کسی ہاسپٹل میں چھوڑ دیتیں۔"

"ایسے ہی لاوارثوں کی طرح چھوڑ دیتی۔ جب تک اسے ہوش نہیں آجاتا اور یہ اپنے گھر کا اتا پتا نہیں بتا دیتی یہ میری ذمہ داری ہے کیونکہ میری گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔" خاتون کا لہجہ تنبیہی اور حتمی تھا۔

"ایکسیڈنٹ کے کوئی آثار تو نظر نہیں آرہے۔" وہ غالباً میرا جائزہ لے رہا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے، اس نے بچا لیا ورنہ بچی بیچاری تو؟"

"بچی بیچاری ہوش میں کب آئے گی؟" اسے پتا نہیں کیا تکلیف تھی خوامخواہ چڑ رہا تھا۔

"ڈاکٹر تو کہہ رہا تھا گھنٹے بھر میں ہوش میں آجائے گی۔" خاتون نے اسے بتایا پھر میری پیشانی پر ہاتھ رکھا تو میں نے بڑی مشکل سے خود کو کسی بھی حرکت سے باز رکھا۔

"تو ابھی ایک گھنٹہ نہیں ہوا؟"

"تم کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہو؟" خاتون نے جیسے عاجز آکر اُسے ٹوکا تو وہ جھنجلا کر بولا۔

"پریشانی کی بات ہے ماما! یوں راہ چلتی لڑکی کو آپ اٹھا کر لے آئی ہیں۔ پتا نہیں کون ہے آج کل کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ روزانہ اخبار میں آپ ایسے واقعات پڑھتی ہیں پھر بھی سمجھ نہیں پا رہیں۔ مجھے تو صاف لگ رہا ہے کہ یہ باقاعدہ پلان کے تحت اس گھر میں داخل ہوئی ہے۔"

"اُف۔" میں اندر ہی اندر تلملا گئی۔

"کیا فضول بات کرتے ہو، یہ کہاں سے داخل ہوئی، میں لے کر آئی ہوں اسے، بے ہوشی کے عالم میں۔"

"یہی ان کا پلان ہوتا ہے ماما! پہلے ساری معلومات حاصل کر لیتی ہیں۔ اس کے بعد جان بوجھ کر گاڑی کے سامنے آتی ہیں تاکہ آپ جیسی رحمدل خواتین انہیں اُٹھا کر گھر لے جائیں پھر یہ آسانی سے اپنا کام کر سکتی ہیں۔"

"بس کرو بیٹا! اتنی معصوم صورت لڑکی کو تم۔"

"آپ کو نہیں پتا ماما! ایسی معصوم صورت لڑکیاں کیسے خطرناک گروہ سے تعلق رکھتی ہیں، میری مانیں فوراً پولیس کو اطلاع دیں۔" وہ زچ ہو کر بول رہا تھا۔

"ہرگز نہیں، تم جاؤ اپنے کمرے میں۔" خاتون کے لہجے میں تحکم تھا تب ہی کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی پھر جیسے وہ جاتے جاتے بولا تھا۔

"آپ غلط کر رہی ہیں ماما!" خاتون کچھ نہیں بولیں اور قدرے توقف سے انہوں نے تین چار بار میرا چہرہ تھپکا پھر مجھے چادر اڑھاتے ہوئے اپنے آپ بڑبڑانے لگیں۔

"دماغ خراب ہے اس لڑکے کا۔ اتنی پیاری معصوم سی لڑکی کو میں پولیس کے حوالے کر دوں ہونہہ۔"

میرے اندر ڈھیروں اطمینان اُتر آیا اور دل چاہا ذرا سی آنکھیں کھول کر اس رحم دل نیک خاتون کو دیکھوں لیکن میں نے اپنی خواہش کو دبا لیا اور ان کے جانے کے بعد ہی آنکھیں کھولی تھیں۔

"تھینکس گاڈ!" میں نے گہری سانس کھینچتے ہوئے شکر کیا کہ میں کسی غلط جگہ نہیں آئی۔ اب اطمینان سے سو سکتی ہوں اور پھر میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن ایک تو بھوک دوسرے پریشان کن سوچوں نے نیند اُڑا دی تھی کہ یہ رات تو جیسے تیسے گزر جائے گی، صبح کیا ہوگا؟ کہاں جاؤں گی میں؟

یہ سب تو مجھے گھر سے نکلنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا لیکن موقع ہی کہاں ملا۔ میں تو ایسی بدحواس ہوئی کہ اور اب ڈیڈی کے آنے سے پہلے واپس بھی نہیں جاسکتی۔ کاش اس وقت میرے حواس قائم رہتے تو میں آنٹی پر ظاہر بھی نہ ہونے دیتی کہ میں ان کی باتیں سن چکی ہوں اور اطمینان سے گھر بیٹھ کر اس صورتِ حال سے نمٹنے کا حل سوچتی اور اب تو آنٹی ہوشیار ہوگئی ہوں گی، میں اگر واپس گئی تو۔ اس سے آگے کا تصور ہی خوفناک تھا۔

"نہیں، میں واپس نہیں جاؤں گی۔" میں نے بہت سوچ کر فیصلہ کیا کہ مجھے گھر کے علاوہ اور بھی کہیں نہیں جانا، یہیں رہنا ہے۔ ایک ہفتے کی تو بات ہے۔ ڈیڈی آ جائیں گے پھر میں چلی جاؤں گی، اور پھر میں اپنے یہاں قیام کو ممکن بنانے کا سوچتے سوچتے سو گئی تھی۔

صبح خاتون کی آواز پر میری آنکھ کھلی وہ مجھ پر جھکی بیٹی بیٹی پکار رہی تھیں اور مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر ان کا چہرہ چمکنے لگا۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو کہنے لگیں۔

"ڈرو نہیں، یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ اُٹھو منہ ہاتھ دھو لو پھر ناشتا کریں گے۔"

اور میں رات سے بھوکی تھی، پھر بھی فوراً تو نہیں آہستہ آہستہ اُٹھ کر بیٹھ گئی اور بہت خاموش نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، رات اپنے یہاں قیام کا یہی طریقہ میری سمجھ میں آیا تھا کہ مجھے اسی طرح پوز کرنا ہے جیسے میری یادداشت کے ساتھ میری قوت گویائی بھی متاثر ہوئی ہے۔ کیوں کہ میں اپنے بارے میں کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔ صرف اس شخص کی وجہ سے جو رات میرے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کر رہا تھا کہ میں کسی گروہ سے تعلق رکھتی ہوں گی، اور مجھے خدشہ تھا کہ اگر میں نے سچ بول دیا تو وہ تصدیق کرنے آنٹی کے پاس پہنچ جائے گا اور آنٹی بہت چالاک عورت تھیں۔ اس کے سامنے خود کو میری سب سے بڑی ہمدرد ثابت کر کے مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتی تھیں۔ بہر حال میں منہ ہاتھ دھو کر واش روم سے نکلی تو وہ خاتون مجھے اپنے ساتھ ڈائننگ روم میں لے آئیں جہاں پہلے سے موجود شخص نے مجھے دیکھتے ہی چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آ گئیں ہوش میں؟"

"شہروز! مجھے تمہارا یہ انداز بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔"

خاتون نے فوراً اسے تنبیہہ کی پھر مجھے بٹھانے کے بعد خود بیٹھیں تو کہنے لگیں۔

"یہ ہوش میں تو آ گئی ہے، لیکن بول نہیں رہی۔"

"بولے گی بھی نہیں۔" اس نے اتنے یقین سے کہا کہ میں حیران رہ گئی، جبکہ خاتون نے سادگی سے پوچھا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ انہیں بولنے کی اجازت نہیں ہوتی، کہیں غلطی سے منہ سے سچ نہ نکل جائے حالانکہ اس سے سچ اگلوانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ ہم اس چکر میں نہ پڑیں اور آپ فوراً اسے چھوڑ آئیں۔"

"کہاں، کہاں چھوڑ آئیں؟"

"کہیں بھی اس سے کہیں، خود ہی چلی جائے۔ میں شام میں آ کر اسے دیکھنا نہیں چاہتا۔"

وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا تو میں نے کن اکھیوں سے اسے جاتے ہوئے دیکھا پھر سر جھکا لیا۔ تو خاتون فوراً میری طرف متوجہ ہو کر بولیں۔

"ارے، تم ابھی تک ایسے بیٹھی ہو، ناشتا کرو ناں۔" پھر خود ہی سلائس پر جام لگا کر میرے ہاتھ میں تھمایا اور کھانے پر اصرار کرنے لگیں۔

پھر سارا دن وقفے وقفے سے وہ کبھی میرا نام پوچھتیں، کبھی گھر کے بارے میں اور اپنے طور پر مجھے یاد دلانے کی کوشش کرتی رہیں کہ میرا ان کی کار کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور میں اندر ہی اندر محظوظ ہوتی رہی اچھی خاتون تھیں البتہ ان کا بیٹا۔ اُف اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے اٹھا کر باہر پھینک دے وہ صبح شام اپنی ماں کو خوفزدہ کرنے کے لیے میرے بارے میں ایسی باتیں کرتا کہ کتنی بار میرا دل چاہا چیخ کر اسے خاموش کرا دوں۔

اس وقت وہ انہیں چائے بنانے بھیج کر پہلی بار براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا۔ خاصا جارحانہ انداز تھا۔

"سنو لڑکی! تم نے ماما کو بہت بے وقوف بنا لیا۔ اب سیدھی طرح بتا دو کہ تم کون ہو اور کس مقصد کے تحت یہاں آئی ہو؟" میں نے بے بسی سے دیکھا تو دانت پیس کر بولا۔

"خبردار، میرے سامنے ایکٹنگ کی تو، ابھی پولیس کے حوالے کر دوں گا اور تم جانتی ہو، پولیس والے کیا حشر کرتے ہیں۔ تمہارے جرائم تو وہ اگلوا ہی لیں گے اس کے

علاوہ دوسرے مجرموں کے جرائم بھی تمہارے کھاتے میں ڈال دیں گے سمجھیں تم!''

اور میں سمجھ کر بھی انجان بن گئی کہ چار دن تو گزر ہی چکے تھے باقی دو دن بھی گزر جائیں گے۔

''دیکھو۔'' اس نے اچانک پینترا بدلا اور نرمی سے گویا ہوا۔

''میں تمہاری مدد کر سکتا ہو یعنی اگر تم کسی مجبوری کے تحت جرائم پیشہ گروہ میں شامل ہوگئی ہو اور نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تو مجھے بتاؤ۔ ہوسکتا ہے میں تمہیں کوئی راستہ بتا سکوں۔ مجھ پر اعتماد کرو، میں تمہاری مدد کروں گا۔''

میں چپ چاپ دیکھتی رہی پھر اسی طرح سر جھکا لیا تو غالباً وہ مجھے بتانے پر آمادہ سمجھ کر بولا۔

''ہاں شاباش، بتاؤ، کون لوگ ہیں وہ جنہوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے؟''

میں اندر ہی اندر پریشان ہوگئی۔ عجیب آدمی تھا ایک ہی بات کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور کیوں نہیں سوچتا؟

''میں نے کہا ناں، مجھ پر اعتماد کرو، میں بہت خاموشی سے یہ معاملہ یہیں نمٹا دوں گا اور تمہارا نام بھی نہیں آئے گا۔''

''تھوڑا بھی نہیں، پورا کا پورا خبطی ہے۔'' میں نے سوچا اور اُٹھنے لگی تھی کہ اس کی ماما چائے لے کر آ گئیں جنہیں دیکھ کر وہ سیدھا ہو بیٹھا۔

''لو بیٹی! چائے پیو۔'' ماما نے چائے کا کپ مجھے تھمایا پھر اس سے کہنے لگیں۔

''میں نے آج ڈاکٹر ہمدانی کو فون کیا تھا۔ اس بچی کے بارے میں بتایا تو کہنے لگے چیک اپ کے بعد ہی کچھ کہہ سکیں گے، کل میں اسے لے جاؤں گی ان کے پاس۔''

''آپ خواہ مخواہ اسے اہمیت دے رہی ہیں ماما! آپ دیکھ لیجیے گا ڈاکٹر ہمدانی بھی کچھ نہیں کر سکیں گے۔''

''تم سے کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ پتا نہیں کیا بگاڑ لیا ہے اس نے تمہارا۔''

ماما ناراض ہونے لگیں تو وہ اٹھ کر چلا گیا اور میرا دل چاہا میں اچانک کچھ بول کر اس خاتون کو حیران کر دوں اور میں ایسا کرنے جا رہی تھی کہ ادھر سے اس نے انہیں

پکار لیا۔

پھر رات میں جب میں سونے کے لیے لیٹی تو اچانک خیال آیا کہ خاتون صبح مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی بات کر رہی تھیں اور یہ میرے لیے کوئی ایسی پریشانی کی بات تو نہیں تھی لیکن مناسب بھی نہیں لگ رہا تھا کہ ایک تو میں ایسے ہی زبردستی کی مہمان بنی ہوئی تھی اس پر مزید خرچ گویا انہیں کسی طرح روکنا ہوگا اس کے بعد میرا دھیان اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ میری گمشدگی سے آنٹی کس قدر پریشا ہوں گی میں بخوبی اندازہ کر سکتی تھی، اور ان کی پریشانی میرے لیے نہیں بلکہ اس بات سے تھی کہ ڈیڈی کو کیا جواب دیں گی؟

''ہوسکتا ہے، ڈیڈی آ گئے ہوں ایک ہفتے کا کہہ کر گئے تھے ہمیشہ کی طرح اور اکثر ان کی واپسی پہلے بھی ہو جاتی تھی۔'' اس نہج پر سوچتے ہوئے میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''مجھے معلوم تو کرنا چاہیے ورنہ ڈیڈی کے لیے میری گمشدگی ایک شاک ہوگی مزید یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آنٹی اپنا دامن صاف رکھنے کے لیے میرے بارے میں کوئی ایسی کہانی سنا دیں جو ڈیڈی کے لیے۔''

''اُف نہیں۔'' میں اس تصور سے کانپ گئی اور اسی وقت گھر جانے کے بارے میں سوچنے لگی، گھڑی کی طرف دیکھا۔ ایک بج رہا تھا اور کراچی شہر میں تو اس وقت رات کی ابتدا ہوتی ہے۔ یعنی باہر نکل کر میں کوئی رکشہ وغیرہ لے سکتی تھی۔ میں بیڈ سے اتر کر دروازے تک آئی اور ذرا سا کھول کر دیکھا لاؤنج میں مدھم روشنی کے علاوہ باقی تمام لائٹس آف تھیں، یوں بھی گزشتہ چار دنوں سے میں دیکھ رہی تھی کہ گیارہ بجے ماں بیٹا سو جاتے تے اس لیے میں اطمینان سے کمرے سے نکل آئی۔ میرا ارادہ سیدھا باہر نکل جانے کا تھا لیکن لابی سے گزرتے ہوئے ٹیلی فون پر نظر پڑی تو سوچا پہلے گھر فون کر کے ڈیڈی کا معلوم کر لینا چاہیے۔ اگر وہ نہیں آئے ہوں گے تب تو جانا میرے لیے اور بھی خطرناک ہوگا۔ میں نے جلدی جلدی نمبر ڈائل کر کے ریسیور کان سے لگا لیا اور دعا کرنے لگی کہ دوسری طرف آنٹی نہ ہوں۔ کچھ دیر بعد جب شرفو کی آواز سنائی دی، تب اطمینان ہوا میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''سنو شرفو! یہ میں ہوں ثوبیہ، جلدی سے بتاؤ ڈیڈی آ گئے؟''

''نہیں آئے۔''

''اچھا دیکھو، یہ ایک نمبر لکھو اور جیسے ہی ڈیڈی آئیں، انہیں یہ نمبر دے کر کہنا مجھ سے یہاں بات کریں۔''

''ہاں، میں ٹھیک ہوں، بس تم احتیاط کرنا، خبردار، میرے فون کا کسی کو پتا نہ چلے۔ چلو جلدی سے نمبر لکھو۔''

میں نے اسے نمبر لکھوا کر فون بند کر دیا تو میرا دل بہت زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سینے پر ہاتھ رکھ میں جیسے ہی پلٹی، میری چیخ نکل گئی۔ چند قدم کے فاصلے پر وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے جیسے میرے فارغ ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں چیخی تو اس نے فوراً بڑھ کر اپنے مضبوط ہاتھ سے میرا منہ بند کر دیا۔ پھر کھینچتا ہوا کمرے میں لا کر چھوڑا اور چبا کر بولا۔

''ہاں تو مس ثوبیہ! میرے کچھ پوچھنے سے پہلے سب بتا دیں ورنہ۔''

اور اب کچھ چھپانا فضول تھا اور اسے اپنے حالات بتانا بھی ضروری نہیں تھا۔ اس لیے میں اپنے حواس درست کرنے کے بعد سنبھل کر بولی۔

''آپ نے مجھے غلط سمجھا۔ میرا تعلق کسی گروہ سے نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی غلط ارادے سے یہاں آئی ہوں بلکہ میں خود تو آئی ہی نہیں، آپ کی مام لے کر آئی ہیں مجھے۔''

''ماما تمہیں ہمیشہ اپنے پاس رکھنے کے لیے تو نہیں لائی تھیں، انہوں نے تمہیں زخمی سمجھا اور یہ کہ جب تم ہوش میں آ کر اپنے گھر کا اتا پتا بتاؤ گی تو وہ تمہیں چھوڑ بھی آئیں گی پھر تم نے یہ ناٹک رچا کر اپنے یہاں قیام کو طول کیوں دیا؟''

اس کا چبھتا ہوا مشکوک لہجہ مجھے سخت ناگوار گزرا۔ اندر ہی اندر جز بز ہو کر بولی۔

''یہ میری مجبوری تھی۔ مجھے کچھ دنوں کے لیے پناہ چاہیے تھی، جب میں نے دیکھا کہ ماما اچھی خاتون ہیں اور میں یہاں محفوظ رہ سکتی ہوں تو مجھے اپنے یہاں قیام کا یہی طریقہ سمجھ میں آیا۔''

''جھوٹ مت بولو۔ تمہارے ساتھ اگر کوئی مجبوری تھی تو تم ماما کو بتا سکتی تھیں۔ اور وہ تمہاری بات کا فوراً یقین بھی کر لیتیں۔ خود تم نے ابھی اعتراف کیا ہے کہ وہ اچھی خاتون ہیں۔''

''ہاں، وہ اچھی خاتون ہیں اور میں انہیں بتا ہی دیتی لیکن آپ کی وجہ سے خاموش رہی۔''

''میری وجہ سے۔''

''جی، مجھے دیکھتے ہی آپ نے جو قیاس آرائیاں شروع کر دی تھیں کہ میں یہ ہو سکتی ہوں اور وہ ہو سکتی ہوں۔ اسی لیے مجھے احتیاط کرنی پڑی کہ آپ میری کسی بات کا یقین کریں گے نہیں اور میری انکوائری کرنے پہنچ جائیں گے، جس سے میرے لیے اور مشکلات کھڑی ہو سکتی تھیں۔''

میں نے کہا تو وہ کچھ دیر مجھ پر نظریں جمائے رکھنے کے بعد بولا۔

''یقین تو میں اب بھی تمہاری کسی بات کا نہیں کر رہا اور انکوائری بھی ضرور کروں گا۔ جلدی بتاؤ ابھی کسے فون کر رہی تھیں؟''

''اور اگر میں نہ بتاؤں تو۔'' اس کی حد درجہ بدگمانی پر میں سلگ گئی۔

''تو میں اسی وقت تمہیں پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا۔''

''چلیں، میں تیار ہوں۔'' اس کی دھمکی سے مرعوب ہونے کی بجائے میں سچ مچ چلنے کو تیار ہو گئی کہ ہو سکتا ہے وہ چکرایا ہو...... لیکن مجھ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور چند لمحے رُک کر کمرے سے نکل گیا۔

''بڑا آیا انکوائری کرنے والا۔'' میں بڑبڑاتی ہوئی گرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھی تھی کہ وہ اپنے ساتھ ماما کو لے کر آ گیا اور میری طرف اشارہ کرتا ہوا بولا۔

''ماما! یہ لڑکی خود پولیس اسٹیشن جانے کو تیار ہے پوچھ لیں اس سے۔''

خاتون کیونکہ نیند سے اُٹھا کر لائی گئی تھیں، اس لیے ناسمجھی کے عالم میں باری باری ہم دونوں کو دیکھنے لگیں، جبکہ چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کتنی پریشان ہو گئی ہیں تب میں نے اُٹھ کر انہیں تھام لیا اور آرام سے بٹھانے کے بعد بولی۔

''میں نے اتنے دن ناحق آپ کو پریشان کیا۔ اس کے لیے میں معذرت چاہوں گی اور اب آپ مجھے اجازت دیجیے۔''

''تو......تو کیا تمہیں یاد آ گیا؟ اپنا گھر، اپنا نام اور۔''

حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساس سے مغلوب ہو کر انہوں نے میرا ہاتھ تھام کر پوچھا تو میں نظریں چرا کر بولی۔

''مجھے سب یاد تھا آنٹی! کچھ نہیں بھولی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے شہروز کے شبہات۔''

''سب غلط ہیں!'' میں فوراً بولی اور جانے کیسے اس عورت کے سامنے بکھر گئی۔

''آپ مجھے غلط نہیں سمجھیں آنٹی! میں ایک شریف، عزت دار باپ کی بیٹی ہوں، میری ماں نہیں ہے اور ابھی چند سال پہلے میرے والد نے جس عورت سے شادی کی اس کی وجہ سے مجھے گھر چھوڑنا پڑا۔ وہ بہت چالاک عورت ہے، ڈیڈی پر پورا کنٹرول حاصل کر چکی ہے، بس ایک میرے معاملے میں ڈیڈی اس کی کوئی بات نہیں سنتے۔ جس سے وہ میرے خلاف اپنے دل میں بہت بغض رکھتی ہے لیکن کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتی بلکہ ڈیڈی کے سامنے تو وہ ان سے بھی زیادہ میرا خیال رکھتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے آنٹی کہ مجھے کبھی اس پر شبہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے برعکس کبھی کبھی مجھے اس پر رحم آتا۔ خصوصاً اس وقت جب وہ میرے بارے میں ڈیڈی کو مشورہ دیتی اور وہ فوراً ریجیکٹ کر کے کہتے کہ تمہیں میری بیٹی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شاید انہوں نے شروع میں ہی سمجھ لیا تھا کہ وہ میرے ساتھ فیئر نہیں ہے اور میں نے اب سمجھا۔ اس کے باوجود میں اس سے خائف ہونے والی نہیں تھی۔ اگر مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع ملتا تو شاید میں اپنا دفاع کر لیتی لیکن میں ایک دم پریشان ہو کر گھر سے نکل آئی تھی۔''

''کس بات سے؟ کس بات سے پریشان ہوئیں تم؟'' خاتون نے ٹوکا تو مجھے اصل بات بتانی پڑی۔

''اصل میں میرے ڈیڈی بزنس کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے ہیں اور ان کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس نے اپنے کسی کزن کو بلا لیا تھا جس کے ساتھ میری

شادی کر کے وہ ڈیڈی کے آنے سے پہلے ہی مجھے اس کے ساتھ رخصت کر دینا چاہتی تھی جس وقت وہ دونوں یہ پلان بنا رہے تھے اتفاق سے اسی وقت میں کسی کام سے ان کے کمرے میں جا رہی تھی اور ان کی باتیں سن کر میں اتنی پریشان ہوئی کہ واپس پلٹ کر اپنے کمرے میں بھی نہیں گئی بس وہیں سے باہر نکل کر بھاگنا شروع کر دیا اور جانے کہاں آپ کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔''

میں خاموش ہوئی تھی کہ عقب سے وہ تالی بجا کر بولا۔

''واہ! کیا کہانی گھڑی ہے۔ ماما یقیناً متاثر ہوئی ہیں۔''

''شہروز!'' ان کے گھورنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا میرے سامنے آ کر بولا۔

''بس یا اور کچھ؟''

''جو حقیقت تھی میں نے بتا دی۔ اب آپ چاہیں تو مجھے پولیس اسٹیشن لے جا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا تو اس سے پہلے ماما بول پڑیں۔

''اس کی باتوں پر دھیان مت دو بیٹی! مجھے بتاؤ تمہارے ڈیڈی واپس کب آئیں گے؟''

''میں نے ابھی یہ معلوم کرنے کے لیے گھر فون کیا تھا ابھی تک تو نہیں آئے ایک دو دن میں آ جائیں گے۔''

''بس تو تم آرام سے رہو۔ جب تمہارے ڈیڈی آ جائیں گے تب میں خود تمہیں چھوڑ آؤں گی۔'' پھر میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ اُٹھاتی ہوئی بولیں۔ ''پریشان مت ہونا۔ دو دن ہوں یا دو ہفتے اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔''

''شکریہ آنٹی! مجھے یقین ہے ڈیڈی جلد ہی آ جائیں گے۔'' میں اس کی تیز چبھتی ہوئی نظروں سے بچنے کی خاطر خاتون سے پہلے کمرے سے نکل آئی غالباً اس نے انہیں روک لیا تھا۔

اور اگلے دو دن میں واقعی بہت آرام سے رہی۔ شاید خاتون نے اسے سمجھایا تھا یا سخت تنبیہہ کی تھی جو وہ ایک دم خاموش ہو گیا تھا۔ جب ہی میں آرام سے رہی۔ تیسرے دن صبح ناشتے کے بعد ہی میں نے خاتون سے اجازت لے کر گھر فون کیا اور شرفو سے

ڈیڈی کی آمد کا سنتے ہی میں وہیں سے چلاتے ہوئے آئی۔

''آنٹی! ڈیڈی آگئے ہیں میں ابھی گھر جاؤں گی۔''

پھر اسے دیکھ کر ایک دم خاموش ہوگئی تو خاتون مسکرا کر بولیں۔

''ہاں ہاں چلتے ہیں۔ چلو شہروز! تم آفس جا ہی رہے ہو ہمیں ثوبیہ کے گھر چھوڑ دینا۔''

اس نے بڑی سعادت مندی دکھائی اور تمام راستہ آنٹی مجھے دھیرج سے سمجھاتی رہیں کہ مجھے جاتے ہی ڈیڈی کے سامنے ان کی بیوی کا سازش کا ذکر نہیں کرنا یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اس سے ڈیڈی کی گھریلو زندگی متاثر ہوگی اور میں نے ان کی بات سمجھ لی۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں، مجھے ہمیشہ اس گھر میں نہیں رہنا جبکہ ڈیڈی کو اسی عورت کے ساتھ زندگی گزارنی تھی، بہر حال جب میں خاتون کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو ڈیڈی شرفو پر ناراض ہو رہے تھے کہ وہ میرا لکھوایا ہوا فون نمبر کہیں رکھ کے بھول گیا تھا۔

''اب بتاؤ، میں کہاں رابطہ کروں اپنی بیٹی سے؟''

''کہیں نہیں۔'' میں کہتے ہوئے بھاگ کر ڈیڈی سے لپٹ گئی۔

''کہاں تھیں بیٹا؟'' ڈیڈی نے مجھے اپنے سینے میں بھینچ کر پوچھا، تو میں نے کن اکھیوں سے آنٹی کو دیکھا۔ ان کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اور ان کی طرف سے دھیان ہٹا کر میں نے ڈیڈی سے پہلے خاتون کا تعارف کرایا پھر سنبھل کر بولی۔

''میں سدرہ کی طرف جا رہی تھی ڈیڈی، راستے میں میرا ان آنٹی کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوگیا تو یہ مجھے اپنے گھر لے گئیں۔ دو دن بعد مجھے ہوش آیا تو میں نے یہاں فون کروایا تھا لیکن شاید یہاں کا فون خراب تھا کیوں آنٹی؟''

''ہاں۔ وہ پچھلے دنوں فون میں کچھ گڑبڑ تھی۔'' میرے اچانک مخاطب کرنے پر آنٹی خود گڑبڑا گئی تھیں۔

ڈیڈی نے خاتون کا بہت شکریہ ادا کیا اور میں نے بہت اصرار سے انہیں کھانے تک روکے رکھا۔ یوں بھی میں ان کی ممنون تھی، بلکہ احسان مند جنہوں نے بیٹے کی مخالفت کے باوجود مجھے اپنے گھر میں پناہ دی۔

پھر کھانے کے بعد میں ڈیڈی سے گاڑی لے کر خود انہیں ان کے گھر چھوڑنے آئی۔ تو وہ بار بار مجھے اپنے گھر آتے جاتے رہنے کی تاکید کرتی رہی تھیں۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے میں نے ڈیڈی کو تو واقعی کچھ نہیں بتایا تھا البتہ آنٹی کو خبردار کر دیا تھا کہ ان کی سازش سے آگاہ ہو کر گھر سے گئی تھی اور اگر آئندہ انہوں نے میرے لیے ایسا کچھ سوچا تو میں ڈیڈی کو بتا دوں گی، یہ بہت ضروری تھا ورنہ وہ میرے ساتھ اس سے بھی بھیانک کھیل کھیل سکتی تھیں۔

بہر حال اب میں اطمینان سے تھی تو کسی کسی وقت اس نیک دل خاتون کے گھر میں قیام کے چند دنوں کو سوچ کر جہاں محظوظ ہوتی وہاں ان کے بیٹے شہروز احمد کی حد درجہ بدگمانی پر میں ابھی بھی سلگ جاتی تھی۔ کتنا یقین تھا اسے کہ میں کسی گروہ سے تعلق رکھتی ہوں۔ اس وقت اس کی ہی باتیں سوچتے ہوئے میں نے اسے فون کر ڈالا۔ میرا مقصد اسے ہرٹ کرنا تھا۔

''کون؟'' میری آواز سن کر اس نے پوچھا تو میں جتا کر بولی۔

''راہ چلتی وہ لڑکی جسے آپ کی ماما گھر لے گئی تھیں۔''

''جی فرمایئے!''

''اوہو، اب فرمایئے ہوگئی۔'' میں مذاق اُڑا کر بولی۔ ''خیر فرمانا نہیں پوچھنا یہ ہے کہ آپ کی انکوائری کہاں تک پہنچی؟''

''کیسی انکوائری؟'' وہ یقیناً انجان بن رہا تھا۔

''وہ جو آپ میرے بارے میں کرنے والے تھے۔ کچھ پتا چلا میں کس گروہ سے تعلق رکھتی ہوں؟''

''جی ہاں، کچھ پتا چلا تو ہے۔''

''اچھا!'' میں زور سے ہنسی۔ ''ذرا میں بھی تو سنوں؟''

''مجھے بتانے میں کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ تم جھٹلانے کی کوشش نہ کرو تو۔'' اس نے کہا تو میں فوراً بولی۔

''نہیں کروں گی۔''

“وعدہ۔”

“ہوں۔” میں نے بہت محظوظ ہو کر ہوں کی آواز نکالی تو وہ قدرے رُک کر بولا۔

“تمہارا تعلق اس گروہ سے ہے جو سیدھا دل پر وار کرتے ہیں۔”

“کیا؟”

“ہاں اور اپنے دل کو بچانے کی سعی میں، میں تمہاری ہر بات جھٹلاتا رہا۔ شاید میں ہارنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے تمہارے ساتھ غلط باتیں منسوب کر کے ایک طرح سے میں خود کو فریب دیتا رہا۔”

وہ دھیرے دھیرے بولتا ہوا پتا نہیں کیسا لگ رہا تھا۔ میں نے ریسیور میں اسے دیکھنے کی کوشش کی پھر کان سے لگا لیا۔

“پھر بھی میں ہار گیا۔ کیا تم اعتراف کرو گی کہ تم اسی گروہ سے تعلق رکھتی ہو؟”

اُف میں جو اسے ہرٹ کرنا چاہ رہی تھی بری طرح نروس ہوگئی۔

“تمہاری خاموشی کو میں کیا سمجھوں؟”

“وہ ماما کیسی ہیں؟” میں نے اپنے تئیں بات بدلی۔

“ماما آنا چاہتی ہیں تمہارے گھر، بتاؤ کب لاؤں؟”

“جب، جب آپ کا دل چاہے۔”

“اچھی بات ہے جب میری انکوائری مکمل ہو جائے گی، تب لے آؤں گا۔”

اس نے کہا تو میں بے اختیار بولی تھی۔

“اب اور کیا انکوائری کرنی ہے؟”

......۞......

موجِ صبا کی دستک

اپنی پیشانی پر بے نام سی تپش محسوس کر کے میں نے بے اختیار سر اونچا کیا سامنے پتا نہیں کون تھا؟ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی تھیں اور میرے دیکھنے پر وہ ٹپٹایا، نہ خجل ہوا۔ اور نہ ہی کوئی بے اختیار حرکت اس سے سرزد ہوئی اس کے برعکس جیسے اسے اپنے روم روم پر اختیار حاصل تھا کہ جیسے پلکیں بھی اس کی مرضی کے بغیر حرکت نہیں کریں گی۔ جبھی بڑے اعتماد سے پہلے اس نے نظروں کا زاویہ بدلا۔ پھر رُخ موڑا اور پھر مضبوط قدموں سے لائبریری سے نکلتا چلا گیا۔

“پتا نہیں کون ہے؟” میں اس کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی اور سوچنے سے باز بھی نہیں رہ سکی۔ کوشش کے باوجود دوبارہ سامنے کھلی کتاب کی طرف متوجہ نہیں ہو سکی بلکہ اس کا تعاقب کرتی ہوئی میری نظریں دروازے ہی میں اٹک گئی تھیں جہاں سے ابھی ابھی وہ گیا تھا۔

“کہاں ہو؟” فرح نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو میں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی لیکن میرا ذہن اب بھی حاضر نہیں تھا۔

“کیا ہوا ہے تمہیں، اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟” وہ تشویش سے پوچھنے لگی۔

“ہاں۔” میں نے پلکیں جھپکیں تو لگا جیسے ابھی ابھی منظر بدلا ہو۔ “تم کب آئیں؟”

“ہائیں۔ تمہارے سامنے ہی تو دروازے سے داخل ہوئی ہوں اور تم مجھے دیکھ

بھی رہی تھیں۔"

"اچھا۔ ہاں" میں خجالت مٹانے کو ہنسی۔

"بات کیا ہے؟" وہ بیٹھی تو مشکوک نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"کون سی بات؟" میں نے الٹا اسی سے پوچھا۔

"نظریں کہاں، دل کہاں، ذہن کہاں۔" پھر گنگنائی۔ "تو پیا سے مل کر آئی ہے۔"

"کیا بکواس ہے؟" میں اب سنبھل چکی تھی۔

"تمہارے انداز تو یہی بتا رہے ہیں۔" وہ میرے خفگی سے گھورنے کی پرواہ نہ کرتی ہوئی اپنی کہے گئی۔ "لگتا ہے جیسے ابھی ابھی یہاں کوئی یونانی دیوتا اترا ہو، جسے دیکھ کر تم اطراف کا ہوش بھلا بیٹھیں۔"

"اور اب تم پر بھی مجھے اسی کا گمان ہو رہا ہے۔" میں نے کتاب اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری تو وہ ڈھٹائی سے ہنستی چلی گئی۔

"چلو اب پوائنٹ مس ہو گیا تو پرابلم ہو جائے گی۔" میں اس کا اٹھنے کا موڈ نہ دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

"رکو تو" وہ پتا نہیں کیا کہنا چاہتی تھی لیکن میں ان سنی کرتی ہوئی آگے چل پڑی مجبوراً اسے بھی میرے پیچھے بھاگنا پڑا تھا۔

پھر اگلے دن وہ مجھے کینٹین میں نظر آیا۔ اس سے اگلے دن لابی میں سامنا ہوا اور پھر اکثر کہیں نہ کہیں سامنا ہو جاتا کبھی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کبھی اترتے ہوئے کبھی میں وقت کی کمی کے سبب کلاس روم کی طرف بھاگ رہی ہوتی اور کبھی لائبریری میں سر جھکائے مصروف، بہر حال میں کہیں بھی ہوتی ہمیشہ اس کی نظروں کی تپش مجھے چونکا دیتی۔

شروع شروع میں تو میں بے اختیار سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی تھی لیکن اب میں نے کافی حد تک خود پر قابو پا لیا تھا کہ اس کی آس پاس موجودگی کا احساس ہوتے ہی سنبھل کر بیٹھ جاتی لیکن اس دوران میرے دل کی عجیب کیفیت ہوتی۔ کبھی بہت زور زور سے دھڑکنے لگتا اور کبھی ٹھہرتا ہوا محسوس ہوتا اور وہ بھی عجیب تھا۔ جب تک میں اسے دیکھ نہ لیتی۔ اپنی جگہ جم کر کھڑا رہتا تھا پتا نہیں کیا چاہتا تھا کہ میں جیسے ہی اسے دیکھتی وہ اول روز کی طرح پہلے

نظروں کا زاویہ بدلتا پھر مضبوط قدموں سے کسی اور طرف نکل جاتا۔ تین ماہ ہو گئے تھے اور اس تمام عرصے میں ایک بار بھی اس سے کوئی غیر ارادی حرکت سرزد نہیں ہوئی اور اب تو میں الجھنے لگی تھی۔ کبھی کبھی دل ہی دل میں اسے گالیاں بھی دینے لگتی کہ آخر وہ کیوں مجھے ڈسٹرب کرنے لگا ہے؟

کبھی کسی وقت سوچتی فرح سے کہوں اس سے جا کر پوچھے کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے لیکن پتا نہیں کیوں پھر میں فوراً ہی اپنی سوچ کی نفی کر جاتی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اُس کے بارے میں میرے احساسات کیا ہیں۔ شاید میں نے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی، لیکن اس روز مجھے اپنے آپ پر بے حد حیرت ہوئی جب گذشتہ کئی روز کی غیر حاضری کے بعد وہ اچانک مجھے نظر آیا تھا۔ پہلی سرسری نظر کے بعد میں نے دوبارہ چونک کر اسے دیکھا تھا یوں جیسے کوئی پیاری اور گمشدہ چیز اچانک سامنے آئی ہو اور میری اس بے قراری او ربے اختیاری پر پہلی بار اس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ نے جھلک دکھائی تھی ساتھ ہی آنکھیں بھی روشن ہوئیں۔ اور میرے بدن کا ہر مسام کھل گیا یوں کہ ننھی ننھی بوندیں میرے پورے وجود پر رینگنے لگی تھیں اور پہلی بار میرے دیکھنے پر اس نے اپنی نظروں کا زاویہ نہیں بدلا۔ اور نہ اس کے فوراً بعد کسی اور طرف چلا تھا۔ میری بے قراری پر وہ خاصا محظوظ نظر آ رہا تھا۔ اور میری یہ حالت تھی کہ اس کے سامنے ٹھہرنا بھی نہیں چاہتی تھی اور بھاگنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ اپنے آپ کو انتہائی بے بس محسوس کرتے ہوئے اور کچھ نہیں سوجھا تو بیگ کھول کر پین تلاش کرنے کے بہانے آدھے سے زیادہ بیگ کے اندر کر لیا۔ پھر اسی طرح بیگ پر جھکی ہوئی میں وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

اس روز تنہائی میں پہلی بار میں نے اسے بڑی سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا تھا اور آخر میں مجھے اپنے آپ سے اعتراف کرنا پڑا کہ وہ جو کوئی بھی ہے میں اس کی فسوں خیز شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو چکی ہوں اس کا سب سے الگ اور منفرد انداز، نظر انداز کر دینے والا ہرگز نہیں ہے اور میں اب تک پتا نہیں کیسے نظریں چراتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

دل نے دھڑک کر اس کی آمد کا پتا دیا تھا۔ اور پھر دھیرے دھیرے مجھے اپنا آپ پگھلتا ہوا محسوس ہونے لگا میں جان گئی وہ کہیں آس پاس موجود ہے اور میرے متوجہ ہونے کا منتظر بھی۔ لیکن مجھے پتا نہیں کیا خیال آیا کہ میں اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی کتنی دیر گزر گئی، میری گردن دکھنے لگی، پھر بھی میں نے سر نہیں اٹھایا۔ شاید میں یہ چاہ رہی تھی کہ وہ مجھے پکارے۔ آواز دے یا کسی بھی طرح سہی، مجھے خود متوجہ کرے۔ تب میں حیران ہو کر اسے دیکھوں اور اگلے دن شناسائی کے سارے مرحلے طے ہو جائیں۔ میں اسے جان لوں اور وہ مجھے اور پھر جس طرف بھی اٹھیں ہمارے قدم ساتھ ساتھ ہوں۔ لیکن میں منتظر ہی رہی اور اس کی طرف سے کوئی آواز نہ آئی۔

''کب تک؟'' میں نے سوچا۔ ''جب تک وہ پکارے گا نہیں، میں نہیں دیکھوں گی، خواہ برس بیتیں یا صدیاں۔''

''لگتا ہے تم نے ٹاپ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔'' فرح میرے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ مارتی ہوئی بولی۔ پھر کرسی گھسیٹ کر میرے برابر بیٹھی تو کہنے لگی۔

''میرا خیال ہے کوئی دلچسپ ناول ہاتھ لگ گیا ہے۔''

''جی نہیں۔'' میں کتاب بند کر کے اس کی طرف دیکھنے لگی تو وہ شرارت سے آنکھیں گھماتی ہوئی بولی۔

''کیا بات ہے آج کل بہت پڑھنے لگی ہو؟''

''ظاہر ہے، یہاں ہم پڑھنے کے لیے ہی آتے ہیں۔'' میں نے بے حد سنجیدہ ہو کر کہا۔

''ویسے تمہارا ارادہ کیا ہے میرا مطلب ہے ایم اے کے بعد کیا کرو گی؟'' وہ سنجیدگی سے پوچھنے لگی۔

''جاب کروں گی۔ دعا کرو کہیں اچھی جاب مل جائے۔'' میری نظروں میں گھر کا نقشہ گھوم گیا۔ ایک بیچارے ابا کمانے والے تھے گو کہ ہم گھر کے افراد زیادہ نہیں تھے۔ ابا کی آمدنی میں مزے سے گزارا ہو جاتا تھا لیکن گذشتہ برس جب دولہا بھائی کا انتقال ہوا تو

آپا اور ان کے تین عدد بچے ہمارے پاس آ گئے تھے۔ یوں ابا کی آمدنی بہت محدود لگنے لگی۔ آپا سے چھوٹے جواد بھائی تھے۔ جو گزشتہ سال تعلیم سے فارغ ہوئے تھے اور اب تک نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اس میں تھوڑا قصور جواد بھائی کا بھی تھا کیونکہ وہ ڈائریکٹ جی ایم کی کرسی پر بیٹھنا چاہتے تھے۔ اس سے کم تو وہ سوچتے ہی نہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے تعلیم اس لیے حاصل نہیں کی کہ کسی معمولی سے دفتر میں کلرکی کروں۔

ان کا کہنا بجا سہی پھر بھی میرا خیال ہے انہیں حالات کے پیش نظر اپنی سوچ میں تھوڑی سی لچک ضرور پیدا کر لینی چاہیے تھی اس طرح زیادہ نہ سہی کچھ نہ کچھ تو ابا کو سہارا مل جاتا۔ لیکن جواد بھائی کو شاید احساس ہی نہیں تھا اماں اگر احساس دلانے کی کوشش کرتیں تو وہ ہتھے سے ہی اکھڑ جاتے تھے یوں ایک طرح سے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ پھر میں ہوں۔ ایم اے جرنلزم کے آخری سال میں، میرا ارادہ گریجویشن کے بعد ہی جاب کرنے کا تھا لیکن ابا جانتے تھے کہ مجھے جرنلزم میں ایم اے کرنے کا کتنا شوق ہے۔ اسی لیے انہوں نے اس وقت مجھے جاب کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور آئندہ کے لیے بھی شرط یہ رکھی کہ پہلے میں ایم اے کر لوں۔ یوں میں نے یونیورسٹی جوائن کر لی۔ لیکن اپنے تعلیمی اخراجات کی خاطر میں ٹیوشن بھی کرتی ہوں۔

شام میں کچھ بچے میرے گھر پر پڑھنے آتے ہیں اور دو بچوں کو پڑھانے میں خود جاتی ہوں۔ اس طرح میں اپنا خرچ نکال کر باقی پیسے آپا کو دے دیتی ہوں بیچاری آپا! جنہوں نے ابھی انٹر ہی کیا تھا کہ ان کی شادی ہو گئی پھر یکے بعد دیگرے تین بچے ہوئے اور پانچویں سال دولہا بھائی کا پہلے ہی ہارٹ اٹیک میں انتقال ہو گیا گو کہ آپا کے سسرال والے اچھے خاصے خوشحال لوگ تھے۔ چاہتے تو آپا اور ان کے بچوں کو اپنے پاس رکھ سکتے تھے۔

مجھ سے چھوٹا فواد ہے جو ابھی انٹر میں پڑھ رہا ہے۔ اور غالباً جواد بھائی کی طرف سے مایوس ہو کر اماں ساری امیدیں اس سے وابستہ کیے ہوئی ہیں لیکن اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں ابھی بہت وقت درکار ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں ایم اے کرتے ہی جاب کر لوں تا کہ اچھے دنوں کے لیے اماں کو بہت زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔

"کہاں کھو گئیں؟" فرح نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو میں چونک گئی۔

"لگتا ہے تصور میں کوئی بہت اعلیٰ قسم کی جاب حاصل کر لی تھی۔" وہ ہنستی ہوئی بولی۔

"نہیں یار" میں افسردگی سے مسکرائی پھر گھڑی پر نظر پڑی تو فوراً کھڑی ہو گوی۔

"جلدی چلو پوائنٹ مِس ہو جائے گا۔"

"یا اللہ۔ یہ پوائنٹ نہ ہوا کوئی بہت اچھا رشتہ ہو گیا جو ہاتھ سے نکل گیا تو پھر ویسا نہیں ملے گا۔" میں اس کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑی اور یونہی ہنستے ہوئے سامنے نظر گئی تو دیکھا وہ جا رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کے قدموں میں مضبوطی نہیں تھی مجھے افسوس ہونے لگا دل چاہا بھاگتی ہوئی اس کے سامنے جا کھڑی ہوں اور کہوں۔

"میرے نہ دیکھنے سے تم اتنے مایوس ہو گئے ہو اور جب میں نظر نہیں آؤں گی تب کیا کرو گے؟"

"اب چلو ناں" فرح نے مجھے کہنی مارتے ہوئے کہا تو میں اس کے ساتھ چل پڑی۔

اس روز میرا کسی بات، کسی کام میں دل نہیں لگا یقیناً اس مانوس اجنبی کے شکستہ قدموں کی شکستگی میرے اندر اتر آئی تھی کہ سارا وقت نا معلوم سی اداسیاں میرے گرد گھیرا ڈالے رہیں بچے پڑھنے آئے میں نے غائب دماغی سے انہیں پڑھایا۔ اور جہاں پڑھانے جانا تھا وہاں سے چھٹی کر لی۔

رات میں آپا کے بچے حسب معمول کہانی سننے کے لیے میرے پاس آئے، تو میں نے انہیں بھی ڈانٹ کر بھگا دیا اور نیند کا بہانہ کر کے دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔ لیکن میں اچھی طرح جانتی تھی کہ مجھے نیند نہیں آئے گی اور ایسا ہی ہوا۔ میں جو سب سے پہلے سونے کے لیے لیٹی تھی۔ سب کے سونے کے بعد بھی جاگ رہی تھی آخر میں مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ جس کا میں نام تک نہیں جانتی اس کے بارے میں میں اس قدر کیوں سوچ رہی ہوں؟ میں نے اس کا خیال جھٹکنے کی کوشش کی تو وہ جیسے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی بے پناہ حسین آنکھوں میں شکوہ تھا اور میں پھر ہار گئی یہاں تک کہہ دیا۔

"تم دیکھنے کی بات کرتے ہو میں آنکھیں تمہارے راستوں میں رکھ چھوڑوں گی۔"

اور اگلے دن میں ویسی ہی انجان تھی رات کی ساری باتیں بھول گئی اور کل والی خواہش نے گرفت مضبوط کر لی۔ وہ پکارے۔ آواز دے تب سر اٹھاؤں گی۔ لیکن وہ بھی عجیب شخص تھا نظروں کی تپش سے پگھلاتا رہا۔ اور پھر مایوس ہو کر چلا گیا۔

"سنو! تم نے نوید احسن کو دیکھا ہے؟" فرح اشتیاق بھرے لہجے میں مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

"نہیں، کون ہے؟"

"وہ اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ ایمان سے کیا غضب کی پرسنالٹی ہے اس کی، اپنے شعبے میں بے حد مقبول ہے خاص کر لڑکیوں میں۔"

"تم اسے کیسے جانتی ہو؟" میں نے اس کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے یونہی پوچھ لیا۔

"میری کزن اس کی کلاس فیلو ہے اور اس کی زبانی اس کی اتنی تعریفیں سن کر آج میں اسے دیکھنے چلی گئی۔"

"کیا" میرے منہ سے چیخ نما آواز نکلی۔ "تم خاص طور سے اس بندے، میرا مطلب ہے نوید احسن کو دیکھنے گئی تھی۔"

"ہاں۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "اور اب مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ یہ کام میں نے بہت پہلے کیوں نہ کیا؟"

"چہ چہ۔" میں نے تاسف کا اظہار کیا۔

"تم بھی اگر دیکھ لو تو تمہیں بھی ساری زندگی ملال رہے گا کہ بہت پہلے کیوں نہ اسے دیکھا۔"

"اچھا" میں خوامخواہ ہنسی۔

"ابھی چلو۔"

"نا بابا، مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ بقیہ ساری زندگی ملال میں کاٹنے کا۔"

"تمہاری مرضی۔" اس نے کندھے اُچکائے اور بچا کھچا برگر منہ میں ڈال کر پھر پیپسی کے ذریعے حلق سے نیچے اتارنے لگی۔

''کلاس شروع ہونے والی ہے۔'' اسے اطمینان سے اطراف کا جائزہ لیتے دیکھ کر میں نے...... احساس دلایا تو وہ لاپروائی سے بولی۔

''میرا موڈ نہیں ہے کلاس اٹینڈ کرنے کا۔''

''موڈ کو چھوڑو، چلو اٹھو۔''

''ناں بھئی۔ نوید احسن کے بعد سرزبیر کو دیکھنا بہت مشکل کام ہے کم از کم کچھ وقت کے لیے تو اچھی شکل نظروں میں بسی رہنے دو۔''

''تمہارا اللہ حافظ ہے۔'' میں اسے وہیں چھوڑ کر کینٹین، سے نکل آئی۔ کلاس شروع ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ اس لیے میں دو دو سیڑھیاں پھلانگنے لگی اور آخری سیڑھی پر قدم رکھا، تو سامنے سے وہ آتا نظر آیا پتا نہیں کیوں میرے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور میں جو گزشتہ کئی روز سے اسے دیکھنے سے گریز کر رہی تھی اس وقت بے خیالی میں اسے دیکھے گئی یہاں تک کہ وہ قریب آ گیا مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا میں بے حد نروس ہو گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ درمیانی چند قدموں کا فاصلہ سمٹتا میں پلٹی تو چڑھی تھی اس سے زیادہ تیزی سے اترتی چلی گئی۔ آخری سیڑھی پر رُک کر میں نے یونہی پلٹ کر دیکھا وہ میرے پیچھے نہیں تھا۔ میں نے حیرت میں گھر کر سر اونچا کیا تو وہ ریلنگ پر جھکا نظر آیا میں فوراً وہاں سے ہٹ گئی البتہ بعد میں، بلکہ اگلے کئی دن تک مجھے اپنی اس حرکت پر افسوس ہوتا رہا تھا۔

''کاش میں اس روز وہیں کھڑی رہتی۔'' میں اکثر سوچتی۔ ''ہو سکتا ہے وہ اپنی خاموشی توڑ دیتا۔ لمحہ بھر میرے پاس رُک کر وہ ساری باتیں جو اس کی آنکھیں کہتی ہیں فقط ایک لفظ میں اپنی زبان پر لے آتا۔''

☆......☆......☆

ان دنوں فرح اکثر کلاسز مِس کرنے لگی تھی۔ پوچھنے پر صاف گوئی سے بتاتی کہ وہ اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں چلی گئی تھی۔

''نوید احسن کو دیکھنے۔'' ایک دن میں نے پوچھ لیا اور یہاں وہ جھوٹ بول گئی۔

''نہیں۔ خاص طور سے اسے دیکھنے میں اپنی کزن کے پاس گئی تھی۔''

''کوئی کام تھا؟''

''ہاں۔'' یونہی باتیں کرتے ہوئے ہم دونوں لائبریری میں آئے اور اپنے مخصوص گوشے میں بیٹھے ہی تھے کہ وہ میرا ہاتھ دبا کر سرگوشی میں بولی۔

''سنو، وہ سامنے دیکھو، نوید احسن۔'' میں نے فوراً دیکھا جسے وہ نوید احسن کہہ رہی تھی وہ وہی تھا جس کی نظروں کی تپش اب تنہائیوں میں بھی مجھے اپنے چہرے، اپنی پیشانی اور اپنے ہاتھوں پر محسوس ہوتی تھی۔ اس پر سے نظریں ہٹا کر میں نے غیر یقینی سے فرح کی طرف دیکھا تو وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

''کیسا ہے؟'' میں خاموش رہی اور وہ پتا نہیں کیا سمجھی کہنے لگی۔

''میں نے بھی جب پہلی بار اسے دیکھا تھا تو اسی طرح گم صم ہو گئی تھی۔''

''لیکن میں گم صم نہیں ہوئی'' میں ناگواری سے بولی۔

''پھر؟''

''پھر یہ کہ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اسے میں متعدد بار دیکھ چکی ہوں البتہ نام ابھی معلوم ہوا ہے۔''

''اچھا'' وہ حیران ہوئی، کہاں دیکھا ہے۔''

''یہیں اسی جگہ، جہاں وہ اب کھڑا ہے''

''لیکن میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔''

''تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟''

''افوہ، خفا کیوں ہوتی ہو میں کب کہہ رہی ہوں تمارا قصور ہے؟'' وہ میرے اچانک بدلتے لہجے سے جھنجھلا کر بولی۔

''میں خفا نہیں ہو رہی۔'' مجھے فوراً اپنے لہجے کی تلخی کا احساس ہو گیا۔

''ٹھہرو میں اسے یہیں بلالاتی ہوں۔ تمہارا تعارف بھی کروا دوں گی۔'' میں اسے روکنا چاہتی تھی لیکن وہ میری بات سنے بغیر چلی گئی پھر میں نے دیکھا وہ اس کے

مقابل کھڑی بڑے آرام سے اس سے باتیں کر رہی تھی کسی وقت نوید احسن مجھ پر ایک نظر ڈال لیتا پھر اس سے بات کرنے لگتا۔ میں اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کرنے لگی۔ تو بہت خاموشی سے وہاں سے اُٹھ آئی پھر میں کہیں نہیں رکی، سیدھی گھر آ گئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگلے روز فرح مجھے دیکھتے ہی مجھ پر چڑھ دوڑی۔

''کس قدر بدتمیز ہو تم۔ کل مجھے چھوڑ کر چلی گئیں کم از کم بتا تو دیتیں میں ساری یونیورسٹی میں تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔''

''تم بھی تو مجھے اکیلا چھوڑ کر اطمینان سے اس کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئیں یہ بھی خیال نہیں کیا کہ میں اکیلی بیٹھی ہوں۔'' جواب میں میں نے بھی شکوہ کیا تو وہ نرم پڑ گئی۔

''کیا کروں، میں تو اس سے کہہ رہی تھی کہ تمہارے پاس چل کر بیٹھتے ہیں لیکن وہ مانا ہی نہیں۔''

''کیوں میں اسے کھا جاتی کیا؟'' میں بلا ارادہ کہہ گئی۔

''اسے یہی خدشہ تھا۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''کیا؟'' میں چیخی۔

''مجھ پر کیوں چلاتی ہو، اسی سے جا کر پوچھو۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے کسی سے کچھ پوچھنے کی؟'' میں نے جل کر کہا اور جیسے ہی پلٹی کچھ فاصلے پر وہ نظر آیا اس کا ایک بڑھا ہوا قدم بتا رہا تھا کہ وہ ابھی ابھی آیا ہے اور ٹھٹھک کر رکا ہے نجانے کیوں میری پیشانی شکن آلود ہو گئی اور میں فرح کو وہیں چھوڑ سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گذر گئے۔ اس دن کے بعد سے وہ پھر میرے راستے میں نہیں آیا کبھی اچانک سامنا ہوا بھی تو مجھ سے پہلے راستہ بدل گیا میں حیران تھی کہ وہ ایسا کیوں کرنے لگا ہے۔ اور ابھی میں اس کے بدلتے رویے پر غور کرنے میں لگی ہوئی تھی کہ امتحان شروع ہو گئے اور میں سب کچھ بھول کر امتحانوں میں مصروف ہو گئی پھر امتحان بھی ختم ہو گئے اور اس روز ہم ایک دوسرے الوداعی ملاقات کر رہے تھے میری کلاس کی

اکثر لڑکیوں سے ہیلو ہائے تو تھی لیکن دوستی صرف فرح سے تھی اس لیے میں نے صرف اسی کے ساتھ ایڈریس کا تبادلہ کیا اور جب وہ خاص طور سے مجھ سے کہہ کر اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کی طرف گئی تو میں اس کی واپسی کے انتظار میں لائبریری کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔

مجھے یونیورسٹی چھوڑنے کا افسوس تھا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ وہ بے پناہ وجیہہ شخص نوید احسن بہت خاموشی سے مجھے دور سے آشنائی بخش گیا تھا میرا دل چاہا کہیں سے وہ سامنے آ جائے، اور میں جاتے جاتے اس سے پوچھوں۔

''تم نے مجھے اپنے سحر میں گرفتار کیوں کیا، اپنی نظروں کی وارفتگی سے میرے اندر ہلچل کیوں مچائی؟ اپنی خاموش آنکھوں سے میرے اندر ایسی چنگاری کیوں پھینک دی جو بقیہ تمام عمر مجھے سلگاتی رہے گی، میرے اندر اداسیاں بڑھنے لگیں۔ آنکھوں میں اچانک ڈھیر سارا پانی اتر آیا اور چھلکنے کو تھا کہ میں نے پیشانی گھٹنوں پر رکھ لی۔ ٹپ، ٹپ۔ کتنے موتی خود میری جھولی میں آن گرے اور ابھی میں اپنے آپ کو سرزنش کر ہی رہی تھی کہ پتا نہیں کس نے میرا نام لے کر پکارا میں نے جلدی سے گھٹنوں سے ہی آنکھیں رگڑیں اور سر اونچا کیا تو جہاں میں بیٹھی اس سے چار سیڑھیاں نیچے وہ کھڑا تھا تشویش سے پوچھنے لگا۔

''آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟'' پہلی بار براہِ راست مجھ سے بات کر رہا تھا میں کوئی جواب نہ دے سکی۔

''آپ کی دوست کہاں ہے؟'' میرے خاموش رہنے پر پوچھنے لگا۔

''وہ آپ کے ڈیپارٹمنٹ کی طرف گئی ہے غالباً آپ کی تلاش میں۔'' آخر میں جانے کیسے میرے لہجے میں طنز سمٹ آیا۔

''میری تلاش میں؟'' وہ ہنسا۔ ''میں خود انہیں تلاش کر رہا ہوں۔''

''تو پھر رُک جائیں وہ یہیں آئے گی۔''

''وہ پتا نہیں کب آئیں جبکہ میرے پاس وقت کم ہے۔'' وہ ایک نظر گھڑی پر ڈال کر کہنے لگا۔ ''آپ میرے ساتھ آئیں۔''

''کیا؟'' میں چونکی۔

''میرے ساتھ آئیں۔'' اس نے دہرایا۔

"کہاں؟"

"اگر میں کہوں، جہاں بھی میں لے چلوں تب آپ"

"معاف کیجیے گا نوید صاحب۔" میں اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "میں ہر ایرے غیرے کے ساتھ یونہی نہیں چل سکتی۔"

پتا نہیں ہونٹ بھینچنے کی اس کی کوشش ارادی تھی یا غیر ارادی، اسی طرح پیشانی کی شکنوں کے بارے میں بھی مجھے اندازہ نہیں ہوا۔ بہر حال میں اس کا خشونت بھرا انداز نظر انداز کرتی ہوئی کھڑی ہوگئی اور رجانے کو تھی کہ اس نے میری کلائی تھام لی۔ اس جسارت پر میں حیران ہوئی اور جھٹکے سے کلائی چھڑانے کی کوشش کی، لیکن اس کی گرفت مضبوط تھی۔

"چھوڑیں میرا ہاتھ۔" میں دبے دبے لہجے میں چیخی، اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگی کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا اور اسے جیسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ مجھے تقریباً کھینچتا ہوا پارکنگ میں لے آیا۔ پھر اپنی گاڑی کا دروازہ کھول کر پہلے مجھے دھکیلا۔ پھر خود بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

'میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی، روکیں گاڑی مجھے اترنے دیں۔" میں اس کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کرتی ہوئی تقریباً چیخی اور وہ اطمینان سے بولا۔

"پہلے مجھے میری بات کا جواب چاہیے۔"

"کون سی بات؟" میں اپنی کوشش میں مصروف رہی۔

"وہی جو میں نے فرح کے ذریعے آپ کو کہلوائی تھی۔"

"فرح کے ذریعے۔ مجھے؟" میں حیران ہووی تو وہ گاڑی روک کر مجھ پر نظریں جماتا ہوا بولا۔

"آپ عادت کے مطابق انجان بن رہی ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"اب کہہ دیجیے کہ فرح نے میرا کوئی میسج آپ تک نہیں پہنچایا۔"

"نہیں۔"

"کیا نہیں؟"

"اول تو آپ کو فرح کے ذریعے مجھے کوئی میسج بھجوانا ہی نہیں چاہیے تھا اور اگر ایسا کر چکے ہیں تو مجھے کوئی میسج نہیں ملا۔" میں خفگی سے بولی تو وہ کچھ دیر تک میری طرف دیکھتا رہا پھر سیدھا بیٹھتا ہوا بولا۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے واقعی کسی تیسرے فرد کا سہارا نہیں لینا چاہیے تھا۔ بہر حال" وہ خاموش ہوگیا۔ اور پھر کچھ دیر بعد بولا۔

"یونیورسٹی سے تو آج آپ فارغ ہوگئی ہیں یہ بتایئے آگے کیا ارادہ ہے؟"

"پتا نہیں۔" میں نے قصداً اپنے بارے میں نہیں بتایا۔

"مجھ سے شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اتنی آسانی سے وہ یہ بات کہہ گیا کہ میں اپنی جگہ ساکت ہوگئی، یہاں تک کہ جو نظریں اس پر ٹھہری تھیں وہ بھی جمی رہ گئیں۔

"آپ کی اس کیفیت کو کیا نام دوں شاک یا شادیٔ مرگ؟" آخری لفظ پر وہ کھل کر مسکرایا تو میں ایک دم ہوش میں آگئی۔

"دیکھنے میں تو آپ اچھے بھلے لگتے ہیں، مجھے نہیں معلوم تھا کہ"

"کہ؟" میرے خاموش ہو جانے پر فوراً پوچھنے لگا۔

"کہ آپ تھوڑے سے پاگل بھی ہیں۔"

"تھوڑے سے نہیں۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "پورا پاگل کہو، اور یہ بھی سن لو کہ تمہیں دیکھ کر دیوانہ ہوا۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ آپ کیسے دیوانے ہوئے؟ بس آپ پلیز مجھے یہیں اتار دیں۔" میں روٹھے لہجے میں کہہ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

"سنو۔" وہ پھر سنجیدہ ہوا۔ "تم میرے جذبوں سے، آگاہ ہو، میں گذشتہ ایک سال سے تمہیں دیکھ رہا ہوں اور اس عرصے میں اتنا تو جان ہی گیا ہوں کہ تم مجھے ناپسند نہیں کرتیں۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"تم شاید اس بات پر خفا ہو کہ میں نے بہت پہلے تم سے بات کیوں نہیں کی

میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں جس سے بات کرتا اس کے ساتھ میرا اسکینڈل بن جاتا تم میری بات سمجھ رہی ہو ناں۔'' میں کچھ نہیں بولی تو کہنے لگا۔

''میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر لوگ فسانے بنائیں۔ میں تمہاری پوزیشن خراب نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے کبھی تمہارے قریب نہیں آیا اور آج جب ہم اس یونیورسٹی کو الوداع کہہ کر جا رہے ہیں تو، یہاں کے اور بہت سے دوستوں کی طرح میں تمہیں صرف ''یاد'' نہیں بنا سکتا۔ بلکہ میں چاہتا ہوں، تم اپنے وجود کی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ میرے ساتھ ساتھ رہو، میرے دل کے قریب میری آنکھوں کے سامنے۔'' میں یونہی سر جھکائے اپنے ناخنوں سے کھیلتی رہی۔

''کیا اب بھی خفا ہو؟'' میں ہنوز خاموش۔

''چلو کچھ نہ کہو۔ بس ایک ذرا سی مسکراہٹ سے یہ یقین بخش دو کہ تمہیں میرا ساتھ منظور ہے۔'' میں ہونٹوں کی سختی سے بھینچنا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیسے ہونٹ بھینچنے کی بجائے کُھل گئے۔ اور وہ جو بغور میری طرف دیکھ رہا تھا اطمینان بھرا طویل سانس لے کر بولا۔

''شکریہ!''